ریسرچ پروجیکٹ

برائے قومی کونسل فروغ زبان اردو، نئی دہلی

عنوان

زبان زد اشعار

کے

سماجی سروکار، سرقہ، توارد اور استفادہ

//////////////////////////////

از

خلیق الزماں نصرت

پتہ :۔ 861، 203/ روبرو عنایت بلڈنگ،

صلاح الدین ایوبی اسکول، شانتی نگر روڈ بھیونڈی

(مہاراشٹر پن کوڈ-421302) موبائل نمبر:۔ 9923257606

فہرست

نمبر شمار		ابواب	صفحہ نمبر
۱)	باب۔۱	زبان زد اشعار کا تعارف	(۴)
۲)	باب۔۲	اہم اشعار کا انتخاب اور ان کے شعراء کے نام اور حالات	(۱۴)
۳)	باب۔۳	عام زندگی میں استعمال ہونے والے اشعار جائزے کے ساتھ (سماجی سروکار)	(۱۲۷)
۴)	باب۔۴	تحریر و اور فلموں میں استعمال ہونے والے اشعار	(۱۵۷)
۵)	باب۔۵	وہ اشعار جن کا ایک ہی مصرع مشہور ہے	(۱۸۳)
۶)	باب۔۶	ایسے اشعار میں قرآنی تلمیحات	(۱۹۰)
۷)	باب۔۷	زبان زد شعارا میں استفادہ سرقہ اور توارد	(۲۰۰)
۸)	باب۔۸	روزمرہ کے محاوروں، ضرب المثل اور کہاوتوں کا استعمال	(۲۶۰)
۹)		ماحصل	(۲۶۷)
۱۰)		کتابیات (مآخذ) (BiBiloghraphy)	(۲۶۹)

❁❁❁

باب ۔ا

زبان زد اشعار کا تعارف

باب۔ا زبان زد اشعار کا تعارف

زبان زد اشعار اردو غزل کے وہ بہترین اشعار ہیں جنہیں عام بول چال، تحریر و تقریر میں استعمال کئے جاتے ہیں۔اس کے استعمال سے تحریر و تقریر کا حسن نکھر جاتا ہے۔کسی موضوع پر کئی صفحات لکھنے کے بعد بھی جو خوبی پیدا نہیں ہوتی ہے، اس کے ایک شعر سے یہ کام لیا جا سکتا ہے۔ بڑے سے بڑے مجمع کا رخ صرف ایک شعر سے بدلا جا سکتا ہے۔ یہ اشعار بالکل سادہ، مگر بڑے پر اثر ہوتے ہیں۔ادھر شعر پڑھا ، اُدھر قارئین اور سامعین کے دماغ تک بغیر کسی ذہنی جمناسٹک کے پہونچ جاتا ہے۔اشارے اشارے میں بڑی سے بڑی بات کی جاتی ہے۔ایسے اشعار کا نعم البدل نہیں ہوتا، یہ وہ اشعار ہیں جو اپنی سادگی و پرکاری میں اپنی مثال آپ ہوتے ہیں، اختصار، اختصاص اور معجز بیانی کے شاہکار ہوتے ہیں۔ایسے اشعار کے استعمال سے سامعین اور قارئین سے خوب داد ملتی ہے۔

اردو کے زبان زد اشعار کو جاننے کے لئے ہمیں سب سے پہلے اس زبان کے تعلق کو جاننا ضروری ہے جس کے یہ زبان زد اشعار ہیں۔ وہ کون سی زبان ہے جو عام لوگوں کے سر چڑھ کر بول رہی ہے یہ ہے اردو جو ہندستان کے لوگوں کی زبان ہے۔تاریخ پر غور کریں تو یہ حقیقت برہنہ ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ مسلمانوں کے دورِ عروج میں جب اِن کی سلطنت پورے ہندوستان پر پھیلی ہوئی تھی بالعموم فارسی زبان رائج تھی ، اردو زبان کو جنم دینے والے دراصل اس ملک کے ہندو تھے۔اردو اس وقت ایک رابطے کی زبان کی حیثیت سے منطقی طور پر عوامی تال میل سے پیدا ہوئی۔انگریزوں کے دورِ حکومت میں انگریزی کا دور دورہ تھا۔ ہندوؤں نے درباروں میں رسوخ حاصل کرنے کے لئے فارسی زبان سیکھی اور مسلمانوں کو اپنی زبان سکھائی۔انگریزوں کے دور میں اردو زبان بے شک موجود تھی لیکن فارسی زبان کے سامنے اسکو کوئی مقام و مرتبہ حاصل نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی کے دور میں اردو کا چراغ جل نہ سکا۔اردو میں شعر کہے جاتے تھے، جسے اس وقت ریختہ گوئی کہا جاتا تھا۔کتابیں بھی لکھی جارہی تھیں۔تراجم کا بھی سلسلہ جاری تھا۔اردو کی ترقی اور عروج اس وقت ہوئی جب ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کو زوال آیا اور ایک ایک کر کے ان کی ساری چھوٹی بڑی سلطنتیں انگریزوں کے قبضہ و اختیار میں چلی گئیں۔انگریزوں کے تسلط اور انگریزی زبان کے ہمہ گیر اثرات کے زمانے میں اور فارسی زباں کے پس منظر میں چلے جانے کے بعد ہندو مسلمانوں میں زبان اور رابطے کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا، اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں نے مل کر اُردو زبان کو منتخب کیا۔اس کا سبب ہی تھا کہ اس وقت تک اردو کے علاوہ کسی اور زبان میں اتنی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ ملک کی مشترکہ زبان بن سکتی۔اس وقت بھی حکومت کی پشت پناہی اُردو کو حاصل نہ تھی۔اس لئے جو کچھ ہوا وہ منطقی اور فطری، تمدّنی اور ثقافتی و معاشرتی احتیاجات کے تحت ہوا۔

جناب بشیشور پرشاد صاحب منوّر لکھنوی لکھتے ہیں:

''اُردو زبان کو جنم دینے، پالنے پوسنے اور پروان چڑھانے میں ہندوستان میں بسنے والی جن جماعتوں نے حصّہ لیا ہے ان میں مسلمان کائستھ اور کشمیری پنڈت خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔کائستھوں کا اس انتظامی مشینری میں اتنا دخل تھا کہ پٹواری کے ادنیٰ ترین عہدے سے لے کر دیوان میں بھی بلکہ بعض حالتوں میں وزیراعظم کے اعلیٰ ترین عہدوں کے فرائض انہوں نے انجام دیئے۔''

''انتظامی حکومت کے سلسلے میں مسلمان حکمرانوں اوران کے نائبان سلطنت کے ساتھ مسلسل ربط وضبط کا ایک خوش گوار نتیجہ ہی نکلا کہ ایک طرف عربی فارسی اور ترکی، اور دوسری طرف سنسکرت، برج بھاشا نیز دوسری دیسی زبانوں کے اختلاط سے اُردو زبان پیدا ہوئی۔ یہ وہ زبان تھی جو شاہی محلّات میں پلی اور ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس کو یکساں طور پر اپنا نورِ دید سمجھ کر حتیٰ کے کشمیری پنڈتوں اور کائستھوں نے اس کو مسلمانوں کی طرح اپنی مادری زبان قرار دیا۔'' (اُردو زبان اور کائستھ ۶۵)۔

معلوم یہ ہوا کہ اُردو زبان سنسکرت، عربی، انگریزی، فارسی، عبرانی، زبانوں کی طرح ایک ایسی مافوق الوراء زباں نہیں ہے جس کے تقدس نے ان کو اب تک زندہ رکھا ہے۔ بلکہ اُردو قوموں کی تمدّنی مسائل معاشرتی ضرورتوں کی دین ہے۔ اس کا تاسیسی دور فطری ہے۔ جب متعدد مذہبی اکائیوں اور ان اکائیوں کے اندر بھی متعدد اکائیوں کے مابین خیالات اور ضروریات کے تبادلے کا مسئلہ پیدا ہوا تو اُردو زبان کی تشکیل کی گئی۔ اس سے یہ بات کُھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اردو کو مسلمانوں کی زبان نہیں کہا جا سکتا، جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ بھاری بُھول کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی اگر کوئی زبان ہوسکتی ہے تو وہ ان کے اپنے ایمان کے تقاضوں کے مطابق عربی ہی ہوسکتی ہے جو مقدس آسمانی کتاب قرآن کی زبان ہے۔ اُردو خالص ہندوستانی زبان ہے۔ وہ اسی آب وہوا میں پیدا ہوئی ہے اور پروان چڑھی ہے۔ اس کے الفاظ ومحاورات سیدھے سادے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ عوام کے اپنے جانے پہچانے بھی ہیں۔ مثلوں، مقولوں، اور کہاوتوں کا جو سرمایہ اردو زبان میں محفوظ کیا گیا ہے وہ ہماری دیہی عوامی زندگی سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ دیہی زندگی میں خواندگی کا معیار صفر ہوتا ہے۔ لیکن تجربے کی آنچ ان کو اور بھی کٹھالی میں تپا پگھلا کر کُندن بناتی رہتی ہے۔ اس لئے ان کی سادہ، عام فہم زبان نے اردو زبان کو ایک ایسی سادہ و پرکار عروس بنا دیا ہے کہ ہر کوئی اس پر مرمٹتا ہے۔

اُردو کے متعلق مشہور محقق ڈاکٹر تاراچند فرماتے ہیں:

''لوگ اردو کے متعلق کچھ کہتے ہوئے بھول جاتے ہیں کہ ہندی زبان کا کوئی رُخ اور کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جسے اُردو ادب میں پیش نہ کیا گیا ہو۔ اُردو میں اپنشیدوں کے ترجمے موجود ہیں۔ سمرتیوں، مہابھارت اور بہت سے پرانوں کے ترجمے اُردو میں مل سکتے ہیں۔ ہندو مذہبیات اور فلسفہ مذہب پر اُردو میں بڑی بڑی تصانیف ہیں جن میں دیومالا ہندوؤں کی عبادتوں اور جاتراؤں پر عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ ہندو آرٹ خصوصاً موسیقی پر کثرت سے اُردو کتابیں موجود ہیں۔ سنسکرت کی بہت سی کہانیوں اور ڈراموں کے اُردو ترجمے کیے گئے ہیں۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ انیسویں صدی کے آخر تک بہت سے ہندو اُردو کو اپنی زبان سمجھتے تھے۔ ہندو شعراء اور نثر نگار بکثرت تھے۔ شمالی ہند کے پڑھے لکھے ہندو نہ صرف معلومات کے لئے بلکہ ذوقِ سلیم کے تقاضے کے لئے اُردو کتابیں پڑھتے تھے، اس زمانے میں ہندو محض بے جا تعصب کی بناء پر اردو کو بھولتے جا رہے ہیں۔ حالانکہ اُردو نے ہندوؤں کی بڑی خدمت کی ہے۔ اور ان کی ضروریات کو پورا کیا۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کے اس مُلک میں آنے کے بعد اُردو زبان نے جنم لیا ہے۔ اس لئے اس پر اسلامی روایات کا اثر سہواً ہوگیا ہے۔ لیکن اس کے بانی ہندو اور مسلمان دونوں ہی تھے۔ اس لئے اس جس طرح مُسلمان اردو پر فخر کرتے ہیں اسی طرح ہندوؤں کو بھی اس پر فخر کرنے کا حق حاصل ہے۔ کیونکہ اُردو کو بنانے اور سنوارنے میں ہم سب برابر کے حصّہ دار ہیں۔ بے شمار ہندو اہل قلم شاہجہاں کے زمانے سے اب تک اپنے جذبات، خیالات کے اظہار کا ذریعہ اُردو کو بناتے رہے ہیں۔''

اُردو زبان کی تشکیل اور تاسیس اور اس میں ہندوؤں مسلمانوں کے مشترکہ حصّے کے بارے میں ڈاکٹر تاراچند نے اوپر جو کچھ کہا ہے

اس کی مزید گواہی اردو کے ایک اور محقق اور اسکالر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی درج ذیل سطور سے ملتی ہے۔

''اُردو زبان ایرانی اور ہندوستانی تہذیبوں کے سنگم کا وہ نقطہ ہے جہاں سے ایک دونوں کے دھارے ایک ہو کر بہنے لگ جاتے ہیں۔اردو کے چمن زار میں جہاں لالہ و یاسمن کی جلوہ طرازی ہے۔وہاں ٹیسو اور سرس کے پھول بھی نظر آتے ہیں ان کی آبیاری کسی ایک قوم کی رہین منّت نہیں بلکہ ہندو مسلمان دونوں نے مل کر اسے اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے۔اُردو میں رواداری، محبت اور اخوت کا جذبہ اتنا ہی قدیم ہے، جتنا کہ خود ہندوؤں اور عجمیوں کا سابقہ اردو میں اتحاد و یگانگت کی روایت کسی خلاء کی پیداوار نہیں ہے۔اس کی پشت پر ہزار سال کے ارتقاء کی تاریخ ہے۔اردو ادب نے باہمی علاحدگی اور نفرت کی خلیج کو پُر کرنے کی ہمیشہ سعی کی ہے اور یہ وہ رشتہ ہے جو کعبے کو شوالے سے اور ہندو کو مسلمان سے جوڑ رہا ہے۔اور جوڑے ہوئے ہے۔اردو کی ہی سوچ اور اس کی وسعت سے عبارت ہے۔ہندوستانی تہذیب سے جس کے ہاتھوں اُردو کا خمیر اُٹھا ہے''۔''مُسلماں گو فاتح تھے لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد وہ یہیں کے ہو گئے اور ان کے بے تکلف میل جول اور معاشرت، ادب اور حکومت کی باہمی شرکت کی وجہ سے اُردو زبان پیدا ہوئی جو اِن قوموں کے اتحاد و تہذیب کی بے نظیر یادگار ہے۔''(اُردو کی تہذیبی قدر و قیمت)۔

اُردو زبان کی تخلیق، تشکیل اور تاسیس کے تعلق سے یہ ان فاضل ہندو و اہلِ قلم اور محققین کی شہادتیں ہیں جنہیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا اس لئے یہ بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ اُردو کوئی غیر مُلکی زبان نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ہند کی آریائی زبانوں سے ہے۔ہندوستان میں اُردو کو بہت بڑی اہمیت صدیوں کی اس لسانی اور تمدّنی تحریکات سے حاصل ہوئی ہے۔وسط ایشیاء سے آریاؤں کی آمد سے مُسلمانوں کی فتوحات تک شمالی ہندوستان میں جس بولی کا راج رہا وہ مدھیہ پردیش کی کسی نہ کسی بولی پر مبنی تھی۔مسلمانوں کی فتح دہلی کے وقت شورسینی، اب بھرنش کی ایک جدید شکل اختیار کر چکی تھی اور آہستہ آہستہ عوام کی ڈگر سے دُور ہٹ رہی تھی، عوام کی زبان کا دھارا برابر آگے بڑھ رہا تھا۔سندھ و پنجاب میں پشاپچی اور مدھیہ پردیش میں شورسینی پراکرتین نئی اپ بھرنشوں (بگڑی بولیوں) کے لئے راستہ صاف کر چکی تھیں۔مسلمانوں کی آمد کے بعد لسانی تحریکیں اس قدر گڈمڈ ہو گئی تھیں کہ بیرونی اور اندرونی زبانوں کے دائرے عموماً ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں''۔

(اُردو کی تہذیبی قدر و قیمت۔ مالک رام)

''اُردو ایک مخلوط زبان ہے۔ہندوستان کی تہذیب کی جاندار روایات کو آگے بڑھانے میں جن عوامل کا ہاتھ ہے ان میں ایک اُردو زبان بھی ہے۔اُردو ادب نے ''ہندوستانیت'' کے وسیع مفہوم کو ہمیشہ مدنظر رکھا ہے۔اور اسے مختلف طریقوں سے ہم تک پہنچایا ہے، اس میں شک نہیں کہ اردو نے عربی اور فارسی سے بہت کچھ لیا ہے لیکن وہ فارسی کا وجودِ ظلّی نہیں۔میؔر، میرؔحسن، غالبؔ اور جگرؔ کی زبان خیّام یا حافظ کی زبان نہیں ان کی اپنی زبان ہے جو ملک کے تاریخی اور تہذیبی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آئی ہے۔''

(اُردو کی تہذیبی قدر و قیمت۔ از مالک رام)

''مشکل زبان رائج کرنے کی کوشش دراصل اسی ذہنیت کی آئینہ دار ہے۔جو آج سے سینکڑوں برس پہلے برہمنوں کے اندر پائی جاتی تھی۔یہ ذہنیت ایک قسم کی سامراجی ذہنیت ہے جس کے ذریعے سے ایک مخصوص طبقے کو برسر کار لانا مقصود ہے۔قانون کے ذریعے سے زبان بنانے کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔زبان صدیوں میں تشکیل پاتی ہے۔''

(فاران کراچی۔ اکتوبر ۱۹۴۹ء)۔

اس زمانے میں پنڈت سندر لال نے مہاتما گاندھی کو ایک خط میں توجہ دلائی تھی۔''اُردو نہ مسلمانوں کی اور نہ کسی اور کی مذہبی زبان ہے۔اور نہ کبھی تھی۔وہ صرف اس ملک کے رہنے والوں کی جن میں ہندو،مسلمان،عیسائی اور جین شامل ہیں۔قدرتی اور مادری زبان ہے۔ اس کو ترقی دینے میں ہندوؤں نے اتنا ہی حصّہ لیا ہے جتنا مسلمانوں نے اور آج تک بہت سے ہندوؤں کو اس پر ایسا ہی فخر ہے جیسا کہ مسلمانوں کو ہے۔'' (فاران کراچی۔اکتوبر ۱۹۴۹ء)

یہی نہیں۔اردو شاعروں اور ادیبوں کے تذکرے بھی مشرقین نے لکھے ہیں۔''مسٹر فیلن اور مولوی کریم الدین نے باہمی شرکت و معاونت سے شعرائے ہند کا تذکرہ ''طبقات شعرائے ہند'' کے نام سے مرتب کیا ہے۔ان کے علاوہ گراہم بیلی نے ایک مختصر کتاب ''ہسٹری آف اُردو لٹریچر'' کے نام انگریزی میں لکھی اور لندن میں شائع کی۔فورٹ ولیم کالج سے سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی تک عشق کی ایک جست نہیں ہے۔بلکہ دلّی کالج اس کی درمیانی کڑی ہے۔ڈاکٹر اسپرنگر کئی سال تک دلّی کالج کے پرنسپل رہے۔اردو کا سب سے بڑا عاشق گارساں وتاسی تھا۔یہ ایک فرانسیسی محقق تھا۔اسے اردو زبان سے ایسا لگاؤ اور تعلق پیدا ہو گیا تھا کہ پیرس میں اپنے وطن میں بیٹھے ہوئے اردو کی رفتار و ترقی کا مطالعہ کرتا رہتا تھا اور ہندوستان میں رہنے والے اپنے انگریز دوستوں سے معلومات حاصل کر کے ہر سال کے آخر میں پیرس یونیورسٹی میں اردو کی سال بہ سال ترقی پر لیکچر دیتا تھا۔اس طرح اس نے ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء تک ۱۹ لیکچر دیئے جنہیں انجمن ترقی اردو نے چھاپ دیا ہے۔ان لیکچروں میں شعر و ادب،صحافت،اخبارات،طباعت مصنفین وغیرہ کے بارے میں ذکر ملتا ہے۔اس کے علاوہ دتہ سی کی ادرات میں اُردو کی کئی کتابیں چھپی ہیں اس نے ترجمے بھی کئے ہیں۔اس کی تصانیف میں ایک اُردو کی تاریخ بھی ہے۔اس کے تذکرے میں تین ہزار ہندی،اردو شعراء اور مصنفین کا ذکر ملتا ہے۔

اس بارے میں دو رائے ہرگز نہیں ہے کہ اُردو ہندو مسلمانوں کے تہذیبی تال میل اور مشترکہ کوششوں کی دین ہے۔زبانیں اس طرح آپ ہی آپ نہیں پیدا ہو جایا کرتیں بلکہ اس کے لئے کچھ معاشرتی،معاشی،سیاسی،ثقافتی عوامل بھی کام کر رہے ہوتے ہیں۔اس وقت پنجاب میں پنجابی،بنگال میں بنگالی،سندھ میں سندھی،گجراتی گجرات میں اور مہاراشٹر میں مراٹھی،مدراس میں تمل وغیرہ وغیرہ زبانیں بولی جا رہی تھیں۔اردو کا وجود اس کا زندہ ثبوت ہے۔جسے بغیر کسی قبل از وقت کی منصوبہ بندی کے تحت بتدریج عروج و قبول نہیں ملا۔بلکہ بقول عبدالحق صاحب:''اُردو تہذیبی کٹھالی میں تپ کر کندن ہو رہی تھی۔''

گارسن دتاسی کے علاوہ ڈاکٹر لیبان،جے ہمیس،جارج کیمل،ونسٹسٹ اسمتھ،ڈنکن فاربس،ڈاکٹر جون گلکرسٹ،رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو جیسے بے شمار عالم و فاضل غیر مسلم اہل قلم اور مفکرین نے اردو کے خدوگیسو کو سنوارنے اور اجالنے میں بیش قیمت خدمات انجام دی ہیں۔

گذشتہ ڈیڑھ دو صدی کا ہندوستانی لٹریچر بڑی حد تک اردو زبان کا ہی مرہونِ منّت ہے۔اس لٹریچر کو بنانے،سنوارنے،پھیلانے اور وسعت دینے میں اسے علمی موضوعات سے مالا مال کرنے میں اور دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے شانہ بہ شانہ لانے کے لئے کسی ایک فرقہ کے لوگوں ہی حصّہ نہیں لیا ہے۔بلکہ وہ ہر فرقہ کی مشترکہ کوششوں اور ذہنی صلاحیتوں کی کمائی ہے اور وہ ہندوستانی تہذیب اور سماج اور مزاج کا ایک تلازمہ بن گئی ہے۔اس کو ختم کرنے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی ماضی کی ادبی اور سماجی تاریخ میں ایک بہت بڑا ڈیڑھ دو صدی پر محیط بھیانک خلاء space پیدا کر دیں۔قومیں ماضی سے خود کو الگ کر کے زندہ نہیں رہ سکتیں،اس لئے وہ اپنے آرٹ،

ادب، لٹریچر سے بھی بیگانہ رہ کر اپنی شناخت کھوتی چلی جاتی ہیں اور ایک وقت آتا ہے کہ وہ حالات کے شیطانی چکّر کا شکار ہو کر کسی لائق کی نہیں رہ جاتیں۔

گذشتہ تاریخ اس بات کی شاہدِ عادل ہے کہ ہم اردو زبان سے کسی بھی قیمت پر علیحدگی اختیار نہیں کر سکے ہیں۔ کیونکہ وہ ہمارے ذہنی، ادبی، تہذیبی، ثقافتی، علمی سماجی ارتقاء کی آئینہ دار و ہم عناں رہی ہے۔ اُردو زبان میں بدلتے شعور کی عکّاسی، حیاتِ نو کی دھڑکنیں، فکر و جذبے کا آہنگ اور ہر دور میں انقلاب کے لہو کی گرمی شامل ہے۔ وہ ایک زندہ رواں دواں احساس کی جاندار عکاسی اور تخلیقی بصیرت کا ضمیر لئے ہوئے ہے۔

آزادی کے بعد ہندی کے غالی حامیوں نے بہت عجلت اور جلد بازی میں ہندی کو راج سنگھاسن پر بٹھا دیا لیکن اُردو اپنے تہذیبی رچاؤ سماجی شعور کی عمومیت اپنے ادبی سرمائے کے تحت آج بھی اسطرح زندہ ہے کہ اپنے مزاج کے مطابق اس نے نئے حالات کی تازہ کار ہواؤں کو بھی اپنے اقلیم کے دبستانوں کو لہلہانے اور نئے گل بوٹے کھلانے کے لئے اس طرح قبول کر لیا ہے کہ وہ اس کا سرمایہ بن گئے ہیں۔ آزادی کے بعد اُردو کے ادیبوں، شاعروں، محققین اور تخلیق کاروں نے ملکی زبانوں کو شجرِ ممنوعہ نہیں بنایا بلکہ مراٹھی، پنجابی، ہندی، سنسکرت، بنگالی یہاں تک کہ شمالی ہندوستان کے عوام کے محاوروں کو اپنے مزاج میں سمو کر اسطرح ہم آہنگ کر لیا ہے کہ وہ خود آج اردو نژاد معلوم ہوتے ہیں۔ اُردو نے ہندی اور دیگر زبانوں سے خود کو بچایا نہیں بلکہ ان کو اپنے اندر جذب کر لیا اور آج کی اُردو آزادی سے پہلے کی اُردو سے بہت مختلف اور ترقی یافتہ ہو گئی ہے۔ پہلے عربی فارسی الفاظ محاوروں کی کثرت تھی تو اب ان میں ہندی، سنسکرت اور دیگر ملکی زبانوں کے الفاظ اور محاورے، اردو کے آہنگ اور مزاج کے ساتھ سمو لئے گئے ہیں۔ اسی طرح اُردو زبان نے اپنی بے پناہ کشش، جاذبیت اور لچک سے حالات کی سخت قہرمانیوں میں اپنے لئے نخلستان اُبھارنے کی کوششوں میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اُردو کے لئے بہت سارے نئے مسائل بھی پیدا ہوئے ہیں۔

جناب سہیل عظیم آبادی ''اُردو ادیبوں کا مسئلہ'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''اِس وقت عام طور پر اُردو کے ادیب تین خانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک جماعت وہ ہے جو سرکاری اداروں سے منسلک ہے (اور آہستہ آہستہ ریٹائر ہو رہی ہے۔) دوسری وہ جو غیر سرکاری اداروں مثلاً یونیورسٹیوں سے منسلک ہے اور تیسری وہ جو فلموں یا تجارتی رسالوں سے منسلک ہے۔ چند ایک ایسے بھی ہیں جو آزاد ہیں یا اپنا خود کوئی کام کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی حالات سے خوش نہیں ہے۔ اور وہ اپنی راہ میں قدم قدم پر رکاوٹ پاتے ہیں اور جیسا ادب پیدا کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے حالات کو سازگار پاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اُردو میں اچھا ادب پیدا نہیں ہو رہا ہے۔ حالانکہ بات ایسی نہیں کہ اردو کتابیں شائع نہیں ہوتی، یا رسالے شائع نہیں ہو رہے ہیں۔ بلکہ بات صرف اتنی سی ہے کہ ملک کی تقسیم کے بعد جو افراتفری پیدا ہوئی ہے اس نے ماحول کو پراگندہ کر دیا ہے۔ اور اس میں پست درجے کی تحریریں ادب کے نام پر بازار میں آ گئیں۔

''آج اگر اعداد و شمار کا جائزہ لیا جائے تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے تقسیم ملک سے پہلے کے مقابلے میں کم کتابیں شائع نہیں ہوئیں اور نہ رسالوں کی تعداد میں کمی ہوئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عام پڑھنے والوں کا مذاق گر گیا ہے اور عام لوگوں کے پست مذاق سے فائدہ اُٹھا کر تجارتی منافع کمانے والے ناشروں نے ماحول اور بھی خراب کر دیا ہے۔ اور اچھّا ادب فروغ نہیں پایا۔ اس وجہ سے اردو کے

ادیبوں کے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔''

وہ مزید لکھتے ہیں:

''اُردو کا ایک ادیب یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ آزادرہ کر کچھ کام کرنا ہے۔ اور محض اپنی تحریروں کے سہارے اسے زندہ رہنا ہے۔ آج اگر جائزہ لیا جائے تو سارے مُلک میں سیکڑوں معیاری کتابوں کے مسودے پڑے ہوئے وقت کا انتظار کر رہے ہیں، اور حالات ایسے ہیں کہ شاید مسودے اشاعت سے پہلے دیمک کی نذر ہو جائیں گے۔''

یہ تو حالات کا ایک ایسا جائزہ ہے جس میں تشکیلِ زبان، تخلیقِ ادب، تحقیقِ رموز، اشاعت اور کتابوں اور اُن کے مصنفوں کے بارے میں کسی حد تک ذِکر آ گیا ہے۔ لیکن فی زمانہ جتنی تیزی سے تغیرات و انقلابات کا پہیّہ چل رہا ہے وہ انسانی تہذیب و معاشرت کو نت نئے حالات کے سُپرد کرتا چلا جا رہا ہے اور چونکہ زبانوں کا رابطہ معاشرے اور سماج سے ہوتا ہے۔ اس لئے وہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ دو دو عالمی جنگوں کے بعد اقوامِ متحدہ اور سلامتی کونسل کی تشکیل کے بعد دُنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے لئے کسی چشمِ دوربین کی ضرورت نہیں ہے۔ تھوڑے تدبّر اور غور و فکر کے بغیر ہی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ہمارا ترقّی یافتہ انسانی معاشرہ اور اس کی پختہ کار بنیادیں اور اخلاقی قدریں مسلسل انحطاط و زوال اور شکست و ریخت سے دوچار ہیں اور اس کا سب بڑا سوال سیاست ہے۔ سیاست آج کی دنیا کی وہ طاقتور شئے بن کر سامنے آ گئی ہے کہ اس کے سامنے کسی کا چراغ جلنے نہیں پا رہا ہے۔ آزادی کے بعد کی سیاست میں تعصب کی جو کالی آندھی آئی تھی اس نے اگر چہ اُردو کے ہر روشن اور تابناک چہرے کو دھندلا دیا تھا۔ مگر آج ۴۵ سال بعد اسی تعصّب کی کالی آندھی نے جو اندھے فتنے اُٹھائے ہیں اس سے ہندوستان کی تمام صحت مند روایات و تہذیبی قدروں کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ خاص طور پر ہندوستان کی گزشتہ دو دہائیوں کی سیاست کے نتیجہ میں جو پچھلی صدی کے بطن سے بتدریج سامنے آئے تھے آج ان خطروں کو مزید بڑھا دیا ہے۔

یہ بات ہم خوب اچھی طرح جان چکے ہیں کہ زبانیں بیک وقت آسمانوں سے نازل نہیں ہوتیں، نہ زمین کے بطن سے دفینوں کی طرح دریافت ہوتی ہیں۔ ان کی ترقی و فروغ بتدریج زینہ بہ زینہ ہوتا ہے اور صدیوں کے مسلسل تعامل کے بعد اس کا ادبی سرمایہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اردو ایک ایسی زبان ہے جو قوموں کے تمدّن، اس کی ضرورتوں اور خواہشوں کے التہاب سے تیزی سے ابھری اور اقصائے ملک پر محیط ہو گئی۔ زبانوں کے عروج کا زمانہ وہی ہوتا ہے جب اس کا ذخیرہ تیزی سے وافر اور بامعنیٰ بنتا چلا جاتا ہے۔ وہ اوپر سے مسلّط نہیں کی جاتی بلکہ سماجی خواہش اس کی خود ارتقاء پذیر کرتی ہے۔ جب زبانیں معاشرے میں نفوذ کر جاتی ہیں تو تیزی سے ادب، آرٹ، لٹریچر تخلیق پاتا ہے۔ لیکن اگر زبانوں کا رشتہ سماج اور معاشرے میں سے منقطع ہو جائے تو یہ زندہ اور متحرک عوامی زبان ہونے کی بجائے روایات اور کلاسک کا روپ دھارن کر لیتی ہیں۔ ایسی زبانوں کے لئے تحقیق و ریسرچ کا کام تو خوب خوب ہوتا ہے لیکن یہ تحقیق و ریسرچ ایسی ہی ہوتی ہے جیسے آثارِ قدیمہ کے نوادرات کی چھان بین میں سامنے آتی ہیں۔ اس سے ڈگریاں تو حاصل کی جا سکتی ہیں لیکن سچ پوچھیں تو اس سے سماج کا کچھ بنتا بگڑتا نہیں ہے۔

از منۂ قدیم سے انسانوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ ماضی اور اس کے کھنڈرات کی تحقیق کو مصدر سمجھتا رہا ہے۔ اس قسم کی ریسرچ و تحقیق کا کام زندگی اور جدوجہد کی علامت تو قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک مردہ جسم کو لباس سے آراستہ کرنے کی کوشش کرنا۔ درآنحالیکہ مُردہ جسم میں رُوح پھونکنا انسانی کوششوں کے بس کی بات نہیں ہے۔

ایسے اشعار سنانے والے کی تعریف کرتے سنا ہوگا، ایسے اشعار کو سن کر لوگوں کو جھومتے دیکھا ہوگا، ویسے غزل کے دہ مصروں میں ہی دنیا جہان کی باتیں کی جاتی ہیں۔غزل کا شعر تو شاعر کے اندرونی جزبات واحساسات اور اس کے تجربات کا اظہار ہے اس لیے تو وہ فطرت میں کسی نہ کسی قسم کا اضافہ کرتا ہے جن سے وہ آشنا ہوتے رہتے ہیں۔ان کے اشعار عوام میں بہت مقبول ہو جاتے ہیں۔اس لیے تو آپ نے مشاعرے میں ناظم حضرات کو بھی شاعر سے زیادہ داد بٹورتے دیکھا ہوگا،مشاعروں کے ماحول کو گرمانے کے لیے ناظم اس طرح کے بے شمار اشعار ایک ہی ساتھ سنا کر لوگوں کو جوش میں لاتا ہے۔گذشتہ دنوں میں مشہور شاعر شکیل ابن شرف کے شعری دیوان سر سبز کے تقریب میں بحیثیت چیف گیسٹ شامل ہونے کے لیے دھولیہ،مہاراشٹر گیا ہوا تھا۔تقریبا پانچ گھنٹے کے اس مشاعرے میں ناظم نے دو گھنٹے ایسے شعر سنائے اور سامعین سے خوب داد بٹور لیا اور شعرا حضرات کو سنانے کا موقع نہیں دیکر اس نے خود مشاعرہ لوٹ لیا۔مشاعرہ ختم ہونے کے بعد سب لوگ جب ایک دوسرے کو مبارک دے کر رخصت ہو رہے تھے تو میں نے ناظم کو کہا آپ نے تو کمال کر دیا،میرے خیال سے ایک مشاعرہ تمام ناظم حضرات کا ہونا چاہیے۔ناظم صاحب کو برا تو لگا مگر وہ کرتے بھی کیا۔وہاں کے منتظمین حضرات میرے بہت قریب تھے۔اس طرح کے مواقع آپ کو بھی ملے ہوں گے۔میں نے تو ایک مثال دی ہے۔ایسے ہی مصرعوں اور اشعار کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا تھا

''ایسے شعر پڑھتے وقت غیر محسوس طریقے سے بیک وقت ذہن سے کئی تصویریں گذرتی ہیں جو لطف اندوزی کا سبب بنتی ہیں۔کوئی سورج،کوئی ستارہ،کوئی آئینہ،کوئی گل،کوئی بہتا دریا،کوئی بازو،کوئی ہتھیلی،کوئی تلوار،کوئی موتیوں کی لڑی،کوئی گاتا ہوا آبشار شعر آ گہی کو سرو چراغاں بنا دیتا ہے اور قاری کا ذوقِ جمال جگمگا اٹھتا ہے۔''

اس تعلق سے مشہور محقق اور تنقید نگار حقانی القاسمی بھی کچھ اسی طرح کی بات کرتے ہیں اس بیان سے سردار جعفری کی بات اور زیادہ سمجھ میں آتی ہے۔''شہرت کے لئے ایک شعر بھی کافی ہوتا ہے بشرطیکہ شعر میں قوت وتوانائی ہو کہ اجتماعی سائیکی کا ایک حصہ بن جائے۔ہماری ادبی تاریخ میں ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے،موقع کوئی بھی ہو کوئی نہ کوئی شعر بجلی کی طرح ذہن میں کوندنے لگتا ہے۔ایسے کتنے اشعار ہیں جو ہمارے ذہنوں میں گونجتے رہتے ہیں اور ہماری تحریروں کے حوالے بھی بنتے ہیں لیکن ہمیں یہ پتہ نہیں چلتا ہے کہ ان اشعار کے خالق کون ہیں۔"

زبان زد اشعار دبے پاؤں پراسرار طور پر نہایت خاموشی سے چپ چاپ انسان کے پورے وجود اور حواس پر چھا جاتے ہیں۔ایسے اشعار کی ان جذبات واحساسات تک رسائی اتنی تیزی سے ہو جاتی ہے کہ عام بول چال میں جن کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ایسے شعر کو سنتے ہی سامع کو ایسا لگتا ہے کہ غیر محسوس طور پر کوئی خیال کوئی جذبہ اس کے سراپا میں اترتا چلا جا رہا ہے۔علم مجلسی کے مصنف میر منشی عزیز الرحمٰن صاحب اپنی کتاب میں ایسے اشعار کے تعلق سے ہی لکھتے ہیں "یہ شعر ہی ایسی چیز ہے جو کسی محفل میں پڑھا جائے تو اس کے کھٹکے سے بزرگ اور سن رسیدہ اصحاب کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں،ان کے مردہ بدن میں ایک نئی روح آ جاتی ہے-ان کی خشک اور مرجھائے ہوئے رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہے, عالم شباب کی ولولہ خیزیاں ، جوانی کی مردانہ امنگیں اور نوعمری کی پر لطف کار روائیوں کا سین ان کی نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے دل بھر آتا ہے۔اب تک کی بات سے یہ پتہ چلا کہ ایک مصرع یا شعر کے ذریعہ مدمقابل کی پوری داستان سنائی جا سکتی ہے کسی طول طویل کہانی کے سنانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔جب سجاد ظہیر کا انتقال ہوا تو مولانا ماہر القادری نے یاد رفتہ کے کالم میں سجاد ظہیر پر

ایک مضمون لکھا تھا مولانا نے ان کے حالات لکھے اور ان کی پہلی ملاقات کہاں ہوئی یہ لکھا اور پھر سجاد ظہیر کی باتوں کا ذکر کیا ہے۔ ہم آپ جانتے ہیں کہ سجاد ظہیر کٹر کمیونسٹ تھے اور مولانا ماہر القادری ادب میں سجاد ظہیر کے مخالف تھے۔ سجاد ظہیر نے اپنی ساری زندگی کمنیوزم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ اللہ اور اللہ کے رسول کی باتیں بھلا کر مارکس اور لینن کے فلسفے کو اپنا کر آہستہ آہستہ وہ خدا بیزار ہو گئے تھے۔ مولانا اپنے مضمون میں لکھتے ہیں سجاد ظہیر آخری وقت میں ماسکو گئے اور وہیں انتقال کر گئے۔ کومنسٹوں نے سجاد ظہیر کی موت کی اہمیت کو محسوس کیا ہوگا اور وہیں دفنا دیا جو ایسے لوگوں کا کعبہ تھا۔ پہونچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ اس ایک مصرعے میں مولانا نے سجاد ظہیر پر جس طرح طنز کے تیر چلائے ہیں جو کسی اور کے بس کی بات نہیں ہے کیونکہ اس انداز کو اردو ادب کے پرستاروں نے ان کے بعد استعمال کیا ہوگا لیکن وہ بات نہیں بن پائی۔ شہاب جعفری کا ایک شعر ہے

تو ادھر ادھر کی نہ بات کر یہ بتا کہ قافلہ کیوں لوٹا

تری رہبری کا سوال ہے ہمیں راہزنوں سے غرض نہیں

یہ شعر بہت مقبول ہوا تھا کہتے ہیں کہ مولانا آزاد نے پارلیمنٹ میں نہرو جی کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھا تھا اس وقت شہاب جعفری کی عمر سترہ سال تھی۔ اس کے بعد تو اکثر لیڈران موقع محل پر اس شعر کو استعمال کرتے ہیں۔ ادھر کچھ دن پہلے جب من موہن سنگھ وزیر اعظم تھے انہوں نے جواب میں لمبی چوڑی بات شروع کی تو ششما سوراج نے اسے پڑھ کر پارلیمنٹ کو قہقہ زار بنا دیا۔ شعر اس کے بعد لوگوں کی زبان پر آ گیا۔ یہ اتنا سادہ شعر تھا کے وہاں بیٹھے تمام لوگ محضوظ ہو گئے اور تالیوں کی گونج میں سبھوں نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اور زیادہ مقبول کر دیا۔ اس طرح کے ہوتے ہیں عام بول چال میں استعمال ہونے والے شعر۔ ایک اور شعر ہے جو سارے ہندوستان میں بچے بچے کی زبان پر ہے۔ سیکڑوں فلموں اور ڈراموں میں جزباتی کردار سے ادا کرتے میں نے یہ شعر دیکھا ہے۔ ہم آپ جانتے ہیں۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

یہ شعر رام پرشاد بسمل مجاہد آزادی اکثر پڑھا کرتے ہیں اور پھانسی کے وقت بھی انہوں نے یہ شعر پڑھا تھا اصل میں یہ شعر رام پرساد بسمل کا نہیں ہے، شاہ محمد بسمل عظیم آبادی کا ہے، جنگ آزادی میں یہ شعر کافی استعمال ہوا ہے۔ اس کو فلموں میں بھی خوب استعمال کیا گیا ہے۔ شائد ہی کوئی دیش بھکتی فلم ہوگی جس میں اس طرح کے اشعار نہیں لئے گئے ہوں۔ اس کی لمبی فہرست ہم آپ تیار کر سکتے ہیں۔ اسی زمرے کا دوسرا شعر ہے، سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔ میرے خیال سے آزادی کے بعد علامہ اقبال کی نظم سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔ اسکولوں میں ترانے کے طور پر پندرہ اگست اور 26 جنوری کے موقع پر گایا جاتا تھا اس کی کئی پیاری دھنیں ہیں جو مقبول عام ہیں۔ یہ مصرع گاندھی جی جب جیل میں تھے تو خوب پڑھتے تھے۔ اس شعر کا جادو اچھے اچھوں کے سر پر چڑھ کر بولتا تھا چاہے وہ نہرو ہوں یا گاندھی ہو یا ملک کا کوئی بڑا فوجی افسر ہوا سے پڑھ کر ہر کوئی فخر محسوس کرتا تھا۔ جب ہمیں آزادی ملی تو کئی دنوں تک میٹنگ چلتی رہی، میٹنگ میں کب فیصلہ ہوگا اور کیا فیصلہ ہوگا یہ کسی کو نہیں معلوم تھا اچانک ۱۴/اگست کی رات کے بارہ بجے ہندوستان کو آزاد کرنے کا فیصلہ سنایا گیا، اب اس وقت جھنڈا تیار ہوا مگر راشٹر یہ گیت تیار نہیں تھا تو جھنڈا پھیراتے ہوئے اچاریہ کرپلانی نے سارے جہاں سے اچھا

گیت گانا شروع کیا اور لوگوں نے بھی اس نغمے کو ذور ذور سے گایا۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ آج بھی لوگ اس کی تیار کردہ دھنوں پر سجا یا ہوا گیت موبائل کی رنگ ٹون میں استعمال کرتے ہیں۔ کئی لوگ تو اس کی دھن ہی استعمال کرتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے جڑے ہوئے موسیقار روی شنکر نے سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا کی جو خوبصورت دھن بنائی تھی وہ آج بھی مقبول ہے۔ اس کے دیگر اشعار بھی عوام میں مقبول ہوئے تھے۔

ہم بلبلیں ہیں اسکی یہ گلستاں ہمارا، مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا، ہندی ہیں ہم وطن ہیں ہندوستان ہمارا، چین وعرب ہمارا ہندوستان ہمارا، صرف دو ہی اشعار نہیں دسوں اشعار جنگ آزادی کے دوران استعمال ہوتے رہے۔ اس لئے کہ زندگی کا راز اگر عیاں ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس کی دستک شاعر کے دل میں ہوتی ہے۔ شاعر نے قوم کی محبت کو تھوڑا سا استعارے میں اس طرح کہنا بھی شروع کیا۔

- جگر مرادآبادی

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا ہی سمجھ لیجئے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

- عتیق احمد عتیق

انقلاب دنیا میں خودبخود نہیں آتا
انقلاب آتا ہے انقلاب لانے سے

- مست کلکتوی

مٹادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چھاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل گلزار ہوتا ہے

- شکیل بدایونی

اپنی آزادی کو ہم ہرگز مٹا سکتے نہیں
سر کٹا سکتے ہیں لیکن سر جھکا سکتے نہیں

اس کے علاوہ ضرورت کے مطابق عام لوگوں میں اور بھی اشعار ہیں جو عوام میں مقبول ہیں۔ مست کلکتوی کا یہ شعر جب کسی انسان کے ہمت پست ہو جاتے ہیں تو یہی سنایا جاتا ہے۔ اس کے بعد کا شعر آج کے حالات پر پورا اترتا ہے۔ کس طرح امیر لوگ غریبوں کا خون چوستے ہیں اس کا اظہار بڑی چابکدستی سے نریش کمار شاد نے اپنے شعر میں کیا ہے۔

سرخرو ہوتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد
رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد

اصغر گونڈوی کا یہ شعر بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادس میں
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ ؎ یہاں کوتاہی ذوق عمل ہے خود گرفتاری جہاں بازو سمٹتے ہیں وہی صیادہ ہوتے ہیں

❁ علامہ اقبال

وہ لوگ پاتے ہیں عزت زیادہ
جو کرتے ہیں دنیا میں محنت زیادہ

لوگ لوگوں کا خون پیتے ہیں — شعری انتخاب ص۔۴۰
ہم نے تو صرف مے کشی کی ہے — بت کدہ۔۸۳

❁❁❁

❁ رضاؔ تھانسیری

آدمی بلبلہ ہے پانی کا
کیا بھروسہ ہے زندگانی کا (عیار الشعراء ص۔۳۰۹)

ایسے اشعار بڑے عام فہم ہوتے ہیں اس کو سمجھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ چند شعر نمونے کے طور پر نذر کر رہا ہوں۔

❁ اسلم انصاری

میں نے روکا بھی نہیں اور وہ ٹھہرا بھی نہیں
حادثہ کیا تھا جسے دل نے بھلایا بھی نہیں

❁ ثاقب کانپوری، سید ابو محمد

ثاقبؔ میں کس امید پہ دنیا میں اب جیوں
جتنے تھے زندگی کے سہارے چلے گئے

❁ نسیم امروہوی

یہ انتظار نہ ٹھہرا کوئی بلا ٹھہری
کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

❁ شکیل جمالی

شہر میں آکر پڑھنے والے بھول گئے

کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا ہے

- انور شعور

کسی سے ترک تعلق کے بعد بھی ملنا
غلط ضرور ہے لیکن کبھی کبھی کیا ہے

- میر محمد اثر

کبھی دوستی ہے کبھی دشمنی
تری کون سی بات پر جایئے (عیارالشعراء، ص۶)

- سراج لکھنوی، سراج الحسن

دل بھی تمہارا ہم بھی تمہارے
اچھا تم جیتے ہم ہارے (اردو کے مشہور اشعار، ص۱۸۴)

- خلش کلکتوی

شکوہ اپنوں سے کیا جاتا ہے غیروں سے نہیں
آپ کہہ دیں تو کبھی آپ سے شکوہ نہ کریں (عکس برعکس، ص۳۷)

- مضطر اکبرآبادی

جب گلستاں کو خوں کی ضرورت پڑی
سب سے پہلے ہی گردن ہماری کٹی

پھر بھی کہتے ہیں ہم سے یہ اہلِ وطن
یہ چمن ہے ہمارا تمہارا نہیں (آئینۂ غزل، ص۵۵)

ایسے اشعار ادھر قاری کے منہ سے نکلتے ہیں اُدھر سامع کے دل میں اتر جاتے ہیں یعنی از دلِ خیزَد بر دلِ ریزَد۔ ویسے بھی غزل کا مزاج دھان پان ہے۔ یہ کسی ثقیل لفظ کا متحمل نہیں ہے۔ بھاری بھرکم الفاظ کے ساتھ افکار و خیالات میں الجھن ہونے پر ترسیل میں کمی آجاتی ہے۔ ان میں بڑی بڑی فلاسفی کی باتیں نہیں ہیں جو عام لوگوں کی رسائی سے باہر ہو۔ اس میں چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں۔ ہمارے روزمرہ میں جس کی ضرورت ہے۔ ان اشعار کا تعلق ہماری اور آپ کی زندگی سے ہے۔ اس موضوع پر پہلے بھی شعر کہے گئے ہیں۔ مگر اس کا انداز اتنا دلکش نہیں تھا۔ اس کی فکر میں الجھاؤ تھا۔

اب آپ ہی بتائیں کہ اس میں کون سا لفظ ادق ہے۔ ایک کم لکھا پڑھا شخص بھی ان اشعار کو سمجھ سکتا چاہے وہ اردو جانے یا نہ

جانے۔اس کوتشریح کرنے کی ضرورت نہیں، یہ بالکل نثر ہے۔ہم اپنی روزانہ کی زندگی میں اس طرح کے مقولے کے جیسے شعر استعمال کر کے اپنی تقریر اور تحریر کو جاذب بناتے ہیں۔اپنی بات کا وزن برھاتے ہیں۔اکثر بڑے بڑے شعراء اور ادبا اپنی باتوں میں اس طرح کے اشعار کو شامل کرتے ہیں کچھ تو اس کی نثر کر دیتے ہیں۔اور اپنی باتوں میں جان ڈال دیتے ہیں۔نظیر کے اس شعر کو دیکھیں سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لا د چلے گا بنجارہ۔اسکولوگوں کو کہتے سنا ہے۔جب دنیا سے آدمی جانے لگے گا تو سب ٹھاٹھ یہیں کا یہیں رہ جائیگا۔اس طرح کے اور بھی شعر ہیں جو نثر کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔یہ بات مسلّم ہے کہ شاعر کے مشہور ہونے کے لئے ان کا ایک شعر کافی ہے۔ان کے بقیہ اشعار کی بھی اہمیت اس شعر کی وجہ سے بڑھ جاتی ہے۔قارئین ان اشعار کو بھی اسی خیال سے پڑھتے ہیں۔مشہور نا قد روشاعر وامق جونپوری نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ دیوان کا دیوان لکھنے سے بہتر ہے صرف ایک شعر ایسا کہا جائے جو ہر جگہ مشہور ہو جائے ہم نے کئی ایسے شعر کے گمنام نام شاعر کا پتہ لگایا ہے جس کا ایک ہی شعر اس سے کہیں زیادہ مشہور رہے۔

بہت دیر کی مہرباں آتے آتے، ڈگمگانا بھی ضروری ہے سنبھلنے کے لیے، اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی، بس ہو چکی نماز مصلّا اٹھایئے، جو تری بزم سے نکلا وہ پریشان نکلا، تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں، عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ت، تنگدستی اگر نہ ہو سا لک تندرستی ہزار نعمت ہے، جب سے دیکھی ہے ابوالکلام کی نثر، نظم حسرت میں وہ مزا نہ رہا، وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے ،اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ، سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے، مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا، نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے، جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں اسی کا ہے، بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے، اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے، لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا، انگور حلال ہے مے انگور حرام، کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے، کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے، سرخرو ہوتا ہے انسان ٹھوکریں کھانے کے بعد، مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے، زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا، عیب بھی کرنے کو ہنر چاہئیے، بڑی مشکل سے چمن میں ہوتا ہے دیدہ ور پیدا، فعل بد تو ان سے ہو لعنت کرے شیطان کو، ہم آگے کے باب میں ایسے اشعار کو پڑھیں گے۔

❁❁❁

باب ۔۲

اہم اشعار

کا انتخاب اوران کے شعراء کے نام اور حالات

❁❁❁

باب ۔۲ اہم اشعار کا انتخاب اور ان کے شعراء کے نام اور حالات

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ ۲۷، دسمبر ۱۷۹۷ کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ شادی کے بعد آگرہ سے دلی منتقل ہوئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ مرزا غالب اردو ادب کے ایک ایسے شاعر ہیں جن کے پڑھنے والوں کی اکثریت انہیں باقی تمام شعرا پر فوقیت دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب پر بہت زیادہ لکھا جا چکا ہے اور اب بھی لکھا جا رہا ہے۔ ان کی شاعری اتنی تہہ دار ہے کہ ہر بار جب مطالعہ کیا جاتا ہے تو ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے ایک نئے غالب سے آشنائی ہوتی ہے۔ اردو میں سیکڑوں کتابوں کے نام غالب کے اشعار سے لئے گئے ہیں۔ کئی فلمیں ان کی زندگی پر بنی ہیں دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں غالب کے اشعار کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ دیوان غالب، عود ہندی، اردو معلیٰ (خطوط کا مجموعہ) ان کی تصانیف ہیں۔ غالب ایک بلند پایہ ادیب بھی ہیں ان کے خطوط کو جدید نثر کا آغاز کہا جاتا ہے اور یہ سنگِ میل بھی ہے۔ ۷۳ برس کی عمر میں ۱۵ / فروری ۱۸۶۹ء میں انتقال کر گئے۔ بستی نظام الدین میں مدفون ہوئے۔

دیوانِ غالب، آزاد بک ڈپو، امرتسر، ۱۹۶۸ء، مملوکۂ نصرت

غالبؔ

آئے ہے بیکسئ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد
دیوان غالب، ص ۱۷۶

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار
دیوان غالب ۔ ص ۶۳۵

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے
دیوان غالب ۔ ص ۴۰۵

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی
دیوان غالب ص ۔ ۵۵۳

یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا
دیوان غالب ۔ ص ۳۹

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
دیوان غالب ۔ ص ۷۷

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

دیوان غالب۔ص ۸۸

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشہ نہ ہوا

دیوان غالب۔ص ۹۸

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کے رقیب
گالیاں کھا کے بد مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشہ ہوا گلہ نہ ہوا

دیوان غالب۔ص ۱۱۰

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

دیوان غالب۔ص ۱۳۰

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

دیوان غالب۔ص۱۳۳،۱۳۴
ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

دیوان غالب۔ص۱۸۲
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

دیوان غالب۔ص۴۵۷
میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یا رب کئی دئے ہوتے

دیوان غالب۔ص۵۱۳
سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب
خدا سے کیا ستم وجورِ ناخدا کہئے

دیوان غالب۔ص۱۹۱
یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

دیوان غالب۔ص۵۵۶
ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے، پہ بدنام بہت ہے

دیوان غالب۔ص۸۵
ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

دیوان غالب۔ص۔۳۱۱
قید ِ حیات وبندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی،غم سے نجات،پائے کیوں

دیوان غالب۔ص۳۸۰
قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

دیوان غالب۔ص۵۳۲
کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں وعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی
دیوان غالب۔ص۳۸۰

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خا مہ نوائے سروش ہے
دیوان غالب۔ص۴۳۰

قسمت بری سہی پہ طبیعت نہیں بری
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
دیوان غالب۔ص۶۲۶

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور
دیوان غالب۔ص۱۹۱

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
دیوان غالب۔ص۱۹۸

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دیوان غالب۔ص۲۲۰

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جزمرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
دیوان غالب۔ص۲۲۱

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
دیوان غالب۔ص۲۴۴

مہرباں ہوکے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
کیوں گردش مدام سے گھبرانہ جائے دل
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
دیوان غالب۔ص۲۴۴

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہو ں میں
دیوان غالب۔ص۲۹۱

رنج سے خو گر ہو انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں
دیوان غالب۔ص۲۹۴

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
دیوان غالب۔ص۳۰۲

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مرگیا تو جنگل اداس ہے
دیوان غالب۔ص۳۶۸

کھلتاکسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسواکیا مجھے
دیوان غالب۔ص۳۸۳

موت کاایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت وزہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی
دیوان غالب۔ص۴۰۹،۴۱۰

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشہ کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
دیوان غالب۔ص۵۴۶

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جسکوعشق خلل ہے دماغ کا
دیوان غالب۔ص۱۲۳

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت ہے گویا کوئی دن اور

دیوانِ غالب،ص ۱۹۸

کا وِ کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرناشام کا لانا ہے جوئے شیر کا

دیوان غالب۔ص ۲۱

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

دیوان غالب۔ص ۸۴

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں ، جو وہ لکھیں گے جواب میں

علم مجلسی۔ص ۸۰
دیوان غالب۔ص ۲۵۸

میں اور بزم ِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہواتھا

آوارہ گرد۔ص ۳۶
دیوان غالب۔ص ۱۲۰

گنجینۂ معنیٰ کا طِلِسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

دیوان غالب۔ص ۴۳۸

رکھیوغالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

دیوان غالب۔ص ۴۵۱

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشا ئے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

دیوان غالب۔ص ۲۵۶

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

غبارِ خاطر،ص ۶۱
دیوان غالب،ص ۳۹

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر، تھا جوراز داں اپنا

دیوان غالب۔ص ۱۴۶

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

دیوان غالب۔ص ۳۳۷

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

دیوان غالب۔ص۴۹۰

نے تیر کماں میں ہے ، نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

غبار خاطر،ص۳۰
دیوان غالب،ص۵۵۵

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گنا ہوں کی سزا ہے

غبار خاطر،ص۳۴
دیوان غالب،ص۵۴۸

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو نا چار کیا کریں

غبار خاطر،ص۳۹
دیوان غالب،ص۲۸۱

فر یاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند ِ نے نہیں ہے

دیوان غالب۔ص۴۸۸

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہ گذر کو میں

غبار خاظر،ص۲۶۳
دیوان غالب،ص۲۶۹

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو،اور ہم زباں کوئی نہ ہو

تاریخ اردو،ص۴۶۷
دیوان غالب،ص۳۶۴

پلا دے اوک سے ساقی جوہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

غزل،ص۵۷
دیوان غالب،ص۴۸۳

یہ باعث نو میدیِ اربابِ ہو س ہے
غالب کو برا کہتے ہواچھا نہیں کرتے

دیوان غالب۔ص۴۹۰

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

دیوان غالب۔ص۲۳۳

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ روبا کہتے ہیں
دیوان غالب ۔ص ۲۳۲

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیان کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
دیوان غالب ۔ص ۴۲۵

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدّعا کیا ہے
دیوان غالب ۔ص ۴۱۳

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
دیوان غالب ۔ص ۴۱۳

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے
دیوان غالب ۔ص ۴۱۳

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
دیوان غالب ۔ص ۴۴۱

دیکھیئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
یادگار غالب، ص ۱۷۹
دیوان غالب، ص ۴۴۱

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے
دیوان غالب ۔ص ۴۵۸

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے
دیوان غالب ۔ص ۴۷۸

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
دیوان غالب ۔ص ۴۷۸

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب وروزتما شا مرے آگے
دیوان غالب ۔ص ۵۰۸

گوہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دوابھی ساغر و مینامرے آگے
دیوان غالب ۔ص ۵۰۸

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
ابنِ مر یم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
جب تو قع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی
دیوان غالب ۔ص ۵۲۶

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارما ن لیکن پھر بھی کم نکلے
محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کا فرپہ دم نکلے
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہوکر ترے کو چے سے ہم نکلے
دیوان غالب، ص ۵۳۲

شوق ہر رنگ رقیب ِ سروساما ں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
دیوان غالب، ص ۳۵

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے
دیوان غالب ۔ص ۵۴۶

بقدر ِشوق نہیں ظرفِ تنگنا ئے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کیلئے
ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یا رانِ نکتہ داں کہ لئے
دیوان غالب، ص ۵۶۳

سیکھے ہیں مہ رخوں کیلئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہئے
دیوان غالب۔ص۳۵۱

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہئے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہئے
دیوان غالب۔ص۳۵۱

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوش ِ قدح سے بزم ِچراغاں کئے ہوئے
دیوان غالب۔ص۵۵۸

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
دیوان غالب۔ص۲۸۴

ہر ایک بات پہ کہتے ہوتم کہ تو کیاہے
تمھیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے
دیوان غالب۔ص۴۵۴

بے خود ی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پر دہ داری ہے
دیوان غالب۔ص۴۱۹

لکھتے رہے جنوں کی حکایات ِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
دیوان غالب۔ص۴۲۵

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور ِجام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہوشراب میں
دیوان غالب۔ص۲۵۸

لووہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں
دیوان غالب۔ص۲۶۹

عشرت ِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا
دردکاحد سے گذرنا ہے دوا ہوجانا
دیوان غالب۔ص۱۵۴

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا
دیوان غالب۔ص۶۲۱

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے
دیوان غالب۔ص ۶۲۵

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خداگواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے
دیوان غالب۔ص ۶۲۶

ہوا ہے شہ کا مُصاحب پھرے ہے اتراتا
وگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے
دیوان غالب۔ص ۴۵۴

استاد ِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
دیوان غالب۔ص ۶۲۵

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اسنے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
دیوان غالب۔ص ۳۹۸

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا
جلاہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کرید تے ہوجواب راکھ جستجو کیا ہے
دیوان غالب۔ص ۴۵۴

داغ ِفراق صحبت ِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے
خیابان ادب،ص ۱۳۵
دیوان غالب،ص ۴۳۰

بوئے گل نا لۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا
دیوان غالب۔ص ۳۵

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی
دیوان غالب۔ص ۴۴۶

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو ، کوئی خانقاہ ہو
گلستان، ص۳۷
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
دیوان غالب، ص۳۴۷
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
دیوان غالب ۔ص۱۴۲
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
دیوان غالب ۔ص۳۴۷
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
دیوان غالب ۔ص۳۴۷
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

ان پری زادو ں سے لینگے خلد میں ہم انتقام
دیوان غالب ۔ص۲۹۴
قدرت ِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایا ں ہوگئیں
دیوان غالب ۔ص۲۹۴
خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہوگئی

یادگار غالب، ص۱۸۵
کیا کیا خضر نے سکندر سے
دیوان غالب ۔ص۵۲۶
اب کسے رہنما کرے کوئی

یادگارِ غالب، ص۱۶۱
ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
دیوان غالب، ص۱۸۵
جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

یادگارِ غالب، ص۱۶۵
کہتے ہیں کہ جیتے ہیں امید پہ لوگ
دیوان غالب، ص۲۵۴
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
دیوان غالب ۔ص۱۴۲
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے
دیوان غالب۔ص۳۷۰

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے
دیوان غالب۔ص۴۱۳

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
دیوان غالب۔ص۲۶۸

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار
دیوان غالب۔ص۶۳۵

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لینگے قیامت میں تمھیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں
دیوان غالب۔ص۲۷۳

گو واں نہیں پہ واں سے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی
دیوان غالب۔ص۵۵۳

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
دیوان غالب۔ص۷۷

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی
دیوان غالب۔ص۴۴۶

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا
دیوان غالب۔ص۱۴۷

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں
دیوان غالب۔صفحہ نمبر۔۲۹۴

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
تاریخ اردو،ص۲۴۸
دیوان غالب،ص۳۱۱

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

تاریخ اردو، ص۲۴۰
دیوان غالب، ص۳۵۱

رات دن گردش میں ہے سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

دیوان غالب۔ص۱۵۱

مضمحل ہوگئے قُویٰ غالب
وہ عناصر میں اِعتِدال کہاں

دیوان غالب۔ص۲۳۱

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

دیوان غالب۔ص۳۴۲

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب ِطہور کی

دیوان غالب۔ص۵۵۲

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

دیوان غالب۔ص۴۶۲

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر ِ تصویر کا

دیوان غالب۔ص۲۱

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

دیوان غالب، ص۵۹٦

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

دیوان غالب۔ص٦۱٦

طرز ِ بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

دیوان غالب، ص۔۔

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

دیوان غالب، ص۳۷۵

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے
دیوانِ غالب،ص۵۰۸

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
دیوانِ غالب،ص۲۶۹

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی
دیوانِ غالب،ص۵۵۳

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ با اندازۂ خمار نہیں
دیوانِ غالب،ص۴۳۳

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے
دیوانِ غالب،ص۵۵۹

کس سے محرومی ٔقسمت کی شکایت کیجئے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا
دیوانِ غالب،ص۵۵۹

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ ادا کیا ہے
دیوانِ غالب،ص۴۱۳

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا
دیوانِ غالب،ص۲۴

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
دیوانِ غالب،ص۱۲۲

❁❁❁

طاہر تلہری

نرم الفاظ بھی چُبھ جاتے ہیں نشتر کی طرح
چوٹ پھولوں سے بھی لگ جاتی ہے پتھر کی طرح
پہلا پتھر،ص۱۱۲

شاہجہاں پور کے ایک قصبہ تلہر میں ۱۹۳۶ء میں طاہر تلہری پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں نعت شریف سے اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ غزل میں بڑا نام کیا۔ انہیں شاعرِ حیات کہا گیا ہے۔

تین مجموعے پہلا پتھر، الکلام، حرف بے لباس اور ایک مجموعہ ان کی موت کے بعد پتھر کو موم کیا ہے شائع ہوئے۔ ابھی بھی ان کے صاحبزادے کے پاس بہت سا کلام موجود ہے۔ ڈاکٹر تابش مہدی نے ان کے فن اور شخصیت پر کام کیا ہے۔

۳۱ رجولائی ۲۰۰۳ کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

❁❁❁

ندا فاضلی

یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا — شعوری رجحانات، ص ۲۸
مجھے گرا کے اگر تم سنبھل سکو تو چلو — آ ملیح اور۔۔۔ ص ۱۰

دنیا جسے کہتے ہیں بچّے کا کھلونا ہے — شعوری رجحانات، ص ۳۱
مل جائے تو مٹی ہے کھو جائے تو سونا ہے

کہیں زمیں کہیں آسماں نہیں ملتا — مور ناچ، ص ۴۶
کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجئے رشتہ — مور ناچ، ص ۶۴
دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہئے

۱۲ راکتوبر ۱۹۳۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ گوالیار میں تعلیم پائی۔ ایم اے (انگریزی) کیا۔ ۱۹۵۶ء میں بمبئی آئے۔ یہاں فلموں سے وابستہ رہے ان کی بہت سی غزلوں کو کامیاب گلوکاروں نے گایا ہے۔ ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ سے بھی نوازے گئے۔

❁❁❁

کلیم عاجز

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ — تاریخِ اردو ادب، ص ۱۳۲
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو — وہ جو شاعری کا سبب ہوا، ص ۳۵۲

اپنا تو کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ — تاریخ ادب اردو، ص ۱۵۷۱
رستے میں خواہ دوست یا دشمن کا گھر ملے — اردو کے روشن مینار، ص ۴۰۷

۱۱ راکتوبر ۱۹۲۶ء کو تلہاڑا (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ انہیں اس صدی کا میر کہا جاتا ہے۔ وہی شائستگی، وہی زبان اور وہی بیان جو میر کا مقبول ہوا ہے اُسے کلیم عاجز نے نئے پیرائے سے استعمال کیا ہے۔ اکثر ان کے اشعار پر میر کا گمان ہوتا ہے۔ بڑے نفیس آدمی ہیں میں نے انہیں اپنے کالج کے آل انڈیا مشاعروں میں بہت قریب سے دیکھا اور سنا ہے۔

ان کا شعری مجموعہ ''وہ جو شاعری کا سبب ہوا'' کئی بار شائع ہوا۔اس کے علاوہ قصّہ ''بےسمت زندگی کا'' ان کی آپ بیتی ہے۔ان کی نثر بھی سجی ہوئی ہے زبان پر عبور ہے۔نثری تصانیف میں ''یہاں سے کعبہ کعبہ سے مدینہ''، 'جب فصلِ بہاراں آئی تھی' قابل ذکر ہیں۔ پٹنہ کالج میں اردو پڑھاتے تھے۔کلیم عاجز اب تک بقیدِ حیات ہیں۔ دین کے کام میں اپنا زیادہ وقت صرف کر رہے ہیں۔

❁❁❁

ابو المجاهد زاهد

ایک ہو جائیں تو بن سکتے ہیں خورشید مبیں
ورنہ ان بکھرے ہوئے تاروں سے کیا بات بنے — کلیاتِ زاہد، ص ۱۲۴

۲۸/جون ۱۹۲۸ء کو رامپور پیدا ہوئے۔ سیماب کے شاگرد تھے اور فارغ الاصلاح کی سند پا چکے تھے۔ سیماب نے بہت جلد انہیں فارغ الاصلاح بنا دیا۔ جماعتِ اسلامی ہند نے انہیں حکیم مومن خان مومن ایوارڈ سے نوازا تھا۔تگ و تاز کھلتی کلیاں (۱۹۷۵ء)، بچّوں (۱۹۵۷ء) اور یدِ بیضا (۱۹۹۸ء) شعری مجموعے ہیں۔کہنہ مشق شاعر تھے۔انہوں نے اپنی شاعری کے لئے مومنانہ انداز اختیار کیا۔

❁❁❁

آنند نرائن مُلّا

وہ کون ہے جنہیں توبہ کی مل گئی فرصت — جدید غزل گو، 237
ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے — ہزار رنگ۔423
نہ جانے کتنی شمعیں گل ہوئیں کتنے بجھے تارے — جوئے شیر،ص358
تب اک خورشید اتراتا ہوا بالائے بام آیا

۱/۱ اکتوبر ۱۹۰۱ء کو محلّہ رانی کٹرہ ،لکھنو میں پیدا ہوئے۔اپنے بارے میں ماہنامہ نگار خود نوشت نمبر ۱۹۴۱ میں لکھتے ہیں: ''تعلیم ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۷ء تک گورمنٹ جوبلی ہائی اسکول،لکھنؤ میں ہوئی۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۵ء تک کنگ کالج سے بی۔اے،ایم۔اے اور ایل ایل بی کیا۔ اور وکالت شروع کی۔اردو اور فارسی مولانا محمد برکت اللہ صاحب رضا مرحوم،فرنگی محل سے پڑھی۔شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں ہوئے۔ اردو نظموں کو انگریزی میں بھی ترجمہ کیا ہے۔ یادداشت بہت اچھی تھی۔'' وہ خود اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ مجھے میری سبھی نظمیں یاد ہیں۔I.C.S کا امتحان دیا تھا۔مگر اردو شاعروں کے بارے میں ایک الگ زاویہ سے سوچنے کی وجہ سے ناکام رہے۔

جوئے شیر، آنند نرائن مُلّا، دسمبر ۱۹۴۹ء، مومن لائبریری، ۱۱۰

دواكر راهى

وقارِ خونِ شہیدانِ کربلا کی قسم
یزید مورچیتا چہ ہے جنگ ہارا ہے — چراغ منزل، ص ۸۲

اب اتنی بھی میّسر نہیں میخانے میں
جتنی ہم چھوڑ دیا کرتے تھے پیمانے میں چراغ منزل،ص۴۲

رگھبیر سرن دواکر راہی امروہہ میں پیدا ہوئے۔مگر رامپور میں سکونت اختیار کی۔ان کی شاعری کے تعلق سے محشر عنایتی، مفتون کوٹوی ،ڈاکٹر احمد لاری، مخمور سعیدی اور کئی مستند ناقدین اور مبصرین کے تبصروں اور تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب ''ہم سخن فہم ہیں'' بھی شائع ہو چکی ہے۔ایک مجموعہ ''چراغ منزل کی طرف'' شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ کلام 'چراغِ منزل' ۱۹۸۱ء میں رامپور سے شائع ہوا۔ دواکر راہی کو پرانی باتوں کو نئے ڈھنگ سے کہنے کا سلیقہ آتا ہے۔ان کے کئی اشعار مشہور ہو کے دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

چراغ منزل، بزم اردو ادب ۱۹۸۱ء، مومن لائبریری H90

آنند نرائن مُلّا

وہ کون ہے جنہیں توبہ کی مل گئی فرصت جدید غزل گو، 237
ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے ہزار رنگ۔423

نہ جانے کتنی شمعیں گل ہوئیں کتنے بجھے تارے جوئے شیر ص358
تب اک خورشید اتراتا ہوا بالائے بام آیا

۱/۱ کتوبر ۱۹۰۱ء کو محلّہ رانی کٹرہ، لکھنو میں پیدا ہوئے۔اپنے بارے میں ماہنامہ نگار خود نوشت نمبر ۱۹۴۱ء میں لکھتے ہیں: ''تعلیم ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۷ء تک گورمنٹ جوبلی ہائی اسکول، لکھنؤ میں ہوئی۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۵ء تک کنگ کالج سے بی۔اے، ایم۔اے اور ایل ایل بی کیا۔ اور وکالت شروع کی۔اردو اور فارسی مولانا محمد برکت اللہ صاحب رضا مرحوم، فرنگی محل سے پڑھی۔شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں ہوئے۔ اردو نظموں کو انگریزی میں بھی ترجمہ کیا ہے۔ یادداشت بہت اچھی تھی۔'' وہ خود اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ مجھے میری سبھی نظمیں یاد ہیں۔I.C.S کا امتحان دیا تھا۔مگر اردو شاعروں کے بارے میں ایک الگ زاویہ سے سوچنے کی وجہ سے ناکام رہے۔

جوئے شیر، آنند نرائن مُلّا، دسمبر ۱۹۴۹ء، مومن لائبریری، ۱۱۰

سیّد غلام محمد مستؔ کلکتوی

سرخرو ہوتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد شعرائے بنگالہ، ص۵۱۹، ۵۱۸
رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد

حقیقت چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے شعرائے بنگالہ، ص۵۱۹، ۵۱۸
کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے

مٹادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے شعرائے بنگالہ، ص۵۱۹، ۵۱۸
کہ دانہ خاک میں مل کر گلِ گلزار ہوتا ہے

آپ کلکتہ کے بڑے کہنہ مشق اور خوش فکر شاعر تھے۔ مستؔ حالیؔ کے شاگرد تھے۔ آپ کے شاگردوں میں عبد المنان صبر، محمد شفیع ارماں، محمد فخر الدین فرد اور محمد جان وحشی کے نام آتے ہیں۔ مست کا ذکر کسی تذکرہ میں نہیں ہے نہ ہی ان کے بارے کسی نے کوئی تحقیق کی ہے۔ اب کے بارے میں جاننے کیلئے میں نے کئی علم و ادب کے شیدائیوں کو خط لکھا۔ آخر میں اپنے بزرگوار ڈاکٹر مظفر حنفی سے پوچھا تو انہوں نے شعراء بنگالہ حصہ اوّل، صفحہ نمبر ۵۱۷ سے ۵۲۰ کی زیروکس بھجوائی جس کی روشنی میں مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

شعرائے بنگالہ میں مستؔ پر مندرجہ بالا مضمون شیخ نور الاسلام کا لکھا ہوا ہے: مستؔ ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ مست کلکتوی، وحشت کلکتوی کے ہمعصروں میں تھے۔ مگر انہوں نے بہت کم عمر پائی۔ مست کے آباء و اجداد ایران سے ہندوستان آ کر بس گئے۔ مست اپنے والد کے ساتھ کلکتہ آئے۔ مدرسہ عالیہ میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۵/سال کی عمر میں انگریزی تعلیم کے لئے داخل کئے گئے۔ مگر غریبی کی وجہ سے مدرسہ چھوڑ دینا پڑا۔ غربت میں زندگی گذاری، نام و نمود کا بھی چسکا نہیں تھا۔ ان کی روزی روٹی قوالوں کو دئے گئے اشعار کا معاوضہ، انہیں جلسوں اور میلوں میں پڑھنے کا نذرانہ اور کچھ رقم ان کے شاگردوں سے بھی ملا کرتی تھی۔ قوالوں کے خاص شاعر تھے۔ میں نے بچپن سے ہی ان کے بر محل اشعار کو درسی کتابوں اور عام لوگوں سے سنتے ہیں۔ ان کا نہ کوئی دیوان شائع ہوا اور نہ کوئی مجموعۂ کلام۔ ۱/اگست ۱۹۴۱ء کو ان کا انتقال ہوا۔

شعرائے بنگالہ، حصہ اوّل، مضمون: شیخ نور الاسلام، مملوکہ مظفر حنفی

❁❁❁

امجد حیدر آبادی

کس چیز کی کمی ہے مولیٰ تری گلی میں — یادِ رفتگان اول، ص ۱۰۲
دنیا تری گلی میں عقبیٰ تری گلی میں — اردو کے روشن مینار، ص ۲۰۵

ذرے ذرے میں ہے خدائی دیکھو
ہر بت میں شانِ کبریائی دیکھو

اعداد تمام مختلف ہیں باہم
ہر ایک میں ہے مگر اکائی دیکھو — رباعیاتِ امجد، ص ۳۴

سید امجد حسین امجدؔ ۲۹/ مارچ ۱۸۸۶ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ گود ہی میں تھے تو آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ آپ کی والدہ نے آپ کی پرورش کی۔ دکن کے مقامی شعراء میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ انہیں رباعی کا بے تاج بادشاہ کہا جاتا ہے۔ ان کی رباعی میں صوفیانہ انداز ملتا ہے۔ اخلاقی اقدار کے فروغ کیلئے انہیں نے بے شمار رباعیاں کہی ہیں۔ ان کے آباء و اجداد میں کئی صوفی بزرگ گذرے ہیں۔ اس کا بھی اثر ان پر پڑا۔ مولانا سید سلمان ندوی نے انہیں حکیم الشعراء کے خطاب سے نوازا تھا۔ ۲۹، مارچ ۱۹۶۱ کو انتقال کر گئے۔

رباعیات امجد، حامی بک ڈپو، حیدر آباد، مملوکہ نصرت

❁❁❁

قمر جلالوی

شکریہ! اے قبر تک پہنچانے والو شکریہ
اب اکیلے ہی چلے جائیں گے اس منزل سے ہم

کہا کسی سے نہ میں نے ترے فسانے کو — یادِ رفتگان (جلد دوّم)،
نہ جانے کیسے خبر ہو گئی زمانے کو — ص۱۸۴۔۱۸۳

سیّد محمد حسین شاعری کے میدان میں استاد قمر جلالوی کہلاتے تھے۔عرصے تک ہندوستان میں رہے۔استاد شاعر تھے مشاعرے میں بھی چھا جاتے تھے۔جلالی ضلع علی گڑھ کا مشہور قصبہ ہے وہیں والد سید غلام سجاد حسین علی گڑھ کے چند معتبر لوگوں میں تھے۔ان کے خاندان کے لوگ سبھی میجر تھے۔امیر مینائی کے شاگرد ہوئے۔علی گڑھ آ کر مشاعروں میں خوب چمکے۔خوب شاگرد بنائے۔بٹوارے کے بعد پاکستان آ کر بس گئے۔یہاں بھی مشاعرے میں جان ڈال دیتے تھے۔مالی حالات اچھے نہیں تھے۔صرف مشاعرے پر منحصر کرنا اس زمانے میں بڑا مشکل تھا۔

❁❁❁

مولانا ظفر علی خاں

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی — بہارستاں، ص۲۵۹
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کا

میری نمازِ جنازہ پڑھائی غیروں نے — گستاخی معاف، ص۹۴
مرے تھے جن کیلئے وہ رہے وضو کرتے — بیت بازی، ص۵۱

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن — گلشنِ بہار، ص۱۱۸
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

مولانا ظفر علی خاں ۸؍جنوری ۱۸۷۰ء کو کرم آباد (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔والد کا نام مولوی سراج الدین تھا، بی۔اے کیا۔خلافت اور کانگریس کی تحریکوں کے قائد تھے۔ان کی تحریک کا اصل مقصد تھا کہ کسی طرح کے ظلم کو برداشت نہ کیا جائے۔مولانا جوشیلی تقریر کرتے تھے۔اپنی عمر کا زیادہ تر حصّہ قادیانیوں کے خلاف بولنے اور لکھنے میں صرف کیا۔حیدر آباد کے علاوہ ان کی ساری زندگی

❁❁❁

شہیر مچھلی شہری

حفیظ جونپوری، حیات وشاعری، ص۲۸

نام سیّد محمد نوح، شہیر مچھلی شہری ۱۸۵۶ء میں جونپور میں پیدا ہوئے۔محلّہ سیّد واڑہ، مچھلی شہران کے آباءاجداد نیشاپور سے آئے تھے۔

آگرے میں سلیس سے اصلاح لی۔ بعد میں منیر شکوہ بادی کے شاگرد ہوئے۔آپ کے تلامذہ میں پنڈت جگموہن ناتھ شوق، سروشؔ وغیرہ تھے۔ سروش نے ۹۳۵ء میں آپ کا دیوان 'خیابانِ ترنم' کے نام سے شائع کیا تھا۔امیر مینائی بھی شہید کو نامور شعراء میں گنتے تھے۔ حفیظ جونپوری کے ہمعصروں میں تھے۔ ان کے دو دیوان چوری ہو گئے۔۹۳۵ء میں اک دیوان 'خیابان ترنم' شائع ہوا۔ ان کے ایک شاگرد سروش مچھلی شہری نے شائع کیا تھا۔طفیل احمد انصاری لکھتے ہیں: ۱۶رفروری ۹۹۱ء کو شہیر کا مذکورہ شعر ہفت روزہ 'بلٹز' کے آخری صفحے پر تصویر کے ساتھ شائع ہوا۔۹۲۹ء میں انتقال کر گئے۔

❁❁❁

صفی لکھنوی

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا — جدید غزل گو،ص۲۹۴
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

اسلام کی فطرت نے قدرت نے لچک دی ہے — تاریخ ادب اردو،ص۴۲۴
اتنا ہی وہ ابھرے گا جتنا کے دبا دیں گے

جنازہ روک کر میرا وہ اس انداز سے بولے
گلی ہم نے کہی تھی تم تو دنیا چھوڑ جاتے ہو — شہکار شعری،ص۱۰۳

سیّد علی تقی زیدی ۳رجنوری ۸۶۲ء محلّہ مولوی گنج، لکھنو میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سیّد فضل حسنین تھا۔عربی، فارسی مولوی نجم الدین کاکوروی اور شیخ حافظ علی ہروی سے سیکھی۔ صفی ایک باشعور اور فطری شاعر تھے۔ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔آپ کے شاگردوں میں مرزا ہادی، رسوا، اثر لکھنوی اور عزیز لکھنوی کا نام آتا ہے۔آپ کو کئی اعزازات سے نوازا گیا۔ان میں ''لسان القوم'' کا اعزاز خاص ہے۔ سرکاری ملازمت کی۔محکمۂ دیوانی کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔۱۵رجون ۹۵۰ء کو انتقال ہوا۔

❁❁❁

حیرت الٰہ آبادی

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں — خمخانۂ جاوید(۲)،ص۵۴۶
سامان سو برس کا ہیں کل کی خبر نہیں — جواہر سخن(۳)،۱۸۴

نہ تو کچھ فکر میں حاصل ہے نہ تدبیر میں ہے — جواہر سخن(۳)،۱۸۸
وہی ہوتا ہے جو انسان کی تقدیر میں ہے

ہزاروں آفتوں میں بھی خدا کو یاد کرتے ہیں — جواہر سخن(۳)،۱۸۳
فرشتوں سے نہیں ہوتا جو آدم زاد کرتے ہیں

پورا نام محمد جان خان، والد کا نام بایزید تھا۔ الہٰ آباد کے گمنام شاعر ہیں۔ ان کی پیدائش الہ آباد ان کے استاد وحید الہٰ آبادی تھے۔ وہ اکبر الہٰ آبادی کے استاد بھائی تھے۔ انہوں نے اعظم سے بھی اصلاح لی جو آتش کے شاگرد تھے۔ ۱۲۹۶ھ میں دیوان اور ۱۳۱۰ھ میں کلیات شائع کروایا۔ ۱۸۷۵ء کے قریب انتقال فرمایا۔

جواہر سخن، مولوی محمد مبین کیفی، چریا کوٹی، ہندوستانی اکیڈمی، ۱۹۳۹ء، انجمن اسلام 13420

❁❁❁

شاہد صدیقی

ایک پل کے روکنے سے دور ہو گئی منزل
صرف ہم نہیں چلتے راستے بھی چلتے ہیں

عبدالمتین شاہد صدیقی اکتوبر ۱۹۱۱ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام بشارت اللہ تھا۔ جن کا انتقال شاہد کے بچپن میں ہو گیا۔ عربی، فارسی اردو کی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ ہائی اسکول پاس کر کے تلاش رزق میں حیدر آباد آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ مختلف اخباروں میں کام کیا۔ ان کو اُردو زبان سے خاص دلچسپی تھی۔ آگرہ میں اکبر آبادی سے اصلاحی تعلیم لی۔ حیدر آباد آ کر معظم جاہ کی وجہ سے ہر بڑے مشاعرے میں بلائے جاتے تھے۔ شاعری میں پختگی آئی تو لوگ خود کھینچے چلے آئے۔ ہندوستان کے کونے کونے کے مشاعروں میں بلائے جانے لگے۔ اچھے لفظوں اور اچھی نغمت کے ساتھ غزل پیش کرتے تھے۔

اپنی قلندرانہ طبعت کی وجہ سے کوئی ایک راستہ نہیں چنا۔ جس فیلڈ سے بھی جڑے، پروڈی بھی کی۔ اداریہ لکھے جنہیں ایک جگہ اکھٹا کئے جائیں تو حیدر آباد کی سیاسی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ ۲۱ جولائی ۱۹۶۲ء کی رات اردو غزل کا ایک سپاہی اس دنیا سے رخصت ہوا۔

❁❁❁

شعری بھوپالی

چھوٹا سلام ترک ملاقات ہوگئی
جو غیر چاہتے تھے وہی بات ہوگئی

شہکار غزلیں ص۔۱۱۸

ہم[1] سے اور ان سے ترکِ ملاقات ہوگئی
دنیا جو چاہتی تھی وہی بات ہوگئی

آتش دل ص۹۴

نام محمد اصغر شعری بھوپالی تھا ۱۹۰۲ء میں اپنی تعلیم کے لئے دلی آئے۔ یہاں ذکی وارثی کے شاگرد ہوئے۔ اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ پہلے ان کا تخلص اصغر تھا۔ ملّا رموزی کے مشورے سے اپنا تخلص شعری رکھا۔ پہلا شعری مجموعہ ''صبحِ غزل'' شائع ہوا۔ ابھی ان کا بہت سارا کلام شائع ہونے سے رہ گیا۔ پانچ شعری مجموعے الگ الگ نام سے ان کے صاحبزادے کے پاس محفوظ ہیں۔ مائل نقوی ملّا رموزی

اور جگر سے اصلاح لی۔

۱۹۳۶ء میں طیبہ کالج دلّی میں داخلہ لیا۔لیکن ۔۔سال کی تعلیم کے بعد دیش بھگت کالج آگرہ سے طب کی ڈگری لی۔محکمہ پولس اور زراعت میں کچھ دن نوکری کی ۔ان کو مختلف ایوارڈ ملے جن میں میونسپل کارپوریشن کا ایوارڈ ملا۔تاج الشعراء، کا خطاب' مدھیہ پردیش ,اردو اکاڈمی کا ایوارڈ اور مدھوبن ایوارڈ۔شعری بھوپالی بہت کم عمری میں ہی مشاعرے میں پڑھنے لگے۔ان کا ایک مخصوص ترنم تھا۔ان کے شعر کی کیفیت بھی کچھ الگ تھلگ تھی جس کی وجہ سے وہ مشاعرے میں چھا جاتے تھے۔ابتداء میں ان کے استاد ذکی وارثی تھے۔مگر جگر کی صحبت سے انہوں نے بہت فیض اٹھایا۔

بھوپال کے عارف عزیز صاحب کی قادرالکلامی کے بارے میں ایک واقعہ درج کیا ہے۔

ایک بار جب وہ دلّی گئے تو جوہر قریشی کے ساتھ ٹھہرے۔وہاں ایک مصرع طرح پر مشاعرہ ہونے والا تھا۔جوہر اور عرشی نے غزلیں کہیں' جوہر نے عرشی کی کہی ہوئی غزل نکال لی' جوہر نے وہ غزل مشاعرے میں پڑھ بھی دی۔عرشی چونکے۔ایسی حالت میں وہ قریب کے پاخانے میں بیٹھ کر دوسری غزل کہی اور اپنی باری آنے پر وہ غزل سنائی' لوگوں نے کافی سراہا اور داد بھی پائی۔

❀❀❀

شہاب جعفری

چلے تو پاؤں کے نیچے کچل گئی کوئی شے
نشے کی جھونک میں دیکھا نہیں کہ دنیا ہے (جدید اردو غزلیں)

تو ادھر ادھر کی نہ بات کر یہ بتا کہ قافلے کیوں لٹے
تری[1] رہبری کا سوال ہے ہمیں راہزن سے غرض نہیں (سورج کا شہر ص ۱۸۸)

سید وقار احمد شہاب جعفری دلھی پور (بنارس) میں ۲/جون ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے ۔ایم اے کرنے کے بعد خالصہ کالج ، دہلی میں اردو کے استاد ہوئے ۔انہوں نے ادب کی تمام صنفوں پر طبع آزمائی کی ہے ۔ڈرامے لکھے اور ڈرامے میں کام بھی کیا تھا۔شعری مجموعہ سورج کا شہر شائع ہوا اور بڑا مقبول ہوا۔اشعار سے استای جھلکتی ہے۔ ارفروری ۲۰۰۰ء کو دہلی میں دنیا سے رخصت ہوئے ۔ بلوا گھاٹ ,جون پور یوپی میں ہوئی۔ جہاں ان کے والد ملازم تھے۔

وینکٹیشور یونیورسٹی میں لکچرر کے عہدے پر فائز ہوئے ۔سید وقار احمد شہاب جعفری دلھی پور (بنارس) میں ۲/جون ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے ۔ایم ۔اے کرنے کے بعد خالعہ کالج ,دلی میں اردو کے استاد ہوئے ۔انہوں نے ادب کی تمام صنفوں پر طبع آزمائی کی ہے۔ڈرامے لکھے اور ڈرامے میں کام بھی کیا تھا۔شعر مجموعہ ''سورج کا شہر'' شائع ہوا اور بڑا مقبول ہوا۔اشعار سے استادی جھلکتی ہے۔

آرزو یہ ہے کہ اس طرح سے دن رات کٹے
جتنی باقی ہے مری عمر ترے ساتھ کٹے (تذکرہ شورش ص۔۲۶۲)

خواجہ عاصم خاں خواجہ محمدی خاں کے صاحبزادے تھے۔ شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے۔ شورش کے تذکرے کے وقت موتیہاری (بہار) میں سکونت اختیار کی تھی اور شاہ رکن الدین کے شاگرد تھے۔

نواب صادق علی خان اور نواب میر قاسم خاں ان کے رفقا میں سے تھے۔ کسی وجہ سے نا اتفاقی ہوئی تو راجہ شتاب رائے۔ عظیم آباد چلے گئے۔ وہاں شاہ گھسیٹا کے شاگرد ہو گئے۔

❁❁❁

شورش کاشمیری

یہ موسم سہانا فضا بھیگی بھیگی
بڑا لطف آتا اگر تم بھی آتے
گلستاں ہزار ص۔ ۱۲۸

۱۴/اگست ۱۹۱۴ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ آغا عبدالکریم شورش کاشمیری کا لاہور کے ایک غریب خاندان سے تعلق تھا۔ بچپن میں ایک دوکان میں کام کرتا تھا۔ جو اس کے دادا کی تھی۔ اس عمر میں احسان دانش نے اسے پڑھایا تھا۔ احسان دانش کے مطابق شورشؔ کا تخلص الفت تھا۔ احسان دانش کے مشورے پر اس نے شورشؔ کر دیا۔ ابتداء میں چند لوگوں کے ساتھ رہ کر تقریریں کرنا شروع کیں۔ عطاء اللہ شاہ بخاری اور ظفر علی خاں کی صحبت میں رہ کر سیاسی تربیت حاصل کی۔ جیل بھی گئے اور بعد میں ہفتہ وار ''چٹان'' نکالا۔ وہ پاکستان کے صحافی میں پہچانا جانے لگا۔ لیکن شاعری میں احسان دانش سے ہی مشورہ کرتا تھا۔ اس کی شعلہ نوائی اور حق گوئی نے اسے کئی بار جیل بھیجا۔ اس کے اندر لاابالی پن حد سے زیادہ تھا۔ جو کہہ دیا کہ دیا۔ وہ غریبوں کا ہمنوا تھا اور اس کی عملاً مدد کرتے تھے۔ مزاج بدلا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ سیاست میں نہ جاتے تو کچھ اور کام کرتے۔

❁❁❁

علامہ شبلی نعمانی

تیس دن کے لئے ترک مے وساقی کرلوں
واعظ سادہ کو روزوں میں تو راضی کرلوں
(خمخانہ جاوید (۴) شہکار غزلیں، ۸۵)

شبلی نعمانی ۴، جون ۱۸۵۷ء کو موضع بندول، اعظم گڈھ یو پی میں پیدا ہوئے، آپ راجپوت ذات سے تعلق رکھتے تھے اور راؤ تار کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ شبلی نعمانی ان جدید عالموں میں تھے جنہوں نے سرسید کا ساتھ دیا۔ اختلافات ترک کئے۔ وہ بھی سرسید کی طرح یوروپ کے تمام علوم کے ساتھ دینی تعلیم دینا چاہتے تھے۔

شبلی نعمانی سے قبل بھی علماء فارسی پڑھ کر وکالت کا امتحان دیتے تھے اور وکیل بن جاتے تھے۔ مولانا نے اپنے استاد کی طرح عربی اور فارسی میں مہارت حاصل کی اور وکالت کا امتحان دیا' پہلی بار تو نہیں دوسری بار پاس ہو گئے اور وکالت بھی شروع کر دی۔ ان کا ایک واقعہ جو انہوں نے خود بیان کیا تھا جس سے پتہ چلتا ہے کہ وکالت کے داؤ پیچ سے واقف ہونے کے بعد بھی وہ اس پر عمل نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے وکالت چھوڑ دی۔

آپ کی تقریباً ۳۳ رتصانیف شائع ہو چکی ہیں ان میں شعرالعجم، الفاروق اور سیرت النبی خاص ہیں۔ان تمام کتابوں کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ عملی کام میں ۱۸۸۳ء میں شبلی کالج قائم کیا۔آخری وقت میں پیر میں گولی لگنے کی وجہ سے ۱۸ رنومبر ۱۹۱۴ء کو شہر اعظم گڑھ میں موت آئی۔

❁❁❁

شرر

گئے دونوں جہان کے کام سے ہم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے
نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے (گلشن بے خار ص ۲۱۴)

میر صادق علی شرر لکھنو کے رہنے والے تھے۔دنیا سے کوئی سروکار نہیں تھا۔اس سے زیادہ کسی تذکرے میں ذکر نہیں ہے۔

❁❁❁

شیدا

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں شعرائے اردو۔ص ۱۰۰

دلہن بیگم

اتنے کم ظرف نہیں ہم جو بہکتے جاویں
مثل گل جاویں جدھر جاویں مہکتے جاویں مجموعہ نغز ص ۱۲۷۵۔ گل کی مانند جدھر جائیں مہکتے۔ ا

دن کٹا فریاد میں اور رات زاری میں کٹی
عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری میں کٹی گلہائے پریشاں ص ۲۱۹

نواب آصف الدولہ کی چہیتی بیگم، نواب بہو کے نام سے مشہور تھیں، انکا اصل نام صبیہ رضیہ تھا، پاکباز اور پرہیزگار خاتون تھیں سلیم الطبع بہترین شاعرہ تھیں۔اکثر اپنے محل میں شعری محفلیں منعقد کرواتی تھیں۔نواب صاحب بھی شاعر تھے انہوں نے پہلے اسی زمین میں ایک غزل دلہن کو سنائی، اسکے ایک شعر، ساقیا مے سے جھکا دے کہ بہکتے جاویں۔برق کی طرح جاویں لپکتے جاویں کے جواب میں مذکورہ شعر کہا تھا۔

❁❁❁

چندو لال شاداں

سب ہوئے محو اسے دیکھ جدھر سے نکلا
تھے تعجب میں کہ یہ چاند کدھر سے نکلا ہندوؤں میں اردو ص ۱۵۸

چندو لال شاداں کے جد امجد کھتری تھے اور لاہور کے رہنے والے تھے لیکن دلی میں آ کے بس گئے۔اسی خاندان کے اکبر بادشاہ

کے نورتنوں میں ایک ٹوڈرمل بھی تھے آصف جاہ جب دکن آئے تو اس خاندان کے ایک شخص کو اپنے ساتھ لے آئے ان میں ہی چندولال بھی تھے۔ چندولال دکن کی سرکار کے وزیراعظم بنے۔ بڑی شان سے زندگی گزاری اور لکھنؤ کے کئی شعرا کو بلا کر ان کی کفالت کی۔ بہترین منتظمین میں ان کا نام آتا تھا۔ اپنے دربار میں ہر روز مشاعرے اور مذاکرے کرواتے تھے وہ بڑے مخیر بھی تھے

ہندوؤں میں اردو واز رفیق مارہروی بدایونی

❁❁❁

شاعر لکھنوی

سکھا رہے ہیں وہ آداب میکشی ہم کو

جو میکدے میں چھلکتے رہے سبو کی طرح (شعرستان ۴۳۰، جدید غزل گو ص ۱۷۲)

حسن پاشا شاعر لکھنوی ۱۶ر نومبر ۱۹۱۷ء کو امیٹھی، یوپی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام منظور احمد صدیقی تھا۔ مشہور عالم دین مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی نے ان کی ادبی پرورش کی۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ زخم ہنر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۵۱ء سے پاکستان میں سکونت اختیار کرلی وہیں ریڈیو پاکستان میں ملازمت کی۔ ریڈیو پر ''یہ پاکستان ہمارا ہے'' کے عنوان سے ایک فیچر پڑھا کرتے تھے اور اسی محکمے میں ملازمت بھی کی۔ ''زخمِ ہنر'' ۱۹۷۹ء میں ان کا شاعری مجموعہ پاکستان سے شائع ہوا۔ غزل کے دلدادہ تھے۔ وہ غزلیں کہنا پسند کرتے تھے۔ مگر اوٹ پٹانگ جدیدیت سے انہوں نے انحراف کیا ہے۔ ان کی شاعری میں لکھنوی شاعری کا کوئی اثر نہیں ملا۔ ہر بڑے شاعر کی طرح ان پر بھی الزام ہے کہ وہ بڑے انا پسند تھے مگر ایسا نہیں تھا۔ جو لوگ ان سے قریب تھے انہوں نے اس بات کی نفی کی ہے۔ مجاز، یاس وغیرہ کے ساتھ رہ کر بھی ان پر ان کا اثر نہیں ہے۔ ہندوستان کی طرح پاکستان میں بھی مشاعرے اور رسالوں کی زینت بنتے رہے۔ ۲۳ر جولائی ۱۹۷۹ء کو موت آئی۔

❁❁❁

شاعر جمالی

تم آسماں کی بلندی سے جلد لوٹ آنا

ہمیں زمیں کے مسائل پہ بات کرنی ہے صحیفہ ص ۱۲

سید نذر الحسنین شاعر جمالی نان پارہ بہرائچ ۱۹۴۳ء میں پیدا ہوئے۔ حکومت کے میڈیکل آفیسر تھے۔ ان کی آخری پوسٹنگ جونپور میں ہوئی۔ ۲۰۰۰ء میں سبکدوش ہوئے اور بہرائچ اپنے گاؤں میں رہنے لگے۔

آپ کا کلام رسالوں اور اخباروں میں خوب چھپتا تھا۔ اپنے عام فہم شعر کی وجہ سے مشاعرے میں بھی داد حاصل کرتے رہے۔ پروفیسر طاہر محمود ان کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ ان کے شعری مجموعے کرب (۱۹۷۸ء) غزلوں کا مجموعہ صحیفہ (۱۹۸۲ء) اور تیسرا شعری مجموعہ (۱۹۹۷ء) شائع ہو چکے تھے۔

۱۹/اکتوبر ۲۰۰۸ء کو رات ۱۰/بجے آبائی وطن نان پور سے جون پور لوٹ رہے تھے کہ راستے میں فیض آباد ریلوے اسٹیشن پر دل کا دورہ پڑا اور وہیں موت آگئی۔(مآخذ۔اردو بک ریوو)

❁❁❁

شان الحق حقّی

تم سے الفت کے تقاضے نہ نباہے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے — جدید اردو غزل ص۔۱۰۸

رضی اختر شوق

ایک پتھر ادھر آیا ہے تو اس سوچ میں ہوں
میری اس شہر میں کس کس سے شناسائی ہے — جدید اردو غزل ص۔۹۲

ہم روحِ سفر ہیں ہمیں ناموں سے نہ پہچان
کل اور کسی نام سے آجائیں گے ہم لوگ — جدید اردو غزل ص۔۹۲

خواجہ رضی الحسن انصاری ۲۳/اپریل ۱۹۳۳ء کو سہارنپور میں پیدا ہوئے۔حیدرآباد دکن میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔اے کیا۔ایم۔اے کراچی یونیورسٹی سے کیا۔ریڈیو اسٹیشن سے ملازمت کی شروعات کی۔تحت میں پڑھتے تھے۔اس طرح کے اشعار نے جدید شاعری کو عوام میں مقبول کیا ہے۔ایسے اشعار پاکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور یہاں کے لوگوں کی زبان پر برمحل ہو گئے۔

بات کو سادہ ہے مگر اسی شعر میں اس ڈھنگ سے کیا گیا ہے کہ لوگ داد دئے بغیر نہیں رہ سکتے اور یہ ہندوستان پاکستان دونوں جگہ مشہور ہوا اور اس کے چرچے بھی خوب ہوئے۔دل کی بیماری کی وجہ سے پریشان رہتے تھے۔آخر کار ۲۲/جنوری ۱۹۹۹ء کو دنیا سے رخصت ہوئے۔۱۹۹۹ میں دنیا چھوڑی۔

❁❁❁

نریش کمار شاد

لوگ لوگوں کا خون پیتے ہیں
ہم نے تو صرف مے کشی کی ہے — بت کدہ۔۸۳۔شعری انتخاب ص۔۱۰۴

لوگ جن حادثوں سے مرتے ہیں
مجھ کو ان حادثوں نے پالا ہے — شعری انتخاب ص۔۱۰۴

نریش کمار شاد کی پیدائش ۱۱؍دسمبر ۱۹۲۷ء کو یحیٰ پور، ضلع ہوشیار پور (مشرقی پاکستان) میں ایک شاعر اور صحافی نوہر یارام درد کے گھر میں ہوئی۔ والد صاحب پنجاب کے ایک بڑے اخبار ''ہند سماچار'' کی ادارت میں شامل تھے۔ حق گوئی اور بے باکی شاد کو اپنے والد سے ورثہ میں ملی۔ اسی وجہ سے دنیا میں ترقی نہیں ہوئی۔

شاؔد نے فلمی رسالے' شالیمار کی ادارت کی، سرکاری ملازمت بھی کی لیکن شراب نوشی کی عادت کی وجہ سے بڑی لا پرواہی کرتے رہے۔ یہ ملازمت ان کو کنور مہندر سنگھ سحر کی وجہ سے ملی تھی۔ مشاعرے میں خوب بلائے جاتے تھے۔

نریش کمار شاد برجستہ جملے کسنے میں کمال حاصل تھا۔ بہت جلد لوگوں سے گھل مل جاتے تھے۔ شاد نے چند غزلیں جوشؔ ملیح آبادی سے بھی دکھائی ہیں۔ شاد ترقی پسند نام کے نہیں تھے۔ عملاً ترقی پسندی ان کے اندر تھی۔ اپنے ابتدائی ایام میں ایک بار فکر تونسوی نے اپنی بات کی کہ وہ کیسے گھر جائیں بچوں کے کھانے کیلئے کچھ نہیں ہے۔ تو شاد فوراً سامنے کی ہوٹل میں گئے۔ ایک صاحب جوان کی مدد سے رسالہ نکالنا چاہتے تھے۔ ان سے پیشگی رقم سوا نو روپے لئے اور فکر کو دے دیا اور کہا سیدھے گھر جاؤ اور بچوں کو دو (من موہن تلخ)

حالانکہ شاد کے بھی گھریلو حالات اچھے نہیں تھے۔ روپے پیسے کی ضرورت انہیں بھی تھی۔

۲۰؍مئی ۱۹۶۹ء کو دلّی میں جمنا کے کنارے ان کی لاش ملی۔

❁❁❁

شہزاد احمد

اب تو انسان کی عظمت بھی کوئی چیز نہیں
لوگ پتھر کو خدا مان لیا کرتے تھے (شاعری 1940 تک، ص:۹۹)

شہزاد احمد امرتسر (پنجاب) 16/اپریل 1932ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حافظ بشیر احمد تھے۔ سرکاری کالج لاہور سے بی.اے. اور ایم.اے. کیا۔ ۲۸ سال کی عمر میں ہی پہلا مجموعہ آ گیا۔ بڑی جلدی کی اس لیے کئی ناقدوں نے اسے اچھا نہیں سمجھا۔ دوسرا مجموعہ ''جلتی بجھتی آنکھیں'' پر پاکستان کا بڑا ایوارڈ ''آدم'' ملا۔ کئی اور ایوارڈ بھی ملے۔ چونکہ انھوں نے فلاسفی سے ایم.اے. کیا تھا، اس لیے نفسیات پر بہت عبور تھا۔ ابتدا سے ہی اس موضوع پر مضامین لکھتے رہے اور لوگوں میں ان کی اہمیت بڑھتی رہی۔ نثری نظموں میں بھی کافی نام کمایا۔ ۳۰ سے زیادہ کتابیں تحریر کی تھیں۔ ترجمے کا کام بھی کیا۔ 2/اگست 2012 کو لاہور میں انتقال ہوا۔

اردو غزل 1940 تک، خدا بخش لائبریری 1995ء

❁❁❁

شوقؔ قدوائی

جس طرف کی تان سنئے، اک نرالا راگ ہے
شوق اپنی اپنی ڈفلی، اپنا اپنا راگ ہے (ش.ح لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، ص:۶۶۳)

❁❁❁

میر سوزؔ

اہل ایمان سوز کو کہتے ہیں کافر ہوگیا
آہ یا رب رازِ دل ان پر بھی ظاہر ہوگیا
گلشن ہندص۔۱۱۶۔جواہرِ سخن (۲) ص۔۴۵۶

قاضی ہزار طرح کے قضیوں میں آسکا
لیکن نہ حسن و عشق کا جھگڑا چکا سکا
گلشن ہنرص۔۱۱۸۔جواہرِ سخن (۲) ص۔۴۵۷

بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی
بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر ہوئے

دعوی بڑا ہے سوزؔ کا اپنے کلام پر
جو غور کیجئے تو ہے کوڑی کے کام کا
شعراء کے تذکرے ص۔۳۸۲

رستم رہا زمیں پہ نہ ہی سام رہ گیا
مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا
شعراء کے تذکرے ص۔۳۸۵

کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند
جو گنہ کیجئے ثواب ہے آج
مجموعہ نغزص۔۳۲۲۔جواہرِ سخن (۲) ص۔۴۶۱

اگر میں جانتا ہے عشق میں دہڑ کا جدائی کا
تو محشر تک نہ لیتا نام ہرگز آشنائی کا
بیاض سخن ص۔۲۰۳

❁❁❁

سرشار سیلانی

چمن میں اختلاط رنگ و بو سے بات بنتی ہے
ہمی ہم ہیں تو کیا ہم ہیں، تمی تم ہو تو کیا تم ہو
(نایاب ہیں ہم ص۹۶)

پنڈت بھیم سین شرشار سیلانی ساہنے وال، ضلع لدھیانہ میں ۱۲/ مارچ ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے۔ آوارہ سلطانپوری اپنی کتاب ''نایاب ہیں ہم''، میں لکھتے ہیں کہ ''فلمی کاریگر سرشار کو پلاتے رہے اور لکھاتے رہے۔ سرشار پیتے رہے اور لکھتے رہے۔''

۱۹۴۷ء سے فلموں میں نغمے لکھتے رہے۔ فلم آرسی کے گیارہ گانے لکھے۔ پرانی فلموں میں گانے ۱۰؍ سے کم نہیں ہوتے تھے۔ فلموں کے نغموں کی وجہ سے لوگ فلم دیکھنے جاتے تھے۔ انہوں نے ۳۲؍ فلموں میں ۱۶۸؍ گیت لکھے۔ سرشار نے فلموں میں ڈائیلاگ بھی لکھے۔ ''برسات کی رات'' ''آئے دن بہار کے'' آئی جوملن کی بہار'' گنگا کی لہر میں'' وغیرہ ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں'' آرسی''، فلم میں کام بھی کیا تھا۔

۵۵؍ سال کی عمر میں ۱۰؍ اپریل ۱۹۶۹ء کو انتقال ہونے کی وجہ سے بہت سی فلموں کے مکالمے لکھنے کا فائدہ انہیں نہیں ملا۔ ایسی فلمیں ریلیز ہوئیں لیکن ان سے ان کی موت کے بعد نہ انہیں شہرت ملی اور نہ دولت۔

پنڈت بھیم سین سرشار سیلانی کے بارے میں وسیم فرحت لکھتے ہیں۔

''اگست ۱۹۵۱ء میں بمبئی میں ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا جس میں شعر و ادب کی تمام ہستیاں موجود تھیں، جگر، احسان دانش، حفیظ جالندھری وغیرہ وغیرہ اس میں پنڈت بھیم سین نے ایک غزل پڑھی۔۔ کافی شاعروں نے

❁❁❁

دل عظیم آبادی

تمہارے در پہ جو درباں نے آستیں پکڑی
برنگ نقش قدم ہم نے بھی زمیں پکڑی — مجموعہ نغز ص ۳۸۰

محمد عابد عظیم آبادی دلؔ، جسونت رائے ناگر کے بیٹوں میں تھے۔ اور جوشش عظیم آبادی کے بھائی تھے، مسلمان ہو گئے۔ دلؔ اور جوشش دونوں شاعر تھے۔ عموماً تذکرہ نگاروں نے دونوں کے اشعار ملا دئے ہیں۔ ان کے بھائی کا نام محمد

❁❁❁

ذوق

بگڑا کسی کا کچھ نھیں اے ذوق عشق میں
دونوں کی ضد نے خاک میں ہمکو ملا دیا — ریاض الفصحا ص۴

منشی آسارام ذوق عظیم آباد کے رہنے والے تھے۔ مرزا فدوی کے شاگرد اور میرزا اشرف کاشمیری کے دوست تھے۔ راسخ کے استاد بھائی تھے۔ ذوق فدوی کے شاگرد تھے۔

❁❁❁

ذکی

جو ہر تھے مجھ میں سب ملکوتی خصال کے
انساں بناکے کیوں میری مٹی خراب کی — (خمخانہ جاوید ۳؍ ۲۶۰)

خیال زلف میں کب دل کا داغ جلتا ہے

کہیں بھی کالے کے آگے چراغ جلتا ہے (خمخانہ جاوید/۳/۲۶۰)

منشی مہدی علی خاں ذکی خلف شیخ کرامت علی۔ مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ یہ لکھنو میں بس گئے ابتداء میں رامپور کے نواب کے دربار میں رہتے لکھنو آئے تو نواب غازی الدین حیدر کے دربار میں شامل ہو گئے۔ ناسخ کے شاگرد

❁❁❁

رسوا لکھنوی

تمام شہر میں رسوا ذلیل آوارہ
تمہارے چاہنے والوں کی آبرو کیا ہے (بیاض سخن ۲۱۲)

لطف ہے کون سی کہانی میں
آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی (امراؤ جان ادا۔ ۷۵)

رکھ لی مرے خدا نے گناہوں کی میرے شرم
زاہد کو اپنے زہد پہ کتنا غرور تھا (شعری ضرب المثل۔ ص ۳۸)

مرزا ہادی رسوؔا، حاجی مرزا ولی جان بیگ کے بیٹے تھے اور وہ بانس بریلی کے رہنے والے تھے۔ اسیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔

مرزا ہادی رسوؔا 1858ء میں پیدا ہوئے۔ نثری ادب میں آج بھی ان کا ایک مقام ہے۔ رڑکی یونیورسٹی جو آج انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے معتبر مانا جاتا ہے۔ اس میں انجینئرنگ کا کورس کیا۔ کیمیائی ریسرچ کرنے کا خبط سوار تھا جو جنوں کی حد تک تھا۔ لندن اور ممبئی سے اس کے لیے چیزیں منگواتے تھے اور ان پر ریسرچ کرتے تھے۔ اب یہ معلوم نہیں ہوا کہ وہ کہاں تک کامیاب تھے۔ اسی طرح آخری عمر میں علم نجوم کا چسکا لگا۔ انھوں نے اس میدان میں تو کوئی ڈگری نہیں لی مگر اردو کی تعلیم کے لیے پنجاب یونیورسٹی سے ایم. اے. کیا۔ شاعری میں دبیؔر کی آخری عمر میں ان سے اصلاح لی۔ مشہور ناول ''امراؤ جان ادا'' شہرۂ آفاق ناول لکھ کر بڑا نام کیا۔ ''مہندی'' بھی ایک ناول ہے جو مشہور نہ ہو سکی۔ اپنی ملازمت کے سلسلے میں حیدر آباد دکن گئے۔ وہاں بیمار ہوئے اور 1931ء میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔

امراؤ جان ادا، ڈاکٹر ابوالیث جاوید صدیقی، اردو اکاڈمی، پاکستان

❁❁❁

رسؔا

تم مجھ سے آ ملے کبھی دشمن سے جا ملے
جب یہ مزاج ہے تو کبھی تم سے کیا ملے (دبستانِ رام پور ص ۴۲۲)

حیات بخش رسؔا۔ عبدالرزاق قصبہ وستہ، تحصیل سکندر آباد، ضلع بلند شہر یو پی میں ۱۸۷۰ میں پیدا ہوئے۔ رامپور میں وکالت کرتے

تھے۔داغ کے شاگرد تھے مگر داغ کی وفات کے بعد مشہور ہوئے۔بڑے شعراء میں شمار ہونے لگا۔فالج کا اثر ہونے کے بعد بھی کلام میں شفتگی اور جوش پایا جاتا تھا۔دیوان بھی شائع ہوا۔

فی البدیہہ شعر کہنے میں مہارت حاصل تھا۔۴۳ سال کی عمر میں ۲۲ نومبر ۱۹۱۳ کو موت آ گئی۔(مآخذ خمخانہ جاوید۔۳۱)

❁❁❁

راز لائلپوری

مجھے دیوانہ نہ فرزانہ بنایا
جو بنانا ہی تھا تو مستانہ بنایا ہوتا

❁❁❁

راسخ عظیم آبادی

دشمنی در پردہ کی اے وائے تم نے کیا کیا
آپ تو پردے میں بیٹھے اور ہمیں رسوا کیا (گلدستہ نگاہ ص ۳۰)

شیخ غلام علی، راسخ ۱۷۵۴ء میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے اور پٹنہ شہر میں آ کر بس گئے تھے۔ان کے دادا شاہ جہاں باد کے رہنے والے تھے۔ابتداء میں میرؔ سے اصلاح لی۔عظیم آباد میں فدوی کے شاگرد ہوئے۔کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ وہ تصوف کی راہ پر تھے۔شعر میرؔ جیسا کہتے تھے۔وہی سادگی، وہی تصوف وہی شکوہ، ان کا دیوان مطبوعہ ہے کلیات بخط شاعر۔خدا بخش لائبریری میں موجود ہے۔ان کے حالات پر کئی مقالے لکھے گئے ہیں۔ڈاکٹر لطف الرحمٰن نے پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ لکھا تھا مگر وہ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔کیوں؟ شاید لطف الرحمٰن صاحب ہی جانتے ہونگے۔راسخ کا انتقال ۱۸۲۳ء میں پٹنہ میں ہوا۔

گلدستہ نگاہ' ڈاکٹر شرف الدین ساحل' ناگپور ۲۰۱۱ء

❁❁❁

راقم لکھنوی

ہم تو ساحل سے چلے پیاس کا تحفہ لے کر
اب زمانہ ہمیں ڈھونڈا کرے دریا لے کر (شعرائے بنگالہ ص ۳۵۲)

مجید الحسن راقم والد کا نام محمد عباس ہے۔۲۶ ر نومبر ۱۹۳۱ء کو کانپور (یو پی) میں پیدا ہوئے۔محمود نگر اسکول میں

❁❁❁

راحت اندوری

میں پربتوں سے لڑتا رہا اور چند لوگ
گیلی زمین کھود کے فرہاد ہوگئے (خ۔ا ردل پسند ص ۶۰) لمحے لمحے ص ۸۰

ہمارے سر کی پھٹی ٹوپیوں پہ طنز نہ کر

ہمارے تاج عجائب گھروں میں رکھے ہیں　　پانچواں درویش ص ا

آپ کی پیدائش ا/جنوری ۱۹۵۰ء کو اندور میں ہوئی۔آپ کے والد کا نام رفعت اللہ قریشی تھا۔اسلامیہ کالج سے بی۔اے برکت اللہ یونیورسٹی سے ام۔اے اور بھوج یونیورسٹی سے بعنوان اردو مشاعرے پی۔ایچ۔ڈی کیا۔

کالج میں لکچرر ہوکر سروس کی ابتداء کی۔مشاعرے میں شامل ہونا شروع کیا۔آج یہ حال ہے کہ اگر مشاعرہ بہت بڑے بجٹ کا ہو تو ہی آپ راحت اندوری کو بلا سکتے ہیں۔لوگ بتاتے ہیں کہ ایک مشاعرے کی فیس ۲۵/ہزار بھی لیتے ہیں۔اس پر پھر وہی بات یاد آ رہی ہے کہ جس اردو سے میرؔ اپنی روٹی بھی نہ کھا سکے۔اسی اردو سے راحت جیسے مشاعرے کے شاعر مالا مال ہوگئے۔وہ ایک پینٹر بھی ہیں یہی ان کی روزی تھی۔

پیارے صاحب رشید

زندگی کہتے ہیں کس کو موت کس کا نام ہے
مہر بانی آپ کی نامہربانی آپ کی　　گلستان رشید ص ۱۱۹۔خم خانہ جاوید ص ۴۳۵

ہاں ہاں تمہارے حسن کی کوئی خطا نہیں
میں حسن اتفاق سے دیوانہ ہوگیا

سید محمد مصطفٰے مرزا پیارے صاحب رشید میر انیس کے نواسے اور قدیر احمد قدیر کے شاگرد تھے۔ابتداء میں انیسؔ سے بھی اصلاح لی۔پہلے غزلیں ہی کہتے تھے اور کئی شاگردوں کی پرورشِ شعر بھی کی مگر پھر وہی خاندانی پیشہ اختیار کرلیا۔

پیارے صاحب ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم اس زمانے کے مطابق ہوئی۔شاعری میں اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چلے۔یعنی مرثیہ گوئی پر خوب دھیان دیا۔علم عروض کا بھی درس دیتے تھے۔لکھنؤ کے علاوہ پٹنہ،حیدرآباد،کلکتہ اور رامپور گئے۔تلامذہ کی کافی تعداد ہے۔زبان صاف ستھری ہو اس کا خیال کرتے تھے۔مرثیے خوب پڑھتے تھے۔مگر غزل کہنے والوں میں بھی ان کا خاص مقام تھا۔کلام میں تصنع بہت تھا۔۷۴/سال کی عمر میں ۱۹۱۸ء میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

گلستانِ رشید لکھنوی اشاعتسر فراز قومی پریس،لکھنو مملوکہ الیاس عباسی

❁❁❁

مولانا احمد رضا خاں بریلوی

مصطفٰے جان رحمت پہ لاکھوں سلام
شمع بزم ہدایت پہ لاکھوں سلام　　حدائق بخشش ص۔۱۳۱

آپ کا نام محمد تھا۔تاریخی نام المختار(۱۲۷۲ھ)جدِّ محترم حضرت مولانا رضا علی خاں علیہ الرحمہ نے احمد رضا رکھا اور اسی نام سے مشہور بھی ہوئے۔چار سال کی عمر میں ناظرہ قرآن مجید ختم کیا اور ۱۰/سال کی عمر میں ہدایت النحو کی شرح لکھی چودہ سال کی عمر میں دستار فضیلت حاصل کی۔

اسلام کے بڑے مفکروں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔امام احمد رضا کے عشق نبی کی کوئی حد نہیں تھی۔ذرہ برابر بھی گستاخی رسول انہیں برداشت نہیں تھی۔ان کی نعتیہ شاعری پر بہت کام ہوا ہے۔بہتر یہ تھا کہ ان کے سارے کلام کو اسلامی شاعری سے ہٹ کر جائزہ لیا جاتا۔

احمد رضا خاں صاحب کے ماننے والے ساری دنیا میں ہیں اور سنت کا اتباع کر رہے ہیں۔مصطفےٰ جانِ رحمت پہ

❁❁❁

رجب علی سرور

ایک آفت سے تو مرمر کے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی (خمخانہ جاوید۔ص ۴۰۸)

رجب علی سرور ۱۷۸۶ میں لکھنو میں پیدا ہوئے۔داستان گوئی میں ان کی داستان فسانہ آزاد بڑی اہمیت ہے۔اس داستان کے ہزاروں ایڈیشن شائع ہو چکے ہونگے۔یہ اپنے آپ میں ایک کمال کی بات۔ان کی کتاب آج بھی نصاب میں شامل کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب باغ و بہار کے جواب میں لکھی گئی تھی اور اس سے مقبول بھی ہوئی۔شاعری میں سرور آغا نوازش کے شاگرد تھے۔اپنے داستان کے علاوہ بھی جو شاعری انہونے کی ہے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان کی شاعری بھی بلند پایہ کی ہے۔

انکے دوستوں کی تعداد کافی تھی بڑے ملنسار بھی تھے مگر کسی کے قتل کے معاملے میں ان پر الزام عائد کیا گیا اور وہ لکھنو چھوڑ کر کانپور میں آ کر بس گیے،اس لئے ان کی جان بچ گئی۔لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔۱۸۶۹ بنارس میں انکا انتقال ہوا۔

❁❁❁

اسمٰعیل میرٹھی

بگڑتی ہے جس وقت ظالم کی نیت
نہیں کام آتی دلیل اور حجت (کلیات اسمٰعیل ص ۲۵۰)

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا
کیسی زمیں بنائی کیا آسماں بنایا (باغ جنت ۲۴۰)

آبِ رواں کے اندر مچھلی بنائی تو نے
مچھلی کے تیرنے کو آبِ رواں بنایا (باغ جنت ۲۴۰)

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی غالب کے شاگرد تھے۔۱۸۴۴ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے۔نیچرل شاعری کے دلدادہ تھے۔بظاہر تو سرسید تحریک سے وابستہ تھے مگر اس تحریک کا ان کی تخلیقات پر اثر نہیں تھا۔اسمٰعیل میرٹھی کو نیچرل شاعری اور اصلاحی شاعری کا معمار کہا گیا ہے۔انہوں نے اپنی شاعری سے معاشرے کی اصلاح کا کام کیا ہے ان کی زندگی میں ہی ۱۹۱۱ء میں ان کا کلیات شائع ہو چکا تھا۔مگر اب نایاب ہے۔

گورمنٹ نے انہیں ادبی خدمات کے صلے میں خان صاحب کا خطاب دیا۔آپ نے بچوں کے لئے خوب لکھا ہے اس لئے آپ کو

بچوں کا شاعر کہا جاتا ہے۔ یکم/نومبر ۱۹۱۷ء کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

❀❀❀

انور مرزا پوری

میں نظر سے پی رہا ہوں یہ سماں بدل نہ جائے
نہ جھکاؤ تم نگاہیں کہیں رات ڈھل نہ جائے

مجھے پھونکنے سے پہلے، مرا دل نکال لینا
یہ کسی کی ہے امانت، مرے ساتھ جل نہ جائے (لاجواب غزلیں،ص:۶۷)

انور حسین مرزا پور، یو. پی. میں پیدا ہوئے۔ نعت کے شاعر تھے اور مذہبی جلسوں میں خوب لہک لہک کر ترنم سے پڑھتے تھے۔ مذکورہ شعر کو استاد امید علی خاں نے پڑھ کر بہت مشہور کر دیا۔ مہدی حسن نے بھی اسے گایا ہے۔ انور اکثر رام پوری ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ آخری عمر میں درویشی آ گئی۔ ترنم سے غزلیں پڑھا کرتے تھے۔ بعد میں مذہبی مجلسوں میں نعت پڑھنے میں خوب نام کمایا۔ غزل کہنا چھوڑ دیا۔ لمبی داڑھی، لمبا کرتا، پاجامہ گچھا اوڑھنے لگے۔

❀❀❀

جسٹس ہمایوں

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا (شعرائے پنجاب ص ۳۶)

۲/اپریل ۱۸۶۸ء کو باغبان پورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولوی نظام الدین ایک فاضل بزرگ تھے۔ ابتدائی تعلیم باغبان پور میں ہوئی۔ انٹرنس میں پورے پنجاب میں اول آئے۔ بقیہ تعلیم کے لئے لندن گئے وہاں سے بیرسٹری کی اور عدالت میں جج ہوئے۔ اپنے کام کے دوران ہی ان کی روح قبض کر لی گی وہ ۲/جولائی ۱۹۱۸ء کا دن تھا۔

❀❀❀

ذاکر

کترا کے نکل جاتے ہو کیوں راہ میں ہم سے
عاشق ہیں تمہارے کوئی رہزن تو نہیں ہم (خمخانہ جاوید(۳)ص۔۲۳۱)

ہم نہ کہتے تھے نہ دیکھو آئینہ (علمِ مجلس(۱)۴۰)
کس لئے ششدر ہوئے کیوں تم کو سکتہ ہوگیا (خمخانہ جاوید(۳)ص۔۲۳۱۔)

مولوی محمد ذاکر شاہ پور ضلع فتح پور ہسوا میں پیدا ہوئے۔ آگرہ کی کمشنری میں سر شتہ دار رہے۔ میرزا حاتم بیگ مہر سے مشورہ کرتے

تھے۔اپنے وقت کے مشاہیر شعراء میں شمار کئے جاتے تھے۔ان کے ہم عصروں میں صفی امروہوی, بزم اکبرآبادی، ماہ لکھنوی تھے۔دیوان چھپا ہے۔فارسی میں بھی دیوان شائع ہوا۔

❁❁❁

مولانا اسلم جیراج پوری

نورِحق شمع الٰہی کو بجھا سکتا ہے کون
جس کا حامی ہو خدا اس کو مٹا سکتا ہے کون — سخنواران اعظم گڑھ ۲۸۹۔تاریخ جیراجپور ص۔۴۲

مولانا اسلم چراغ پوری ۷ا رجنوری ۱۸۸۲ء کو موضع جیراجپور، ضلع اعظم گڑھ، یو پی میں پیدا ہوئے۔مولانا کا گھرانہ مولویوں کا گھرانہ تھا۔آپ کے والد مولانا سلامت اللہ جیراجپوری تھے، جو اپنے علاقے کے مشہور و معروف علماء میں سے تھے۔بھوپال کے نواب صدیق حسین خان کی ایماء پر وہاں کے مدرسہ کے ہیڈ ہوئے۔

❁❁❁

نواب امین الدولہ لکھنوی

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے — اُردو ے ضرب المثل۔ص ۱۹۲

نواب امین الدولہ معین الملک بہادر مرزا امینڈ و نواب شجاع الدولہ کے صاحب زادے تھے۔آصف الدولہ کے بھائی تھے۔آپ اکثر دلّی میں ہی رہتے تھے۔غلام قادر روہیلہ سے قبل جب دلّی میں آرام تھا تو خوب مشاعرے کرواتے تھے۔ماٰخذ (۔۔۔۔) آبِ حیات میں صرف مذکورہ شعر درج ہے۔حامد حسین قادری نے ایک پرانی کتاب سے مذکورہ شعر کی غزل کا حوالہ دیا ہے۔اُردو کے ضرب المثل اشعار میں یہ بات درج ہے۔گردن کی کسی بیماری کی وجہ سے ۱۱ را گست ۱۹۴۳ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

❁❁❁

آغا شاعرؔ قزلباش

ابرو نہ سنوارا کرو کٹ جائے گی انگلی
نادان ہو تلوار سے کھیلا نہیں کرتے — خمخانہ جاوید ص ۴۱۶۔۔تیر نشتر ص ۷۹

دو اجازت تو کلیجے سے لگا لوں رخسار
سینک لوں چوٹ جگر انہیں انگاروں پر — خمخانہ جاوید ص ۴۱۶۔۔تیر نشتر ص ۲۴

حشر میں انصاف ہوگا بس یہی سنتے رہو

کچھ یہاں ہوتا رہا ہے کچھ وہاں ہو جائیگا (انتخاب آغا شاعرص ۱۳)

بڑے سیدھے سادے ،بڑے بھولے بھالے
کوئی دیکھے اس وقت چہرہ تمہارا (شعری انتخاب ص ۷۱ تیر نشتر ص ۱۶)

ہمیں ہیں موجدِ بابِ فصاحت حضرت شاعر
زمانہ سیکھتا ہے ہم سے ہم وہ دلی والے ہیں تیر نشتر ،ص:۵۲

آغا مظفر شاعر قزلباش کا نام آغا ظفر علی بیگ تھا۔ والد حیدر علی بیگ تھے۔۵؍مارچ ۱۸۷۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ طالب دہلوی سے اصلاح لی بعد میں داغ کے تلامذہ میں شامل ہوئے۔ بڑے زور گو تھے۔ انہیں افسر اشعراء کے خطاب سے نوازہ گیا۔ دہلی سے حیدر آباد گئے۔ وہاں مہاراجہ کشن پرساد کے درباری ہوگئے۔ وہاں سے کلکتہ گئے اور ایک ڈرامہ کی کمپنی میں نوکری کرلی۔ شاگردوں کی تعداد کافی تھی۔ لالہ سری رام کے مطابق ایک دن میں چار سو پانچ سو اشعار لکھ لیتے تھے اور مشاعروں میں اپنے شاگردوں میں بانٹ دیا کرتے تھے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ تیر ونشتر تھا۔ انہوں نے قرآن کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ کئی ناول لکھے ،مضامین کا مجموعہ شائع ہوا کئی کہانیاں بھی لکھیں۔ عمر خیام کی رباعی کا منظوم ترجمہ کیا۔ انیسؔ دہلوی' دلی والے صفحہ نمبر ۳۲۳ پر آغا شاعر قزلباش کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''بڑے لاابالی تھے کبھی دنیا سے بیزار گلے میں گیروا کفنی ڈالے ننگے سر پھرنے لگے اور کبھی جوگی پھیرے سے گھبرائے تو پھر دنیادار بن گئے۔ کسی کو شاگرد بنایا کسی کو بھگا دیا......''

ان کا پہلا شعری مجموعہ ''تیر ونشتر'' تھا۔ انہوں نے قرآن کا منظوم ترجمہ بھی کیا تھا۔ کئی ناول لکھے ،مضامین کا مجموعہ شائع ہوا۔ کئی کہانیا ں بھی لکھیں۔ عمر خیام کی رباعی کا منظوم ترجمہ کیا۔ ۱۲؍مارچ ۱۹۴۰ء کو دلی میں فوت ہوئے۔

❀❀❀

افتخار سعیدؔ بریلوی

زہر دے کر یہ دیا حکم کہ پینا ہوگا
اور اس پر ہے یہ اصرار کہ جینا ہوگا

کرامت علی کرامت سہ ماہی ''تناظر' حیدر آباد ،شمارہ نمبر ۲۵۲۸، ۳۱۱، ۳۱۲ میں لکھتے ہیں: ''ڈاکٹر آئی .ایچ .رضوی .ادبی نام افتخارؔ بریلوی کا پہلا اردو شعری مجموعہ جس میں ان کی ۶۴ غزلیں ہیں ،اور مذکورہ شعر کی غزل بھی ہے۔ موصوف تلک کالج ،بریلی کے پرنسپل رہے۔ انھیں ''مائیکل مدھوسودن دشا'' ایوارڈ جیسا باوقار اعزاز پانے کا شرف حاصل ہے''۔

❀❀❀

اسدؔ ملتانی

ہر شخص بنا لیتا ہے اخلاق کا معیار

خود اپنے لیے اور زمانے کے لیے اور

جہاں تک کام چلتا ہو غذا سے
وہاں تک چاہیے بچنا دوا سے (کلیات اسد ص ۱۶۳)

سید محمد اسد ملتانی کوکڑی ،افغان ضلع ملتان میں 1902ء میں پیدا ہوئے۔ سرکاری کالج لاہور سے بی.اے.کرنے کے بعد (انگریزی حکومت میں) سرکاری ملازمت کرلی۔ جو وائسرائے کے آفس میں پہلے آفس سپریٹنڈنٹ ہوئے اور سکریٹری خارجہ ہوئے۔ ان کے زمانے میں علامہ اقبالؔ کالج کے پروفیسر تھے۔علامہ اقبال سے اسد نے بہت کچھ سیکھا۔علامہ اقبالؔ اسد کے پسندیدہ شاعر بھی تھے۔ان کی صاحبزادی بھی لکھا کرتی تھیں۔ان کے داماد مظہر کلیم تھے جو جاسوسی ناول لکھا کرتے تھے۔''کلیاتِ اسد'' کوشوکت علی بخاری نے ترتیب دے کرشائع کروایا۔''مرثیہ اقبال'(منظوم) شائع کراکے زود گوشعرا میں اپنا نام درج کرایا۔ یہ مرثیہ عالمِ اسلامی کی بے بسی کی کہانی ہے۔ یہ علامہ اقبال کی ذہنی قربت کا نتیجہ ہے۔آپ کا کلام رسالوں میں بھی خوب شائع ہوا کرتا تھا ایک مشہور نظم آسان نسخہ جو اکثر کسی حکیم سعید کے نام سے شائع ہوتی رہتی ہے اور ہم یہ سمجھتے بھی ہیں کہ اسی حکیم کی ہے۔مگر یہ نظم اسدؔ ملتانی کی ہے۔

17 نومبر 1959ء کو راولپنڈی میں آپ کی وفات ہوئی۔

کلیات اسد ملتانی،سید شوکت علی بخاری ،ملتان

❀❀❀

انجم جبلپوری

آئینہ بننے سے بہتر ہے کہ پتھر بنو
جب تراشے جاؤ گے تو دیوتا کہلاؤ گے (آبِ مقطر ص ۹۱)

انجم جبلپوری صرف شاعر تھے اور کچھ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ان کے عزیز مجازؔ برہانپوری نے بتایا کہ وہ اکثر برہانپور کے مشاعرے میں آیا کرتے تھے۔جب کبھی مشاعرے میں آتے تھے تو ہفتوں اپنے چاہنے والوں کے بھروسے پر ٹھہر جاتے تھے اور جب نذرانے کا پیسہ ختم ہوجاتا تو آئندہ ہونے والے مشاعرے کی رقم اَیڈوانس میں لے لیتے تھے۔

میں نے یہ شعر ان کی زبان سے سنا تھا۔شراب خوب پیتے تھے اور اپنے ہمنواؤں کو بھی خوب پلاتے تھے۔مشاعرے کے نذرانے کی رقم اس مصرف میں خرچ کر کے خوش ہولیتے تھے۔ان کے کچھ اشعار مجازؔ برہان پوری کے پاس ہیں۔کیا ہی بہتر ہوتا کہ یہ یکجا کئے جاتے ؟

❀❀❀

بیتاب

تڑپ کر مرگئی بلبل قفس میں
پڑی تھی ہائے کس ظالم کے بس میں (منتخب التذکرہ ص ۸۷)

خدا کسی کو گرفتار زلف کا نہ کرے
نصیب میں کسی کافر کے یہ بلا نہ کرے (تذکرہ سرور ص ۱۳۶)

محمد اسمعیل بیتاب شاگرد یکرنگ۔ درویش صفت تھے۔ دربدر بھٹکتے رہتے تھے۔ ایک بار جعفر علی کے مکان کی طرف جا رہے تھے کہ گھوڑے سے گر پڑے اس میں ان کی ناک ٹوٹ پھوٹ گئی۔ ایسی حالت میں کچھ روز رہے آخر موت آ گئی اور دنیا سے چل بسے۔

❁❁❁

تشنہ

یہ اک اشارہ ہے آفات ناگہانی کا
کسی جگہ سے پرندے کا کوچ کرجانا (شعرائے میرٹھ، ص:۳۶۱)

سید عالمتاب تشنہ 10 / اپریل 1930ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں ایم.کام. کیا جب کامرس سبجیکٹ کے بارے میں سوچا نہیں جاسکتا۔ اپنی ڈگری کے مطابق کام بھی کیا۔ پاکستان جا کر بس گئے۔ پہلے چیف اکاؤنٹنٹ کے عہدے پر کام کیا۔ پاکستان روڈ ٹرانسپورٹ وہاں مختلف اعلیٰ عہدوں پر کام کر کے نام کیا۔ امریکہ جا کر اسی کام کی اعلیٰ ڈگریاں لیں۔ پاکستان آ کر انٹرنیشنل ٹرانسپورٹ کمپنی جوائن کیا۔ آخر میں ڈائیریکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۵۱ ء سے شعر گوئی کا آغاز کیا۔ کچھ عرصے میں نئی غزل کے معتبر شاعروں میں شمار ہونے لگا۔ تقریباً ایک درجن ناقدوں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ حسن بریلوی

❁❁❁

حسن بریلوی

مل گیا دل نکل گیا مطلب
آپ کو اب کسی سے کیا مطلب

دیکھ آؤ مریض فرقت کو
رسم دنیا بھی ہے ثواب بھی ہے داغ کے شاگرد ص65

مولانا حسن رضا حسن بریلوی 19 اکتوبر 1859 میں پیدا ہوئے. ان کے بڑے بھائی امام احمد رضا خان تھے- ابتداء میں اپنے بھائی سے ہی اصلاح لی، پھر داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے- صحافت کا پیشہ اختیار کیا- اپنا ایک پریس تھا جس میں اردو کا ایک ماہنامہ اور ایک ہفتہ وار اخبار بھی نکلتا تھا۔ سنی العقیدہ کے عالم تھے۔ اسلامی نظریے کے حامی تھے۔ ثمر فصاحت ان کے کلام کا مجموعہ ہے۔ حج کے فرائض انجام دینے کے بعد غزل لکھنا چھوڑ دیا اور صرف نعت لکھا کرتے تھے۔ آخری وقت تک اس پر عمل کیا۔ 18 اکتوبر 1908 کو آپ اس دنیا سے رخصت ہوئے_

❁❁❁

حبیب جالیب

دشمنوں نے جو دشمنی کی ہے

دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے — سخن ور۔ص ۲۹۰

حبیب احمد یعنی حبیب جالب ۲۴ / مارچ ۱۹۲۹ء میں ہوشیار پور کے میانی افغاناں میں پیدا ہوئے۔لیکن بچپن میں دلّی میں رہے۔شعر کہنے لگے تو مضطر لدھیانوی سے اصلاح لینی شروع کی۔بٹوارے کے وقت دلّی چھوڑ کر پاکستان آئے۔کراچی میں راغب مراد آبادی کے شاگرد ہوئے۔لیکن زیادہ دنوں تک ان کا ساتھ نہیں رہا۔حبیب جالب ترقی پسندوں کے مقبول شاعر تھے۔

شعر ترنم سے پڑھتے ہیں۔زیڈ۔اے بخاری نے انہیں اپنا ہمنوا بنا کر اپنے ادارے کے آل انڈیا مشاعرے میں انہیں پڑھوایا۔

❁❁❁

خلش نیازی

کتنے ہی اللہ والوں سے تعارف ہو گیا

اتفاقاً کل گئے تھے جانبِ میخانہ ہم — ہوا کا جھونکا ص۔پیش لفظ۔۲

مشکور احمد شمسی ۱۹۲۶ء میں کانپور میں پیدا ہوئے۔ان کے والد منظور احمد شمسی آنولہ کے رہنے والے تھے۔کانپور میں آ کر بس گئے اور آخری وقت تک یہیں رہے۔

ادیب کا امتحان پاس کیا اور شاعری کا آغا کوثر جانسی کے ساتھ رہ کر کیا۔نیازی شاہ نیازی کے آستانے سے سلسلہ عقیدت کی وجہ سے لگا رکھا تھا۔ان کی غزلوں کا مجموعہ ''لوحِ دل'' اور ہوا کا جھونکا شائع ہو چکا ہے۔نعتوں کی ایک کتاب شائع ہو چکی ہے۔

۱۳/جون ۲۰۰۶ء میں آپ اس دنیا سے رخصت ہوئے۔(بحوالہ شعرائے کانپور)

(ہوا کا جھونکا۔خلش نیازی۔مرتب ناصر خاں، کانپور (ہندی))

❁❁❁

شفق

پس مرگ میرے مزار جو دیا کسی نے ملا دیا

شفق اسے آہ دامن باد نے سر شام ہی سے — خمخانہ جاوید

دولت دام گل فروش، دہلی کا رہنے والا تھا، ذوق کے شاگرد تھے۔پڑھے لکھے نہیں تھے۔۱۸۷۷ کے قریب تک زندہ تھے مذکورہ شعر تھوڑے اسا تصرف کر کے قوالوں نے خوب گایا ہے۔

❁❁❁

دیوانہ گورکھپوری

اٹھ باندھ کمر کیوں ڈرتا ہے — اُمنگ میں پوری نظم۔اگست ۲۰۱۵ء

پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے — کلیاتِ رشید احمد صدیقی ص ۲۲

محمد فاروق دیوانہ مجنوں گورکھپوری کے والد تھے۔ان کا آبائی وطن ضلع بستی میں پلدہ کا میں ہوا۔جوملکی جوت سے بھی جانا جاتا ہے۔وہ خلیل آباد میں بھی رہے جہاں ان کے صاحبزادے مجنوں گورکھپوری کی پرورش ہوئی۔محمد علی جوہر کے اخبار ہمدرد کے سب ایڈیٹر تھے

۳۶۔۵۲ تک مسلم لیگ کے ٹکٹ پر اسمبلی میں نمائندے کی حیثیت سے کام کیا۔ دیوانہ گورکھپور، کے رئیس میاں جوادالی شاہ والینا مبارٖہ کے اسٹیٹ مینیجر تھے۔ ان سے ہر موضوع پر بات کی جاسکتی تھی۔ یہ بات شوکت تھانوی نے اپنے انداز سے انسائیکلو پیڈیا کے کسی پاکٹ ایڈیشن میں لکھا تھا۔ بڑے لیڈروں سے آشنائی رہی۔ اپنے علاقہ کی ترقی کے لئے بڑا کام کیا۔

❁❁❁

میاں محمد شاہ دین

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا — شعرائے پنجاب ص ۳۶

۲؍اپریل ۱۸۶۸ء کو باغبان پورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولوی نظام الدین ایک فاضل بزرگ تھے۔ ابتدائی تعلیم باغبان پور میں ہوئی۔ انٹرنس میں پورے پنجاب میں اول آئے۔ بقیہ تعلیم کے لئے لندن گئے وہاں سے بیرسٹری کی اور عدالت میں جج ہوئے۔ اپنے کام کے دوران ہی ان کی روح قبض کر لی گی وہ ۲؍جولائی ۱۹۱۸ء کا دن تھا۔

❁❁❁

پیارے صاحب رشید

زندگی کہتے ہیں کس کو موت کس کا نام ہے
مہربانی آپ کی نامہربانی آپ کی — خمخانہ جاوید ۴۳۵

سید محمد مصطفیٰ مرزا پیارے صاحب رشید میر انیس کے نواسے تھے۔ ابتداء میں انیسؔ سے بھی اصلاح لی۔ پہلے غزلیں ہی کہتے تھے اور کئی شاگردوں کی پرورشِ شعر بھی کی مگر پھر وہی خاندانی پیشہ اختیار کرلیا۔

پیارے صاحب ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اس زمانے کے مطابق ہوئی۔ شاعری میں اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چلے۔ یعنی مرثیہ گوئی پر خوب دھیان دیا۔ لکھنؤ کے علاوہ پٹنہ، حیدرآباد، کلکتہ اور رامپور گئے۔ ان کی خوب عزت کی گئی۔ تلامذہ کی کافی تعداد ہے۔ زبان صاف ستھری ہو اس کا خیال کرتے تھے۔ مرثیے خوب پڑھتے تھے۔ مگر غزل کہنے والوں میں بھی ان کا خاص مقام تھا۔ کلام میں تضع بہت تھا۔ ۷۴؍سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

گلستانِ رشید، رشید لکھنوی، اشاعت (۱) مملوکہ الیاس عباسی

❁❁❁

سالکؔ لکھنوی

چاہا تھا ٹھوکروں میں گزر جائے زندگی — تذکرہ معاصرین، ۴، ص ۶۱
لوگوں نے سنگِ راہ سمجھ کر ہٹا دیا — شعرائے اردو، ۱۵۷

سید محمد حسین سالکؔ لکھنوی 1910ء میں ایک شیعی خاندان میں پیدا ہوئے۔ یہ خاندان خالص مذہبی خاندان تھا۔ والد فاطرؔ لکھنوی بہت مشہور ادبی شخصیات میں سے تھے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہوئی۔ شاعری کا خاندان نہ ہونے کے بعد بھی ماحول شعر وادب کا تھا۔ چچا

وغیرہ اردو، عربی، فارسی اچھی طرح جانتے تھے۔ سالک نے پہلے اپنا تخلص شمیم رکھا جس کو بعد میں بدل دیا۔ اپنے والد سید سبطِ حسن فاطر لکھنوی سے اصلاح لی اور ان ہی کے بتائے ہوئے راستے پر چلے۔ سلام اور مرثیہ کہنے لگے۔ بعد میں ادبی انجمنوں میں اپنا کلام سنا کر مشہور ہوئے۔ مہاراجا چکر دھر سنگھ (والئی رائے گڑھ جو کبھی چھتیس گڑھ میں تھا) نے انھیں اپنا استاد بنالیا مگر ان کی طبیعت وہاں نہیں لگی۔ واپس لکھنؤ آ گئے۔ سالک لکھنؤ کے اساتذہ شعراء میں ایک اہم مقام رکھتے تھے۔ ترنم سے مشاعرہ پڑھتے تھے اور مشاعرہ میں خوب کامیاب ہوتے تھے۔ اپنے شاگردوں کو مشاعرے ہی میں غزل کہہ دیتے تھے۔ اس معاملے میں بدنام تھے۔ کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا اور مشہور بھی ہوئے۔ پہلے شمیم تخلص تھا بعد میں سالک دبستان لکھنو کے آخری شاعر تھے۔ آخری عمر میں بڑے مذہبی ہو گئے۔ سلام اور نوحے ہی کہتے تھے۔

❁❁❁

ساغر صدیقی

چراغ طور جلاؤ بڑا اندھیرا ہے
ذرا نقاب اٹھاؤ بڑا اندھیرا ہے (کلیات ساغر ص ۲۱)

حشر میں کون گواہی مری دے گا ساغر
سب تمہارے ہی طرف دار نظر آتے ہیں (عکس در عکس ص ۱۵، انتظار نظر ص ۷۶)

جس عہد میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی
اس عہد کے سلطاں سے کچھ بھول ہوئی ہے (انتظار نظر ص ۴۰)

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں (ضرب المثل ص ۱۸۵ انتظار نظر ص ۴۷)

بے وجہ تو نہیں ہیں چمن کی تباہیاں
کچھ باغباں ہیں برق و شرر سے ملے ہوئے (بیت بازی عرفان ص ۲۲۔ کلیات ساغر ص ۲۴۱)

محمد اختر ساغر صدیقی ۱۹۲۸ء میں انبالہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندانی پیشہ لکڑی کی کنگھیاں بنانا تھا۔ ابتدا میں ساغر بھی وہی کرتے تھے۔ بڑی کسمپرسی میں زندگی بسر کی۔ شعر کہتے رہے لیکن اس کا فائدہ کوئی اور اٹھاتا رہا۔ ان سے کوئی بھی شعر لکھوالیا کرتا تھا۔ بٹوارے کے بعد امرتسر (پاکستان) چلے گئے۔ کئی فلموں کے لئے گیت لکھے مگر کسی سے بھی مالی فائدہ نہیں ہوا، نہ ہی ان کے حالات بہتر ہوئے۔ ابتدا میں ناصر حجازی کے نام سے جانے جاتے تھے۔ جگر سے کافی متاثر تھے۔

نظمیں اور غزلیں لکھ کر دیتے تھے اور اس کا معاوضہ صرف ایک دن کا خرچ لیتے تھے، بڑی لاابالی طبیعت پائی تھی۔ شراب کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ چرس گانجے کی عادت بھی پڑ گئی۔ ہزاروں تخلیقات ضائع ہونے کے بعد بھی ایک چھوٹا کلیات رہ گیا۔ پتہ نہیں کون سی چیز کس

کے ہاتھ لگی۔ جنرل ایوب، صدر پاکستان نے ان کی مدد کرنے کے لئے انہیں بلایا تو ساغر نے انکار کر دیا۔ دیوانگی کی حالت میں وہ لوگوں سے صرف چار آنے مانگتے تھے۔ کسی بھی تخلیق یا مشاعرے کا نذرانہ صرف چار آنے لیتے تھے۔ انکی بقیہ رقم لوٹا دیتے تھے ,صبح سے شام تک کا خرچ صرف چار آنے تھا۔ ناصر زیدی لکھتے ہیں کہ ''ان کے عروج اور زوال دونوں کا زمانہ دیکھا ہے۔''

❁❁❁

سعید شہیدی

نشیمن پر نشیمن اس قدر تعمیر کرتا جا
کہ بجلی گرتے گرتے آپ ہی بے زار ہو جائے (شفق ص۔۲۳ رصدائے اردو یکم مارچ ۲۰۰۵ء۔)

حیدرآباد کے شہر یار جنگ کے صاحبزادے ,سعید برق وآشیاں کے شاعر کے نام سے مشہور تھے۔آپ ۱۹۱۴ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ان کے والد میر عابد علی شہید یار جنگ بھی شاعر تھے۔ پہلے مسرور اور بعد میں حضرت نجم آفندی سے مشورہ سخن لیا۔ مجلسوں اور محفلوں کے علاوہ ریڈیو پر بھی آپ کا کلام سنایا جاتا تھا۔ تذکرہ میں ان کے حالات بہت کم ملے ہیں۔ میں نے ان کی پوتی سے کچھ باتیں پوچھی ہیں ۔وہ کسی اسکول میں ٹیچر کی حیثیت سے پڑھا رہی ہیں۔ انہوں نے غزل,نظم ,منقبت مریثے اور نوحہ بھی کہے۔ مذکورہ شعر نشیمن ویکلی بنگلور کے اوپری صفحے پر شائع ہوتا ہے یہ شعر کس کا اس کی چھان بین کے بعد پتہ چلا کہ سعید کا شعر ہے۔اس شعر کے لئے کئی سال بیت گئے۔

❁❁❁

شاذ تمکنت

مرا ضمیر ہے کافی مری سزا کے لئے
تو دوست ہے تو نصیحت نہ کر خدا کے لئے کلیات شاذ ص ۴۳۲

زندگی ہم سے ترے ناز اٹھائے نہ گئے
سانس لینے کی فقط رسم ادا کرتے ہیں بزم دوستاں ص ۱۹۲

سید مصلح الدین شاذ تمکنت کی پیدائش ۳۱ر جنوری ۱۹۳۲ء کو حیدرآباد میں ہوئی۔ نامپلی ہائی اسکول سے ہائی اسکول اور سٹی کالج سے انٹر کیا۔ آگے کی تعلیم حیدرآباد ایوننگ کالج سے بی۔اے کیا۔ ام۔اے کرنے کے بعد لکچرار ہوئے۔ ۱۹۸۳ء میں انہوں نے مخدوم محی الدین فن اور شخصیت پر مقالہ لکھ کر پی۔ایچ۔ڈی کیا۔ چار شعری مجموعے شائع ہوئے ایوارڈ بھی کافی ملے۔ پونہ میں کچھ دن لکچرار کی حیثیت سے درس و تدریس سے لگے رہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی کیا۔(تراشیدہ ۱۹۶۶ء بیاض شام ۱۹۷۳ء ,نیم خواب ۱۹۷۷ء ,دستِ فرہاد ۱۹۹۴ء ,میں شائع ہوا۔ ترقی پسندی کے زمانے میں شاعری کی ابتداء کی اور اس لئے نظم پر زیادہ دھیان دیا۔ ان کی نظم کے مطالعہ سے ان کی زود گوئی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اُنہوں نے ۱۸راگست ۱۹۸۵ء کو دنیا چھوڑا۔

کلیات شاذ حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۲۰۰۰ء

❁❁❁

شاعر جمالی

تم آسماں کی بلندی سے جلد لوٹ آنا
ہمیں زمیں کے مسائل پہ بات کرنی ہے　　　صحیفہ ص ۱۲ رگلدستہ در گلدستہ

سید نذر الحسنین شاعر جمالی نان پارہ بہرائچ ۱۹۴۳ء میں پیدا ہوئے۔ حکومت کے میڈیکل آفیسر تھے۔ ان کی آخری پوسٹنگ جونپور میں ہوئی۔ ۲۰۰۰ء میں سبکدوش ہوئے اور بہرائچ اپنے گاؤں میں رہنے لگے۔

آپ کا کلام رسالوں اور اخباروں میں خوب چھپتا تھا۔ اپنے عام فہم شعر کی وجہ سے مشاعرے میں بھی داد حاصل کرتے رہے ۔ پروفیسر طاہر محمود ان کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ ان کے شعری مجموعے کرب (۱۹۷۸ء) غزلوں کا مجموعہ صحیفہ (۱۹۸۲ء) اور تیسرا شعری مجموعہ (۱۹۹۷ء) شائع ہو چکے تھے۔

۱۹ ر اکتوبر ۲۰۰۸ء کو رات ۱۰ ر بجے آبائی وطن نان پور سے جون پور لوٹ رہے تھے کہ راستے میں فیض آباد ریلوے اسٹیشن پر دل کا دورہ پڑا اور وہیں موت آ گئی۔ (مآخذ۔ اردو بک ریو)

❁❁❁

شان الحق حقّی

تم سے الفت کے تقاضے نہ نباہے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے　　　جدید اردو غزل ص۔۱۰۸

شان الحق حقّی ۱۵ ر ستمبر ۱۹۱۷ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام احتشام الدین حقّی تھا۔ ان کا تعلق شیخ عبد الحق حقی محدث سے تھا۔ شان الحق نے علی گڑھ سے بی۔ اے اور ام۔ اے (انگریزی) دہلی کے سینٹ اسٹیفن کالج سے کیا۔ بعد میں انہوں نے لندن سے ڈپلوما کیا۔ وہ شاعر ,ادیب ,مترجم اور لغت داں تھے۔ بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ کیا۔ تقریباً ۳۰ کتابیں لکھیں۔ کئی کتابوں کے ترجمے کئے ۔۲۰۔۲۲ عمر میں شیکسپیر کے ڈرامے کا ترجمہ کیا۔ حقی نے ایک مشہور نظم لکھی تھی جو ہندوستان کیے بھی کورس میں شامل تھی۔ یہ نظم سب سے پہلے انہوں نے بی۔ بی۔ سی لندن سے پڑھی تھی۔

کئی واقعات سے پتہ چلا کہ ان کی بھی کیفیت بھلکڑ جیسی تھی۔ مگر انہوں نے اردو کو اپنے کام سے مالا مال کر دیا۔ ان کی نظموں کی کتاب ''پھول کھلے ہیں رنگ برنگے'' شائع ہوئی تھی۔ ان کا شعری مجموعہ ''تار پیراہن'' کراچی سے شائع ہوا۔ بٹوارے کے وقت پاکستان گئے۔ انہیں ستارہ امتیاز سے سرفراز کیا گیا۔ ترقی اردو بورڈ پاکستان کے اعزازی سکریٹری بھی رہے۔ ایک تاریخی لُغت ترتیب دی جس میں اپنی پوری زندگی لگا دی۔ اسلئے انہوں نے اپنی شاعری بھی ترک کر دی۔ مشاعرے میں نظم پڑھنے کا انداز بہت سیدھا سادہ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کوئی نثر پڑھ رہے ہوں۔ ہاں تمہید بہت لمبی باندھتے تھے۔

۱۱ ر اکتوبر ۲۰۰۵ء میں پھیپھڑوں کے کینسر سے کناڈا میں موت آئی۔

❁❁❁

رضاؔ تھانسیری

آدمی بلبلہ ہے پانی کا
کیا بھروسہ ہے زندگانی کا (عیار الشعراء ص۔۳۰۹)

مولوی ضیاء الدین رضا تھانسیری کے صوفی بزرگ تھے۔ مولوی شاہ امام بخش تھانیسری کے شاگرد تھے۔ سودا کے معاصرین میں تھے ۔مولوی ضیاء الدین تھانسیری تھانسیر کے رہنے والے صوفی بزرگ تھے ۔مولوی شاہ امام بخش تھانسیری سے بیعت بھی تھے۔
جن کی کتاب انتخاب دواوین کافی مشہور ہے۔ تذکروں میں چار پانچ شعر ہی درج ہیں۔ صرف عیار الشعراء میں دس ۱۰ شعر ہیں۔
تھانسیر ہریانہ کا بہت پرانا اور تاریخی حیثیت کا شہر ہے۔ تھانسیر کو آج کوروکشتر کہا جاتا ہے۔ پانی پت میں ہے تاریخ میں دلی کے قریب ہے۔ رضا مولوی شاہ امام بخش تھانسیری کے شاگرد تھے۔ سوداؔ کے معاصرین میں تھے۔ اکثر علماء اپنے شعر کو ضائع کر دیتے ہیں ۔خاص کر اپنے پیروں کے کہنے پر ایسا کرتے ہیں۔ اس لئے ان کا مجموعہ یا دیوان شائع نہیں ہوا ہوگا۔

❁❁❁

غمگین

یہ ہے قسمت کی خوبی دیکھ اے میرے جنازے پر
نمازی یاں تلک بہکے کہ ایک تکبیر کم دی (دبستان رامپور ص ۲۷۵)

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال (دبستان رام پور ص۔۲۷۳)

مولوی عبدالقادر خاں غمگین ۱۷۸۰ء میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ مفتی شرف الدین مولانا رستم علی اور مولانا منیر سے عربی فارسی اور اردو سیکھی۔ بہت کم عمری میں کتب درسہ کا علم حاصل کر لیا۔ مراد آباد کے تھانہ دار مقرر ہوئے۔
مراد آباد میں صدر الصدور بھی مقرر ہوئے۔ ان خدمات کے صلے میں خان بہادر کا خطاب بھی ملا۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار سے بھی منسلک رہے۔
غالب سے ان کی ملاقات یہیں ہوئی۔۔۔۱۸۴۰ء میں نواب محمد سعید خاں نے انہیں رام پور بلا کر عدالت دیوانی اور فوجداری کا مفتی مقرر کیا۔ مدرسہ عالیہ کی نگرانی کرتے رہے۔ ۱۸۴۳ء کو انتقال کیا۔
شاعری میں اپنے والد کے شاگرد رہے۔ ان کے تلامذہ میں ان کے صاحبزادے مولوی محمد ناصر خاں ناصر کا بھی نام آتا ہے ۔عبدالقادر رامپوری اپنے زمانے کے فاضل شخص تھے۔ طبیعت نہایت ظریفانہ پائی تھی۔ خوش مزاجی کے لئے مشہور تھے۔ ایک دن وہ غالب سے ملنے گئے اور دوران ملاقات ان سے کہا کہ آپ کا ایک اردو شعر سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ مرزا نے پوچھا کون سا شعر اس وقت عبدالقادر نے خود دو مصرعے کہہ کر غالب کو سنا دیئے، پہلے تو۔۔۔۔ مذکورہ شعر کہہ کر ان کے شعر پر طنز کیا تھا۔

❁❁❁

ساغر نظامی

کافر گیسووالوں کی رات بسر یوں ہوتی ہے
حسن حفاظت کرتا ہے اور جوانی سوتی ہے (بادۂ مشرق ص۵۳۲/سب رنگ شاعری ج۱۹)

دشت میں قیس نہیں کوہ پہ فرہاد نہیں
ہے وہی عشق کی دنیا مگر آباد نہیں (شہکار ص۵۱۵)

یہ میکدہ ہے ترا مدرسہ نہیں واعظ
یہاں شراب سے انساں بنائے جاتے ہیں (بادۂ مشرق ص۵۲۵/ہزار رنگ ص۴۴۶،۵۲۵)

صدیار خاں ساغر نظامی ۲۱/دسمبر ۱۹۰۵ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ طالب علمی کے زمانے سے ایک طرف انہیں شعروادب سے دلچسپی تھی تو دوسری طرف سیاست سے۔ دونوں کو ملا کر ساغر نے اپنی زندگی بسر کی فلموں میں گیت لکھے مگر نا کامیاب رہے۔ یہاں سے دلی گئے اور اثر ورسوخ سے آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوگئے کالی داس کا منظوم ڈرامہ شکنتلا کا بہترین ترجمہ کیا۔

ممبئی کے ایک مشاعرے میں اپنی غزل سنا کر بیٹھ گئے اس اسٹیج پر جواہر لعل نہرو اور لکشمی پنڈت بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ لکشمی پنڈت کی نظر ساغر نظامی کے پھٹے ہوئے پائجامے پر رک گئی۔ انہوں نے نہرو جی کی طرف اشارہ کیا۔ نہرو جی ہمدرد دل رکھتے تھے۔ انہیں اپنے پاس بلا کر دلی آنے کی دعوت دی۔

وہ سرکار کے منظور نظر بن گئے۔ خوب شہرت ملی۔ مشاعرے کے کامیاب شاعر تھے۔ ان کی زندگی میں ان کا کلیات شائع ہوا۔ سیماب کے شاگرد تھے۔ ان کی موت ۲۷/فروری ۱۹۸۴ء کو دلی میں ہوئی۔

***

ظریف لکھنوی

نر ہے یا مادہ عجب ترکیب ہے اسلام کی
کچھ حقیقت ہی نہیں کھلتی ہے سیتا رام کی (م۔ا۔م کلیات ظریف ص۱۲۳)

۲۴/فروری ۱۸۷۰ء کو لکھنو میں پیدا ہوئے، والد مرزا سلیمان قدر بہادر کی سرکار میں مدار الہام میں ملازم تھے۔ ۱۸۷۷ء سے ان کی تعلیم شروع کروائی گئی۔ اپنی بڑی بھاوج یعنی صفی لکھنوی کی بیوی سے پڑھا۔ مدرسے صفی کے مکتب میں بھی پڑھا۔ سنسکرت بھی سیکھی تھوڑی بہت انگریزی بھی جانتے تھے۔ عربی، فارسی اردو تو خوب جانتے تھے۔

چھوٹی عمر سے ہی اپنے بڑے بھائی صفی لکھنوی کے ساتھ مشاعرے میں جانا شروع کر دیا۔ ظریف کافی ذہین تھے اپنے بھائی کے ہزاروں اشعار یاد کرتے تھے۔ سلیمان قدر بہادر انہیں بلوا کر ان سے اشعار سنتے تھے۔ انہیں بہت سے دوسروں کے اشعار بھی ازبر تھے۔ انہوں نے ہر موقع کے لئے نظمیں لکھیں ہیں۔ بہت سے مسائل اور حالات کو اپنے انداز میں نظم پیش کیا ہے۔ بقرعید کے دن نل میں پانی نہیں آیا تو بجلی آب رسانی لیڈروں کے نااہل پن پر ہمارے لیڈر، جہاں انہوں نے آشوب اسلام لکھا ہے وہیں شعر آشوب بھی لکھا۔ کتاب

کے موضوع اور طریقے کی وجہ سے ہم ان کے دوسرے اشعار کا ذکر نہیں کر سکتے ہیں۔
اور آخر میں سارے ہندوستان کے سامعین کو ہنسا ہنسا کر ۳۰؍دسمبر ۱۹۳۶ء کو خود خاموش ہو گئے اور اس خاک میں مل گئے جس میں سب لوگ ملتے ہیں۔ (مطالعہ پیش لفظ)
بھائی صفی نے ظریف کے شعروں پر اصلاح دینی شروع کی۔ والد صاحب کے سبکدوش ہونے کے بعد نوکری کرنے کی ٹھانی۔ پہلے سلیمان قدر بہادر کے میر منشی پھر پرائیوٹ سکریٹری ہو گئے۔ کچھ عراق میں اپنے ریاست محمود آباد کے یہاں نوکری کی۔
نوابوں کی صحبت میں رہ کر ظریفانے بہت کچھ سیکھا۔ ذاتی خوبیوں میں زیادہ، نیز سائیکل چلانا، شکار اور محفل

❀❀❀

عبیداللہ علیم

عزیز اتنا ہی رکھو کہ جی سنبھل جائے
اب اس قدر بھی نہ چاہو کہ دم نکل جائے (جدید اردو غزل ص ۹۱)

بنا گلاب تو کانٹے چبھا گیا اک شخص
ہوا چراغ تو گھر ہی جلا گیا اک شخص (غزلستان ص ۲۳)

ہوا کے دوش پہ رکھے ہوئے چراغ ہیں ہم
جو بجھ گئے تو ہوا سے شکایتیں کیسی (مشہور غزل ص ۸۷) چاند چہرہ ص ۲۰

کچھ دن تو بسو مری آنکھوں میں
پھر خواب اگر ہو جاؤ تو کیا اردو کے مشہور اشعار ص ۲۰۵

عبیداللہ علیم حسین علیم ۱۹۳۹ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سیالکوٹ کے تھے۔ عبیداللہ علیم سیالکوٹ آ گئے۔ آپ بٹ خاندان سے تھے۔ ان کی تقریباً ۵۰؍سے زیادہ غزلیں ویڈیو پر سنائی جارہی ہیں۔

❀❀❀

فغان

زخم دل تو سیا نہیں جاتا
بن سیئے بھی رہا نہیں جاتا (جواہر سخن (۱) ۱۶۴)

مجھ سے جو پوچھتے ہو تو ہر حال شکر ہے
یوں بھی گذر گئی مری دوں بھی گذر گئی (دیوان فغاں ۱۹۱)

باغ و بہار جس کی نظر میں خزاں لگے
تو ہی بتا یہ دلِ وحشی کہاں لگے

خان اشرف علی فغاں احمد شاہ کا رضائی بھائی تھا۔ دلی میں پیدا ہوا۔ احمد شاہ کے عہد میں پنج ہزاری منصب تھا۔ ابتدائی دور قلعۂ معلیٰ میں گذرا۔ اس لئے بڑی آسودگی رہی۔ علی قلی ندیم کے شاگرد تھے اور بدنام دہلوی سے بھی اصلاح کی۔ مہاراجہ شتاب رائے کی وجہ سے پٹنہ آ کر وہیں سکونت اختیار کی۔ یہاں شتاب رائے کے درباری ہو گئے۔ لطیفہ گوئی کے ماہر تھے۔

❁❁❁

کنور مہندر سنگھ سحر

عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارا تو نہیں
صرف مسلم کا محمدؐ پہ اجارا تو نہیں ماہنامہ رنگ ص۔۱۹

کنور صاحب ۹/مارچ ۱۹۰۹ءکو ساہی وال (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کے ایک شاگرد رعنا سحری کے مطابق کنور صاحب سولہویں پشت میں براہ راست حضرتِ باباگرونانک کے پوتے تھے۔ کنور صاحب نے فارسی سے ایم۔اے کیا۔ کالج کے زمانے میں دو استاد سید جلال الدین حیدر اور مولوی کرامت اللہ سے اپنے شعری سفر میں کافی مدد لی۔

۱۹۳۴ءمیں پاس ہونے کے بعد کئی عہدوں پر بڑی اچھی طرح کام کیا۔ ۱۹۴۵ءمیں دہلی کے سیٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر رہے۔ ۱۹۶۷ءمیں چنڈی گڑھ کے پنچایت کے ڈائریکٹر ہوئے۔ رسالوں اور مشاعروں دونوں کے شاعر تھے۔ میں نے اکثر انہیں مشاعرے کی صدارت کرتے دیکھا۔ بیدی کے بے شمار دوست تھے۔ ان کے ہم نوالہ ہم پیالہ بنے رہتے تھے۔ اکثر شعراء ان کے خلاف

❁❁❁

کیف ٹونکی

اچھی صورت بھی کیا بری شئے ہے
جس نے ڈالی بُری نظر ڈالی (مقبول اشعار ص ۱۳۲)

آپ کی پیدائش ۱۸۶۰ءمیں ہوئی۔ عالم گیر کیف ٹونکی صاحب کے ہم وطن ڈاکٹر آزاد قاسمی کے مطابق کیف صاحب مشہور نعت گوئی کے مشہور شاعر تھے۔ بھوانی مہاراج کے بہت چہیتے تھے۔ انہوں نے کیف کو درباری شاعر مانا تھا اور انہیں عزیز سمجھتے تھے۔ آخری وقت میں ان سے قریب نہ تھے۔ پھر بھی انہیں اپنے دربار میں بلا کر ان کا علاج کروایا۔ ان کے دو صاحبزادے تھے ایک آزاد صاحب کے ساتھ تھے اور ان کے اچھے روابط تھے۔

آپ کی وفات ۱۵/مئی ۱۹۴۰ءکو جھالڑہ' پاٹن میں ہوئی۔

❁❁❁

نریش کمار شاد

دشمنوں نے تو دشمنی کی ہے

دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے　　　بت کدہ ۸۳ شعری انتخاب ص۔۱۰۴

لوگ لوگوں کا خون پیتے ہیں　　　شعری انتخاب ص۔۱۰۴
ہم نے تو صرف مے کشی کی ہے　　　بت کدہ۔۸۳

لوگ جن حادثوں سے مرتے ہیں
مجھ کو ان حادثوں نے پالا ہے　　　شعری انتخاب ص۔۱۰۴

نریش کمار شاد کی پیدائش ۱۱؍دسمبر ۱۹۲۷ء کو یحییٰ پور، ضلع ہوشیار پور (مشرقی پاکستان) میں ایک شاعر اور صحافی نوہر یارام درد کے گھر میں ہوئی۔ والد صاحب پنجاب کے ایک بڑے اخبار ''ہندسماچار'' کی ادارت میں شامل

❁❁❁

شرر

گئے دونوں جہاں کے کام سے ہم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے
نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم　نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے　　　(گلشن بے خار ص۲۱۴)

میر صادق علی شرر لکھنو کے رہنے والے تھے۔ دنیا سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس سے زیادہ کسی تذکرے میں ذکر نہیں ہے۔

❁❁❁

شکیب جلالی

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے سب پیڑ کے پھل تھے پس دیوار گرے　　　(کلیات شکیب جلالی ص/۱۰۶)

جہاں تلک بھی یہ صحرا دکھائی دیتا ہے
مری طرح سے اکیلا دکھائی دیتا ہے　　　(کلیات شکیب جلالی ص/۱۳۰)

یہ ایک ابر کا ٹکڑا کہاں کہاں برسے
تمام دشت ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے　　　(کلیات شکیب جلالی ص/۱۳۰)

آ کر گرا تھا کوئی پرندہ لہو میں تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر　　　(کلیات شکیب جلالی ص/۱۲۳)

جو جلاتا ہے کسی کو خود بھی جل جاتا ہے وہ
شمع بھی جل جاتی ہے پروانہ جل جانے کے بعد
عشقیہ شاعری ص ۸۷

سوچو تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام روح
دیکھو تو اک شکن بھی نہیں ہے لباس میں
(کلیات شکیب جلالی ص ؍۱۲۱)

پہلے تو میری یاد سے آئی حیا انہیں
پھر آئینے میں چوم لیا اپنے آپ کو
(کلیات شکیب جلالی ص ؍۱۳۰)

سید حسین رضوی شکیب جلالی ۱؍اکتوبر ۱۹۳۴ء کو قصبہ جلال ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ماں باپ کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا۔ ہائی اسکول تک ہی تعلیم حاصل کر سکے۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان ہجرت کر گئے۔ لاہور میں بی۔اے تک کی تعلیم حاصل کی۔ اردو کے جدید شعراء میں بڑا اہم نام جانا جاتا ہے۔ مغربی پاکستان میں حکومت کی پبلی سیٹی آفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔

ماجد الباقری کے مطابق ان کی پیدائش ان کے ننیھال بدایوں۔ یوپی میں ہوئی۔ ان کے والد ذہنی بیماری میں مبتلا تھے۔ یہ بیماری ان کو بھی لاحق ہوگئی۔ بچپن میں ان کے والد نے ان کی والدہ کو بچوں کے سامنے ٹرین کے سامنے ڈھکیل دیا۔ یہ واقعہ ان کے ذہن سے نہیں گیا۔ ان کا بھی اپنے والد کی طرح ذہنی توازن بگڑ گیا۔ انہوں نے بھی ریل سے ٹکرا کر اپنی جان دے دی۔

شاعری نوعمری میں شروع کی۔ ابتداء میں کمال تخلص رکھتے تھے اور ماجد الباقری سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے ہم عمروں نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس کی وجہ سے بھی کافی پریشان تھے۔ واقعی جس طرح کا شعر کہتے تھے اگر اور جیتے رہتے تو زیادہ مقبول ہوتے۔ پاکستان جانے کے بعد انہوں نے ہندوستان کی ادبی کمی کو پورا کرنے کے لئے مسلسل جدوجہد کی۔ لاہور سے انہوں نے ایک ادبی رسالہ ''جاوید'' نکالا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ پاکستانی حکومت کے رسالہ ''مغربی پاکستان'' سے بھی منسلک رہے۔

۳۲؍سال کی عمر میں ۱۲؍نومبر ۱۹۶۶ء کو ٹرین سے کٹ کر خودکشی کر لی۔

سید حسین رضوی شکیب جلالی ۱؍اکتوبر ۱۹۳۴ء کو قصبہ جلال ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ماں باپ کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا۔ ہائی اسکول تک ہی تعلیم حاصل کر سکے۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان ہجرت کر گئے۔ لاہور میں بی۔اے تک کی تعلیم حاصل کی۔ اردو کے جدید شعراء میں بڑا اہم نام جانا جاتا ہے۔ مغربی پاکستان میں حکومت کی پبلی سیٹی آفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔

ماجد الباقری کے مطابق ان کی پیدائش ان کے ننیھال بدایوں۔ یوپی میں ہوئی۔ ان کے والد ذہنی بیماری میں مبتلا تھے۔ یہ بیماری ان کو بھی لاحق ہوگئی۔ بچپن میں ان کے والد نے ان کی والدہ کو بچوں کے سامنے ٹرین کے سامنے ڈھکیل دیا۔ یہ واقعہ ان کے ذہن سے نہیں گیا۔ ان کا بھی اپنے والد کی طرح ذہنی توازن بگڑ گیا۔ انہوں نے بھی ریل سے ٹکرا کر اپنی جان دے دی۔

شاعری نوعمری میں شروع کی۔ ابتداء میں کمال تخلص رکھتے تھے اور ماجد الباقری سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے ہم عمروں نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس کی وجہ سے بھی کافی پریشان تھے۔ واقعی جس طرح کا شعر کہتے تھے اگر اور جیتے رہتے تو زیادہ مقبول ہوتے

۔پاکستان جانے کے بعد انہوں نے ہندوستان کی ادبی کمی کو پورا کرنے کے لئے مسلسل جدوجہد کی۔لاہور سے انہوں نے ایک ادبی رسالہ ''جاوید'' نکالا۔اس کے ساتھ ساتھ وہ پاکستانی حکومت کے رسالہ ''مغربی پاکستان'' سے بھی منسلک رہے۔۳۲؍سال کی عمر میں ۱۲؍نومبر ۱۹۶۶ء کو ٹرین سے کٹ کر خودکشی کر لی۔

(کلیاتِ شکیب جلالی۔فرید بک ڈپو دہلی۔مملوکہ۔نصرت۔۲۰۰۷ء)

❁❁❁

شہیدی

ایام مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے
دن عیش کی گھڑیوں میں گزر جاتے ہیں کیسے (خمخانہ جاوید ص۳۱۹)

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھیں
قفس جس وقت ٹوٹے طائر روحِ مقیّد کا (خمخانہ جاوید ص۲۲۰)

سیکھ لے ہم سے کوئی ضبط جنوں کے آداب
برسوں پابند رہا اور نہ ہلائی زنجیر (رام پور کا دبستان ص۲۵۶)

وہ روز تو آنے دے بتادیں گے شہیدیؔ
بَن آئے کسی شخص پہ مرجاتے ہیں کیسے (گلستانِ بےخزاں ص۱۲۹)

منشی کرامت علی خان شہیدی موضع ہڑیاپور ضلع اناؤ (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ان کے والد عبدالرسول خان، راجہ ٹکیٹ سنگھ کے فارسی کے استاد تھے اس لئے بھی شہیدی کے علم میں اپنے والد سے بڑی مدد ملی۔آپ کی پرورش لکھنؤ میں ہوئی نصیر اور مصحفی کے شاگرد ہوئے۔راجہ ٹکیٹ سنگھ نے بھی شہیدی سے اصلاح لی۔سیر و سیاحت کا شوق تھا۔بریلی، دلی، پنجاب اور گجرات میں قیام رہا۔آپ کی پرورش لکھنؤ میں ہوئی وہیں مصحفی کے شاگرد ہوئے ان کے انتقال کے بعد نصیر دہلوی سے بھی اصلاح لی۔۱۲۵۵ھ کو سفر حج کے لئے روانہ ہوئے۔۱۷؍اپریل ۱۸۴۰ء کو ادائے حج کے بعد مدینے کے قریب روح قفص ہوگئی۔ (ماخذ خمخانہ جاوید)

❁❁❁

عباس

پیتا نہیں شراب کبھی بے وضو کئے
قالب میں میرے روح کسی پارسا کی ہے (علم مجلسی (۳) ۸۲ خمخانہ جاوید (۵)، ۵۶۸)

مرزا عباس بیگ عباس کے والد بھی شاعر تھے اور ان کا نام مرزا زکی ندیم تھا۔بانس بریلی کے رہنے والے تھے۔آتش کے شاگرد

تھے۔رامپور سے لکھنو اور لکھنو سے باندہ کے نواب کی سرکار میں ملازم ہوئے۔امیر مینائی نے انتخاب یادگار میں لکھا ہے کہ ان کا دیوان ترتیب دیا جا چکا ہے۔مگر پتہ نہیں تھا۔تقریباً ۴۰ سال کی عمر میں ایک شعر کہا۔

اختر چھپک گئے بڑے خالونکے سامنے
گوروں کے پاؤں اٹھ گئے کالونکے سامنے

بریلی کے ایک انگریز حاکم نے جب یہ شعر سنا تو اس کا خون کھول گیا۔اس نے ان کو باغی قرار دے کر انہیں پھانسی پر چڑھا دیا ۔اس شعر کا مفہوم انگریز نہیں سمجھ سکا اور نہ کسی نے اسے سمجھانے کی کامیاب کو

❁❁❁

فصاحتؔ لکھنوی

مجھ میں اور شمع میں ہوتی ہیں یہ باتیں شبِ ہجر
آج کی رات بچیں گے تو سحر دیکھیں گے (دیوانِ بےمثال،۳۹۵)

سید عباس حسن فصاحتؔ لکھنوی ۱۲۷۳ھ میں پیدا ہوئے۔مولانا عبدالحلیم شررؔ فصاحت کے دوستوں میں سے تھے۔انھوں نے ''دیوانِ بےمثال'' کی تقریظ لکھی تھی۔فصاحتؔ کے والد کا انتقال ان کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔اس لیے ان کی ساری ذمہ داری ان کے بڑے بھائی نے اٹھائی۔بڑے خوش فکر شاعر تھے۔اسی لیے انھوں اپنے دیوان کا نام ہی ''بےمثال'' رکھا۔۵۲۸ صفحات پر مشتمل یہ دیوان اپنی فصاحت کی وجہ سے بہت مشہور ہوا۔جگہ جگہ اچھے اشعار پر لوگ واہ وا کہنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔5 فروری ۱۹۳۱ء کو کربلا میں انتقال ہوا۔

(دیوانِ بےمثال، فصاحت لکھنوی،مطبع:نول کشور،1935ء)

❁❁❁

قمر جلالوی

پیروں کے بوجھ سے تو نہیں ہے کمر میں خم (اردو کے مشہور اشعار،۲۶۵)
میں جھک کے ڈھونڈتا ہوں جوانی کدھر گئی (بیت بازی ع۔ا،ص۴۵)

اے ابرِ کرم ذرا تھم کے برس اتنا نہ برس کہ وہ آ نہ سکیں
وہ آ جائیں تو جم کے برس اور اتنا برس کہ وہ جا نہ سکیں (ن۔ف) قاتل شاعری ص۳۱

غلط ہو آپ کا وعدہ مگر خدا نہ کرے
مگر حضور کو عادت ہے بھول جانے کی (کراچی میں غزل ص۳۲)

کبھی کہا نہ کسی نے ترے فسانے کو

نہ جانے کیسے خبر ہوگئی زمانے کو (کراچی میں غزل ص ۳۰)

دبا کے قبر میں سب چل دیئے ،دعا نہ سلام
ذرا سی دیر میں کیا ہوگیا زمانے کو
رشک قمر، ص:۶۷

شکریہ! اے قبر تک پہنچانے والو شکریہ
اب اکیلے ہی چلے جائیں گے اس منزل سے ہم
یادِ رفتگان (جلد دوّم)، ص ۱۸۴۔۱۸۳

کہا کسی سے نہ میں نے ترے فسانے کو
نہ جانے کیسے خبر ہو گئی زمانے کو
یادِ رفتگان (جلد دوّم)، ص

قمر جلالوی ۱۸۸۷ء میں جلالوی میں پیدا ہوئے۔قمر جلالوی جدید رنگ میں شعر کہنے کے باوجود روایت کی پاسداری بھی کی ہے ۔اے ابر کرم...... جیسے شعر یہی بات ہے لیکن انداز بیاں صاف اور چونکا دینے والا ہے۔والد سید غلام سجاد حسین علی گڑھ کے چند معتبر لوگوں میں تھے۔ان کے خاندان کے لوگ سبھی میجر تھے۔امیر مینائی کے شاگرد ہوئے۔علی گڑھ آ کر مشاعروں میں خوب چمکے۔خوب شاگرد بنائے ۔بٹوارے کے بعد پاکستان آ کر بس گئے۔یہاں بھی مشاعرے میں جان ڈال دیتے تھے۔مالی حالات اچھے نہیں تھے۔صرف مشاعرے پر منحصر کرنا اس زمانے میں بڑا مشکل تھا۔وہ خود کہتے تھے کہ

❁❁❁

گستاخ رامپوری

شوق کہتا ہے کہ چلئے کوئے جاناں کی طرف
ہے یہ ارشادِ جنوں ,بڑھئے بیاباں کی طرف
علمی مجلس ص۔۱۰۰

نو عمر ہیں ابھی ہے تلون مزاج میں
غصے کا اعتبار ہے ان کے نہ پیار کا
علمی مجلس ص۔۱۰۱

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

ساقی ادھر اٹھا تھا ,ادھر ہاتھ اٹھ گئے
بوتل سے کاگ اڑا تھا کہ رندوں میں چل گئی

کرامت الیاس خاں گستاخ رام پوری عبداللہ خاں رام پور کے رہنے والے تھے۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد انگریزوں کے جیلر رہے۔حسرت موہانی نے ''تذکرۃ الشعرا'' میں ان کے بارے میں بہت تفصیل سے لکھا ہے۔بڑے عیش پسند تھے۔زیادہ تر قوالی اور مغنیوں

کے لیے اپنے روپئے برباد کرتے تھے۔ایک طرف جابر جو افغان پٹھان ہونے کی وجہ سے تھے تو دوسری طرف بڑے رحم دل بھی تھے۔اکثر مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔حضرت امیؔر مینائی کے شاگرد تھے۔ریاضؔ خیر آبادی سے بہت قریب رہے۔رندی اور مشربی ان کے اشعار میں خوب ہیں۔لیکن ریاض کی ذاتی زندگی شراب سے دور تھی۔گستاخؔ کو خراب عادتیں رام پور میں نہیں علی گڑھ میں ملیں۔حسرتؔ

بیمار انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ

گلستاں ہزار رنگ ص ۱۳۹۔غزل نما ص ۴۲۱

تم سے کچھ کہنے کو تھا بھول گیا
ہائے کیا بات تھی کیا بھول گیا

علمی مجلسی۔نظام رامپوری ص ۱۸۲

ان کا نام سید محمد اکبر بادشاہ تھا۔آپ کی پیدائش ۱۸۸۲ء میں ہوئی۔شیخ علی بخش بیمؔار کے شاگرد تھے۔ریاست رامپور کے سواروں میں ملازم تھے۔بہت کم تنخواہ ملتی تھے۔کلیات شائع ہو چکا ہے۔اسے کلب علی خاں فائق نے مجلس ترقی ادب' لاہور سے شائع کیا ہے۔مرزا غالب نے انہیں شیر رام پور کا خطاب دیا تھا۔آپ نے ابتدا میں اپنے شیخ کامل حضرت شاہ احمد علی خاں سے اصلاح لی۔جنہوں نے شاعری چھوڑ دی تھی۔ان کے زمانے میں رامپور میں شعر و ادب کا خوب چرچا تھا۔شاد عارفی نے باوثوق ذرائع سے یہ بات بتائی ہے کہ ''انگڑائی بھی لینے......'' یہ مصرع نواب کلب علی خاں نواب کا مصرع ہے یہ نظام کو عطا کر دیا گیا۔

پھر نظام رامپوری نے مذکورہ شعر کی غزل کہہ کر اردو شاعری میں ادا بندی کی بہترین مثال پیش کی۔وہ بہت صاف ذہن کے آدمی تھے۔صوفی بزرگ کے ساتھ رہ کر وہ بھی اسی طرح رہتے تھے۔

❁❁❁

مبارک عظیم آبادی

اب کون بات رہ گئی یہ بات بھی گئی
یعنی کبھی کبھی کی ملاقات بھی گئی

گلستان ہزار رنگ 201

پھول کیا ڈالو گے تربت پر مری
خاک بھی تم سے نہ ڈالی جائے گی

جلوہ داغ صفحہ نمبر 103

خدا جانے کہاں سے کھنچ کے میخانے میں آتی ہے
خبر اتنی تو ہے شیشے سے پیمانے میں آتی ہے

مبارک عظیم آبادی، ص: ۲۵

سید مبارک حسن مبارکؔ عظیم آبادی 29 اپریل 1869ء تاج پور، دربھنگہ، بہار میں پیدا ہوئے جو اب سمستی پور میں ہے۔ان کے والد منصف تھے۔داغؔ دہلوی کے شاگرد تھے۔داغؔ جب حیدر آباد میں تھے تو انھوں نے وہاں جا کر ان سے فیض حاصل کیا۔دوسرے کئی شہروں کی سیر کی اور وہاں کے مشہور شعرا اور ادبا سے ملے۔مبارکؔ نے شاعری کو اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا۔ایک طرح کے مصلح تھے۔

مبارک پٹنہ میں بس گئے۔ جہاں ان کے قدردان بھی تھے۔مبارک بڑے نفیس شخص تھے۔لال کوٹ،سفید پاجامہ اور جوتے موزے کے ساتھ پہنتے تھے۔مشاعروں میں نشستوں میں شرکت کرتے تھے۔پڑھی گھاٹ پر اکبر حسین صاحب کے بنگلے میں رہتے تھے۔ 1958ء میں انتقال ہوا۔

(مبارک عظیم آبادی، احمد پور، بہار اردو اکادمی)

❀❀❀

مجذوب

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی (کشکول مجذوب ص۱۸۶)

میری انتہائے نگارش یہی ہے
ترے نام کی ابتدا کر رہا ہوں (تذکرہ اتر پردیش ا۔ب(۲)۲۸۳)

تو نے ان کو کیا سے کیا ذوق فراواں کردیا
پہلے جاں پھر جانِ جاں پھر جانِ جاناں کردیا (مجذوب نقوش ص۴۵)

خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوب ۱۸۸۱ء میں اورائی، ضلع جالون، یوپی میں پیدا ہوئے۔مولانا اشرف علی تھانوی کے خلیفہ تھے۔ان کا مجموعہ کشکول ہے۔

❀❀❀

مضمون دہلوی

ہم فقیروں میں تمہارا اے میاں کیا کام ہے
تم تو طالب زر کے ہو اور یاں خدا کا نام ہے

ہم نے کیا کیا نہ ترے غم میں اے محبوب کیا ا۔کے واسطے.
صبر ایوب کیا گریہ یعقوب کیا

کیا سمجھ بلبل نے باندھا ہے چمن میں آشیاں
ایک تو گل بے وفا اور اس پہ جور باغباں (جواہر سخن(۱)۲۰۶،۲۰۵،۲۰۴)

شیخ شرف الدین مضمون اکبر آباد کے رہنے والے تھے۔آگرے کے قریب جاجؤ میں پیدا ہوئے۔دلی آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے اورنگ زیب کی صاحبزادی نے شاہ جہاں آباد میں مسجد بنوائی تھی اسمیں ملازمت کی۔بہت کم عمری میں ہی ان کے دانت گر گئے تھے اور

انہیں مشاعرے میں بے دانے کہا جاتا تھا۔ خان آرزو کے شاگرد تھے۔ ۱۷۷۲ء میں موت آئی۔

❁❁❁

میر مجروحؔ

چلمن کا الٹ جانا ظاہر کا بہانہ ہے
ان کو تو بہر صورت اک جلوہ دکھانا ہے (دیوان مجروح ص ۲۱)

ایک دل اور خواستگار ہزار (شہکار ص ۲۱)
کیا کروں ایک انار صد بیمار (دیوان مجروح ص ۱۳۰)

تھی وہ مجنوں کے دم ہی تک رونق
خاک اڑتی ہے اب بیاباں میں (دیوان مجروح ص ۱۸۱)

میر مہدی حسین مجروحؔ ۱۸۳۲ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ غالب کے شاگرد تھے۔ ان کی جوانی میں غالب سے اصلاح لی۔ بعد میں اصلاح کی ضرورت نہیں رہی۔ دلی کی بربادی کی وجہ سے اپنے استاد بھائی حالیؔ کے گھر چلے گئے۔ دیوان کے علاوہ مثنوی، تذکرہ طلسم راز انور الاعجاز اور دیگر مذہبی کتابیں لکھیں۔ بہت کچھ ضائع ہو گئی ہیں۔

مجروح نے غالب کو ان کے خط نہ ملنے کی شکایت کی تھی تو غالب نے لکھا تھا۔ میاں ایسے شہر میں کیوں رہتے ہو۔ جہاں کوئی دوسرا مجروح رہتا ہو۔ مجھ کو دیکھو میں دلی میں ہوں اور اکیلا ہوں۔ غالبؔ کے خطوط غالب' دلی لکھنے سے بھی وہ پہونچ جاتا تھا۔

۱۵/اپریل ۱۹۰۳ء کو پانی پت میں وفات پائی۔

دیوان مجروح مجلس ترقی اردو لاہور جونپور ۱۹۷۸ء۔ خدا بخش

❁❁❁

لطف بدایونی

رخِ مصطفیٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہماری بزمِ خیال میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں

مفتی اکرم احمد لطف بدایونی ۱۸۷۵ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حافظ غلام جیلانی بدایوں کے جانے پہچانے علماء میں سے تھے۔ ابتداء میں لطف نے اپنے والد کے زیر اثر ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ شاعری کا شوق ہوا تو منیر شکوہ آبادی سے اصلاح کی اور رفتہ رفتہ بدایوں کے معروف شعراء میں آپ کا نام آ گیا۔ آخری وقت میں آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے پھر بھی شعر لکھنا اور پڑھنا نہیں چھوڑا۔ اخلاقی اشعار تو بہت ہیں عام استادوں کا بھی رنگ ان کے یہاں ہے۔ افسوس کہ ان کے کئی دیوان ضائع ہو گئے نہیں تو اور بھی کئی اشعار ان

کے انتخاب میں ہوتے۔

٭٭٭

محمد علی تاج بھوپالی

یہ تو انسانوں کے ٹوٹے ہوئے دل ہیں ساقی
ہم سے ٹوٹے ہوئے ساغر نہیں دیکھے جاتے (ص۔ج (خیمۂ گل ص ۴۶)

ایک چھینٹا بھی کہیں دامن قاتل پہ نہیں
آپ نے میرے تڑپنے کا سلیقہ دیکھا (ا۔ر)

محمد علی تاج بھوپالی ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان چھوٹا تھا۔ والد سید رمضان علی فوجی تھے۔ خیمہ گل اور سورج نما دو شعری مجموعے شائع ہوئے۔ مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کے حامل تھے۔ رشید انجم (بھوپال) نے ان کے بارے میں بتایا کہ پہلے اسلامیہ ہوٹل کے کاؤنٹر پر بیٹھتے تھے۔ شراب نے انہیں کھالیا۔ زندگی بھر شراب پیتے رہے اور اس کے لئے انتہائی کم درجہ کے آدمی ہو جاتے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ حاجی صمد صاحب نے انہیں اور اپنی ہوٹل سنبھالنے کے لئے دیا۔ پھر کیا تھا خوب محفلیں ہوتی تھیں۔

٭٭٭

مخمور دہلوی

محبت کے لئے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا (مخمور دہلوی ص ۲۱۴)

چمن تم سے عبارت ہے بہاریں تم سے زندہ ہیں
تمہارے سامنے پھولوں سے مرجھایا نہیں جاتا (پسندیدہ اشعار ص ۱۴)

ہمارے بعد اندھیرا رہے گا محفل میں
بہت چراغ جلاؤگے روشنی کے لئے (شعرائے دلی ص ۱۱۳)

ڈاکٹر فضل الٰہی محمود دہلوی ۷ رنومبر ۱۹۰۱ء کو باغیچی اچھے جی' باڑہ ہندو راؤ, دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام حاجی نور احمد تھا جو مخمور ہومیو پیتھ کے ڈاکٹر تھے اور گھر پر ہی پریکٹس کرتے تھے۔ مخمور کی آواز بڑی سریلی تھی۔ ترنم سے شعر پڑھتے تھے۔ سامعین ان کے اشعار پر جھومتے تھے ان پر وجد طاری ہو جاتا تھا۔

بیخود دہلوی کے شاگرد تھے یعنی داغ اسکول سے وابستہ تھے۔ بیخود کے بعد سائل سے اصلاح لی, تقریبا ۲۰ برس کا شعری سرمایہ ضائع کر دیا۔ نواب صاحب پاٹوڈی نے انہیں اپنا دوست بنا لیا۔ مخمور ان کے مصاحبین میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء تک نواب صاحب کی صحبت میں کافی اچھی زندگی گزاری۔ بٹوارے کی وجہ سے دلی کی افراتفری سے مخمور صاحب کافی پریشان رہے۔ مگر اپنے بچوں کو تعلیم یافتہ بنایا

۔لڑکیوں کو بھی خوب پڑھایا۔خود بھی کافی ملنسار تھے اسی لئے شہر کے سرکردہ اشخاص سے ان کے مراسم تھے۔ برسوں تک شعر وشاعری کا سلسلہ منقطع رہا۔ بےخود دہلوی کے شاگرد ہونے کے بعد عوام میں مقبول ہوئے۔

۲۶رفروری ۱۹۵٦ءکو صبح چار بجے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

❁❁❁

جوش ملیح آبادی

یہ بات ، یہ تبسم ، یہ ناز یہ نگاہیں
آخر تمہیں بتاؤ کیونکر نہ تم کو چاہیں
کلیاتِ جوش،ص۴٦۴

سوزِ غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا
کلیات جوش ملیح آبادی،ص۴۴۷

مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا
کلیات جوش ملیح آبادی،ص۴۴۷

مہترانی ہو کہ رانی گنگنائے گی ضرور
کچھ بھی ہو جائے جوانی گنگنائے گی ضرور
کلیات جوش ملیح آبادی،ص۱۸۰

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین
کلیات جوش ملیح آبادی،ص۴۴۷

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوت حق کیلئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی
اردو کے روشن میں ار،ص۲۳۷
کلیاتِ جوش،ص۳۱۸

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب
کلیات جوش ملیح آبادی،ص۲۵۹

شبیر احمد خان جوش ۵ر دسمبر ۱۸۹۸ءکو ملیح آباد کے مرزا گنج میں پیدا ہوئے۔ان کے والد بشیر احمد خان تھے۔ملیح آباد کے رئیس تھے۔ ملیح آباد میں عربی، فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔اردو کے کئی رسالوں کے مدیر رہے اس میں ''آج کل'' کا نام بڑا اہم ہے۔حکومت نے انہیں پدم شری کا خطاب دیا۔'یادوں کی برات' لکھ کر بہت مشہور ہوئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے کافی قریب رہے۔ان کی نثر بھی کافی

دلکش تھی۔ ۲۲رفروری ۱۹۸۲ءکو اسلام آباد میں انتقال کر گئے۔

کلیاتِ جوش، مرتب عصمت ملیح آبادی، فرید بک ڈپو، ۲۰۰۷ء، مملوکہ مظاہری

❁❁❁

حفیظ جالندھری

محبت کی دنیا میں سب کچھ حسیں ہے — گلستانِ ہزار رنگ، ص ۲۱۲
محبت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے — کلیاتِ حفیظ، ص ۴۰۴

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم آ سکے — گلستانِ ہزار رنگ، ص ۱۳۶
تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمہیں بھلا سکے — کلیاتِ حفیظ، ص ۴۲۱

تشکیل و تعمیر فن میں جو بھی حفیظؔ کا حصّہ ہے — کلیات: ص ۶۵۸
یہ نصف صدی کا قصّہ ہے دوچار برس کی بات نہیں — کلیاتِ حفیظ، ص ۶۵۸

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف — غزل انسائیکلوپیڈیا، ص ۱۵۳
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی — کلیاتِ حفیظ، ص ۶۳۵

گذرے ہوئے زمانے کا اب تذکرہ ہی کیا — گلستانِ ہزار رنگ، ص ۴۶۹
اچھا گذر گیا بہت اچھا گذر گیا — جدید غزل گو، ص ۱۵۵

ارادے باندھتا ہوں، سوچتا ہوں توڑ دیتا ہوں — عشقیہ شاعری، ص ۴۲
کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو جائے — جدید غزل گو، ۱۵۷

ابوالاثر محمد حفیظ ۱۴رجنوری ۱۹۰۰ءکو جالندھر میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شمس الدین تھا۔ ان کے آباء اجداد میں سے کوئی مسلمان ہوگیا تھا۔ امریکن مشن ہائی اسکول سے ساتویں جماعت پاس کیا۔ اسلامی تربیت کی وجہ سے مزاج میں اسلامیات کا بول بالا رہا۔ تقریباً ہر پڑھا لکھا گھر حفیظ جالندھری کے اشعار سے واقف تھا۔ مجموعۂ کلام 'نغمہ زار'، 'سوز و ساز'، 'تلخابۂ شیریں'، 'چراغِ سحر' ہیں۔ اس کے علاوہ چھ مجموعے منظرِ عام پر آئے۔ ۴رجلدوں میں ۱۱ہزار اشعار پر مشتمل 'شاہنامہ اسلام' لکھا جو ان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ ایک زمانہ میں ہر دیندار گھرانوں میں اسے پڑھا جاتا تھا۔ پاکستان کا قومی ترانہ حفیظؔ نے ہی لکھا تھا۔ رسالہ 'اعجاز' نکالا۔ 'مخزن' کے بھی مدیر رہے۔

۲۱ردسمبر ۱۹۸۲ءکو لاہور میں انتقال کر گئے۔

حافظ محمد علی حفیظ کی پیدائش ۱۸۶۵ء میں جونپور میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم تقی رئیس جونپوری سے حاصل کی۔ حافظِ قرآن ہوئے۔ آپ نے کسی اسکول یا مدرسہ میں تعلیم حاصل نہیں کی۔ کتب بینی کا شوق تھا اور استادوں کی صحبت ملی۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت ہوئے۔ شاعری کے دو دیوان شائع ہوئے۔ آپ امیر مینائی کے شاگردوں میں تھے۔ آپ کے تلامذہ میں داغ جونپوری اور شفیق جونپوری کا نام اہم ہے۔ ۲۴/نومبر ۱۹۱۸ء کو آپ کا انتقال ہوگیا۔

❁❁❁

سائل دہلوی

یہ مسجد ہے یہ میخانہ، تعجب اس پہ ہوتا ہے — گلستانِ ہزار رنگ، ص ۴۴۱
جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی — غزل انسائیکلوپیڈیا، ص ۱۰۳

پوچھتا کیا ہے ترے آنے سے کیا کیا ہوگیا — علمِ مجلسی، ص ۴۳
ہاتھ بھر دل بڑھ گیا دُگنا کلیجہ ہو گیا

گماں کس پر کریں مے کش ادھر واعظ ادھر صوفی — غزل انسائیکلوپیڈیا، ص ۱۰۳
خدا رکھے محلّے میں سبھی اللہ والے ہیں

۱۸۶۷ء میں پیدائش ہوئی۔ نواب سراج الدین احمد خان سائل دہلوی حضرت داغ دہلوی کے داماد تھے۔ ایک رسالہ ''معیار الانشا'' ان کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اردو میں ترنم سے شعر پڑھنے کا رواج انہیں سے ہوا ہے۔ (ہزار رنگ، ص ۲)۔ داغ کی منہ بولی بیٹی سے شادی ہونے کی وجہ دامادِ داغ ہونے کا انہیں فخر تھا۔ ان کے شعر کی زبان اردوئے معلّٰی کی زبان مانی گئی ہے۔ حیدرآباد میں گر پڑے جس کی وجہ سے اپاہج ہوگئے تھے۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۴۵ء کو وفات پائی۔۔

❁

ثاقب لکھنوی

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا — جدید غزل گو، ص ۹۹
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے — غزلیاتِ ثاقب، ص ۴۷

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے — لکھنؤ کا دبستان شاعری، ص ۴۹۳
جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے — غزلیاتِ ثاقب، ص ۴۲

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن — جدید غزل گو، ص ۹۹
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے — غزلیاتِ ثاقب، ص ۴۳

کہاں تک جفا حسن والوں کی سہتے — جدید غزل گو، ص۹۹
جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے — غزلیاتِ ثاقب، ص۴۷

نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی — غزلیاتِ ثاقب، ص۴۷
ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے

دل اپنا خوفِ اسیری سے مطمئن کب تھا — غزلیاتِ ثاقب، ص۶۰
رہے چمن میں مگر آشیاں بنا نہ سکے

آدھی سے زیادہ شبِ غم کاٹ چکا ہوں
اب بھی اگر آجاؤ تو یہ رات بڑی ہے — غزل انسائیکلوپیڈیا، ص۱۰۵۔ غزلیاتِ ثاقب، ص۴۵

مرزا ذاکر حسین آگرہ میں ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مرزا محمد حسین تھا۔ والد کے ساتھ لکھنو آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑے انداز میں کہنا ثاقب کی شاعری کی پہچان بن گئی تھی۔ کلکتہ میں ایرانی سفیر کے سکریٹری ہوئے اور پھر ریاست محمود آباد میں نوکری کی۔ ۱۹۴۶ء میں انتقال کر گئے۔ غزلیاتِ ثاقب لکھنوی، اتر پردیش اردو اکیڈمی، ۱۹۸۳ء مملوکہ نصرت

❁❁❁

مولانا ظفر علی خاں

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی — بہارستاں، ص۲۵۹
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن — گلشنِ بہار، ص۱۱۸
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

مولانا ظفر علی خاں ۸/جنوری ۱۸۷۰ء کو کرم آباد (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی سراج الدین تھا، بی۔اے کیا۔ خلافت اور کانگریس کی تحریکوں کے قائد تھے۔ ان کی تحریک کا اصل مقصد تھا کہ کسی طرح کے ظلم کو برداشت نہ کیا جائے۔ مولانا جوشیلی تقریر کرتے تھے۔ اپنی عمر کا زیادہ تر حصّہ قادیانیوں کے خلاف بولنے اور لکھنے میں صرف کیا۔ حیدر آباد کے علاوہ ان کی ساری زندگی قید و بند میں رہی۔ اپنے والد کے رسالہ 'زمیندار' کو زندہ کر کے خود بھی زندہ ہو گئے۔ ۹۰ سال کی عمر میں ۱۹۵۶ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

بہارستان، ظفر علی خان، اردو اکاڈمی پنجاب، ۱۹۳۷ء، مومن لائبریری، D-215

❁❁❁

فراق گورکھپوری

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ۱۸۹۶ء میں گورکھپور میں پیدا ہوئے۔تعلیم الہٰ آباد میں حاصل کی۔ الہٰ آباد یونیورسٹی سے ایم ۔اے۔(انگریزی) کیا۔اور وہیں انگریزی پڑھانے لگے۔ان کے کئی مجموعے جن میں روحِ کائنات، رمزوکنایات، غزلستان، شبستاں، گل نغمہ اور روپ بطورِ خاص لائقِ ذکر ہیں۔ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ ۱۹۶۲ء میں انہیں دیا گیا تھا۔حکومتِ ہند کی جانب سے پدم بھوشن کا خطاب بھی دیا گیا۔ بعد میں ہندوستانی ادبیات کا سب سے بڑا ایوارڈ گیان پیٹھ ایوارڈ بھی دیا گیا۔فراق اردو غزل کے ایک عہد کا نام ہے وہ خود کہتے ہیں ۔

آنے والی نسلیں تم پر رشک کریں گی ہم عصرو
جب یہ دھیان آئے گا ان کو تم نے فراق کو دیکھا ہے

۳/مارچ ۱۹۸۳ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

کلیاتِ فراق گورکھپوری، مرتب: مطرب نظامی، فرید بک ڈپو، مملوکہ مولانا مظہری

❀❀❀

سیّد غلام محمد مست کلکتوی

سرخرو ہوتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد
رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد
شعرائے بنگالہ،ص۵۱۹،۵۱۸

حقیقت چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے
کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے
شعرائے بنگالہ،ص۵۱۹،۵۱۸

مٹادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گلِ گلزار ہوتا ہے
شعرائے بنگالہ،ص۵۱۹،۵۱۸

آپ کلکتہ کے بڑے کہنہ مشق اور خوش فکر شاعر تھے۔مستؔ حالیؔ کے شاگرد تھے۔آپ کے شاگردوں میں عبدالمنان صبر، محمد شفیع ارماں، محمد فخرالدین فرد اور محمد جان وحشی کے نام آتے ہیں۔مستؔ کا ذکر کسی تذکرہ میں نہیں ہے نہ ہی ان کے بارے کسی نے کوئی تحقیق کی ہے۔آپ کے بارے میں جاننے کیلئے میں نے کئی علم و ادب کے شیدائیوں کو خط لکھا۔آخر میں اپنے بزرگوار ڈاکٹر مظفر حنفی سے پوچھا تو انہوں نے شعراء بنگالہ حصّہ اوّل، صفحہ نمبر ۵۱۷ سے ۵۲۰ کی زیروکس بھجوائی جس کی روشنی میں مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

شعرائے بنگالہ میں مستؔ پر مندرجہ بالا مضمون شیخ نورالاسلام کا لکھا ہوا ہے: مستؔ ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔مست کلکتوی، وحشت کلکتوی کے ہمعصروں میں تھے۔مگر انہوں نے بہت کم عمر پائی۔مست کے آباء واجداد ایران سے ہندوستان آکر بس گئے۔مست اپنے والد کے ساتھ کلکتہ آئے۔مدرسہ عالیہ میں تعلیم حاصل کی۔۱۵/سال کی عمر میں انگریزی تعلیم کے لئے داخل کئے گئے۔مگر غریبی کی وجہ سے مدرسہ

چھوڑ دینا پڑا۔غربت میں زندگی گذاری، نام ونمود کا بھی چسکا نہیں تھا۔ان کی روزی روٹی قوالوں کو دئے گئے اشعار کا معاوضہ،انہیں جلسوں اورمیلوں میں پڑھنے کا نذرانہ اور کچھ رقم ان کے شاگردوں سے بھی ملا کرتی تھی۔قوالوں کے خاص شاعر تھے۔میں نے بچپن سے ہی ان کے برمحل اشعار کو درسی کتابوں اور عام لوگوں سے سنتے ہیں۔ان کا نہ کوئی دیوان شائع ہوا اور نہ کوئی مجموعۂ کلام۔

۱۱ راگست ۱۹۴۱ء کو ان کا انتقال ہوا۔

شعرائے بنگالہ، حصہ اوّل، مضمون: شیخ نورالاسلام، مملوکہ مظفر حنفی

❁❁❁

علّامہ اقبال

لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لئے
بجلیاں بیتاب ہوں جن کو جلانے کے لئے — کلیات اقبال، ص۹۹

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ — کلیات اقبال، ص۲۸۳

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بد ظن ہوگئے — کلیات اقبال، ص۲۸۳

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا، وہاں بے ذوق ہے صہبا — کلیات اقبال، ص۳۱۵
تھے وہ بھی دن کہ خدمت استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے

بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجئے — کلیات اقبال، ص۳۱۵

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا — کلیات اقبال، ص۱۴۱

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری — کلیات اقبال، ص۳۴

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کرگیا گلستاں،ص۲۵۰
ورنہ گلشن میں علاج ِ تنگیِ داماں بھی ہے کلیات اقبال،ص۱۹۳

ہاں دکھادے اے تصور پھر وہ صبح وشام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو کلیات اقبال،ص۲۳

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد کلیات اقبال،ص۴۱۹

زاہد ِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں باقیات اقبال،ص۹

واعظ ثبوت لائے جوے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے کلیات اقبال،ص۱۰۸

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے
نظّارے کی ہوس ہو تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے

سودا گری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر ،جزا کی تمنّا بھی چھوڑ دے گلستان ہزار،ص۴۷

اچھّا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان ِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے کلیات اقبال،ص۱۰۸

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے کلیات اقبال،ص۲۶۳

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے کلیات اقبال،ص۲۵۷

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا ا ِلہٰ الاّ اللہ کلیات اقبال،ص۴۷۷

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
کلیاتِ اقبال،ص ۷۱

سارے جہاں سے اچھا ہندو ستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اسکی یہ گلستاں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کلیاتِ اقبال،ص ۸۳

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے توخدا ہے
خاک ِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے
کلیاتِ اقبال،ص ۸۸

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں
کلیاتِ اقبال،ص ۱۰۱

دیار ِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر ِ کم عیار ہوگا
کلیاتِ اقبال،ص ۱۴۱

چین وعرب ہمارا ، ہندو ستا ں ہمارا
مسلم ہیں ہم ،وطن ہیں ساراجہاں ہما را

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام ونشاں ہمار ا

دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا
کلیاتِ اقبال، ص ۱۵۹

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل
چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں
کلیاتِ اقبال، ص ۱۰۵

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو
کلیاتِ اقبال، ص ۴۳۶

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہِ مسجد ہوں، نہ تہذیب کا فرزند

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں، بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
کلیاتِ اقبال، ص ۳۱۳

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں
تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ
کلیاتِ اقبال، ص ۹۸

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دئے گھوڑے ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں ، تو بھی تو دلدار نہیں

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کا شانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہر جائی ہے

بندۂ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہو نچے تو سبھی ایک ہوئے

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے — کلیات اقبال، ص
تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے — ۱۶۸، ۱۶۷، ۱۶۶، ۱۶۵

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم

کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں — کلیات اقبال، ص۲۰۰
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آسکتا نہیں
محو ِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی
کلیات اقبال،ص۱۹۵

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں ، طاقت ِ پر واز مگر رکھتی ہے
کلیات اقبال،ص۱۹۹

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدّن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

یو ں تو سیّدبھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو ، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

رہ گئی رسم ِاذاں ، روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقین ِ غزالی نہ رہی

وہ زمانے میں معز َز تھے مسلماں ہوکر
کلیات اقبال،ص۲۰۳،۲۰۴
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

حرم ِ پاک بھی ، اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑ ی بات تھی ہو تے جو مسلماں بھی ایک
کلیات اقبال،ص۲۰۸

حرم ِ پاک بھی ، اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑ ی بات تھی ہو تے جو مسلماں بھی ایک
کلیات اقبال،ص۲۰۲

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں
کلیات اقبال،ص۲۰۲

آج بھی ہو جو براہیم کا ا یما ں پیدا
آگ کر سکتی ہے ا نداز ِ گلستا ں پیدا
کلیات اقبال،ص۲۰۵

قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغام ِ محمد کا تمھیں پاس نہیں

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوہء طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
کلیات اقبال، ص ۲۰۶

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی
کلیات اقبال، ص ۲۰۸

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
کلیات اقبال، ص ۹۸

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تر ی آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی
کلیات اقبال، ص ۹۸

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کلیات اقبال، ص ۳۲۷

الفاظ ومعا نی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور
شعرستان، ص۴۷
کلیات اقبال، ص۴۸

وعظ میں فرمادیا کل آپ نے یہ صاف صاف
پر دہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے
کلیات اقبال، ص۲۸۲

زمِستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی
کلیات اقبال، ص۳۳۲

جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے
اسے بازوئے حیدر بھی عطا کر
کلیات اقبال، ص۳۰۱

خموش اے دل بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں
کلیات اقبال، ص۱۰۵

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو
آپ ہی گو یا مسافر ، آپ ہی منزل ہوں میں
کلیات اقبال، ص۱۰۷

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرمادے ، جو روح کو تڑپادے
کلیات اقبال، ص۲۱۲

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی
کلیات اقبال، ص۲۱۴

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورُستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
کلیات اقبال، ص۲۳۶

اس سرابِ رنگ وبو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو
کلیات اقبال، ص۲۶۲

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نو ری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
کلیاتِ اقبال،ص۲۶۸

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زور ِ بازو کا
نگاہ ِمردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
کلیاتِ اقبال،ص۲۷۱

جہاں میں اہل ِایماں صورت ِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے،اُدھر ڈوبے،اِدھر نکلے
کلیاتِ اقبال،ص۲۷۳

عمل سے زندگی بنتی ہے،جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نو ری ہے نہ ناری ہے
کلیاتِ اقبال،ص۲۷۴

گلا تو گھونٹ دیا اہل ِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا اِلٰہ الّا اللہ
کلیاتِ اقبال،ص۳۳۸

تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتاہے قوموں کا ضمیر
کلیاتِ اقبال،ص۴۷۸

اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندہ ٔ آزاد
کلیاتِ اقبال،ص۳۰۰

اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی
آئیں گے غسّال کابل سے ، کفن جاپان سے
کلیاتِ اقبال،ص۲۸۵

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ، ساز بدلے گئے
کلیاتِ اقبال،ص۴۱۵

گیا دور ِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا
کلیاتِ اقبال، ص۴۱۵

نہ تخت وتاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مرد ِ قلندر کی بار گاہ میں ہے
کلیات اقبال،ص۳۶۰

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
کلیات اقبال،ص۲۹۰

مسجد تو بنادی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے، برسوں میں نمازی بن نہ سکا

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کر دار کا غازی بن نہ سکا
کلیات اقبال،ص۲۹۱

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے
کلیات اقبال،ص۲۹۸

عروج ِآدم ِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ ِ کامل نہ بن جائے
کلیات اقبال،ص۳۰۲

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی
کلیات اقبال،ص۳۰۲

اپنے من میں ڈوب کر پاجا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن
کلیات اقبال،ص۳۲۳

خدا وندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری
کلیات اقبال،ص۳۷

چستی نے جس زمیں میں پیغام ِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر
کلیات اقبال، ص۲۹۹

پانی پانی کرگئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن
کلیات اقبال، ص۳۲۳

وہی لوگ پاتے ہیں عزت زیادہ
جو کرتے ہیں دنیا میں محنت زیادہ
باقیات اقبال، ص۲۲

عُقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں
اقبال سے ملیں، ص۴۳
کلیات اقبال ص،۴۱۲

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی
کلیات اقبال ص،۳۳۲

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے، تو نہیں جہاں کے لئے
کلیات اقبال، ص۳۴۱

ذراسی بات تھی، اندیشۂ عجم نے اسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لئے
کلیات اقبال، ص۳۴۱

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
کلیات اقبال، ص۳۴۸

اگر ہو تا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھا تا مقامِ کبریا کیا ہے
کلیات اقبال، ص۳۴۸

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہے پرواز میں کوتا ہی
کلیات اقبال، ص۳۴۸

آئینِ جواں مرداں ، حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی
کلیاتِ اقبال،ص۳۴۹

عقل عیّار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ ملّا ہے نہ زاہد نہ حکیم
کلیاتِ اقبال،ص۳۵۲

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
کلیاتِ اقبال،ص۳۵۳

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات
کلیاتِ اقبال،ص۳۷۱

یہ شہادت گہہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہے مسلماں ہونا
باقیاتِ اقبال،ص۱۳

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
کلیاتِ اقبال،ص۷۰

مجھے روکے گا تو اے نا خدا کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں
کلیاتِ اقبال،ص۱۰۴

جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں
کلیاتِ اقبال،ص۱۰۳

اٹھّو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
کلیاتِ اقبال،ص۴۰۱

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کلیاتِ اقبال،ص۴۰۲

دِہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں ، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں ،میری نہیں
کلیات اقبال،ص۴۱۱

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ ،فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
کلیات اقبال،ص۴۲۴

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر
کلیات اقبال،ص۴۳۹۔۱۴۷

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر
کلیات اقبال،ص۴۳۹

ہرلحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
کلیات اقبال،ص۵۲۲

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
کلیات اقبال،ص۹۴

قوم کیا چیز ہے،قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دورکعت کے امام
کلیات اقبال،ص۴۸۷

بتوں سے تجھ کوامیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کا فری کیا ہے
کلیات اقبال،ص۳۴۰

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
کلیات اقبال،ص۶۵۴

تڑپ کے شان کریمی نے لے لیا بوسہ
کہا جو سر کوجھکا کر گناہ گار ہوں میں
باقیات اقبال،ص۱۴

حسرت نہیں کسی تمنا نہیں ہوں میں
مجھ کو نکا لئے گا ذرا دیکھ بھال کے
باقیات اقبال، ص۱۳۳

تجھے کیوں فکر ہے اے گل دلِ صد چاکِ بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے
کلیات اقبال، ص۲۴۸

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزار وں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبیں نیاز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں
کلیات اقبال، ص۲۸۱

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہہِ افلاک
کلیات اقبال، ص۴۵۴

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی
کلیات اقبال، ص۳۴۸

عشق کی اک جست نے طے کردیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں
کلیات اقبال، ص۳۱۰

گلزارِ ہست وبود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
کلیات اقبال، ص۹۸

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا
کلیات اقبال،ص ۱۸۶

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی
کلیات اقبال،ص ۳۰۶

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ
کلیات اقبال،ص ۳۰۷

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا
بال جبریل،ص ۔۔

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری
بیت بازی،ص ۷۰
کلیات اقبال،ص ۶۸

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
بیت بازی،ص ۶۹
کلیات اقبال،ص ۲۷۲

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر چھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
کلیات اقبال،ص ۲۷۴

زندگی جزو کی ہے کل میں فنا ہوجانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہوجانا
اقبال و مشاہیر،ص ۱۸۷۔۔۔۔

وہ دانائے سبل ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
کلیات اقبال،ص ۳۱۷

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
کلیات اقبال،ص ۴۶

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں
کلیات اقبال،ص ۱۴۸

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
کلیاتِ اقبال،ص ۲۷۸

کھو دئے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو
کلیاتِ اقبال،ص ۴۳۶

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات
کلیاتِ اقبال،ص ۴۴۹

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کا شغر
کلیاتِ اقبال،ص ۲۶۵

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عَرَقِ انفعال کے
باقیاتِ اقبال،ص ۱۳

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ
کلیاتِ اقبال،ص ۲۶۶

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں
کلیاتِ اقبال،ص ۳۳۵

حقیقت خُرافات میں کھوگئی
یہ امت رِوایات میں کھوگئی
اردو کے روشن مینار،ص ۱۴۶
کلیاتِ اقبال،ص ۴۱۵

گر کبھی خَلوَت میسر ہوتو پوچھ اللہ سے
قصّہ آدم کو رنگیں کرگیا کس کا لہو
اردو کے روشن مینار،ص ۱۴۳
کلیاتِ اقبال،ص ۴۳۶

پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر
کلیاتِ اقبال،ص ۲۹۵

مری مشا طگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی
کلیات اقبال،ص۳۰۶

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پا بندی
کلیات اقبال،ص۳۰۶

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بر بادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں
کلیات اقبال،ص۷۱

نہیں ہے چیز نکّمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں
کلیات اقبال،ص۳۱

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں و اللہ نہیں ہے
کلیات اقبال،ص۶۰

جھپٹنا پلٹنا ، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
کلیات اقبال،ص۴۵۷

سبق پھر پڑھ صداقت کا ،عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی اما مت کا
بیت بازی،ص۷۱
کلیات اقبال،ص۲۷۰

اٹھائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
بیت بازی،ص۷
کلیات اقبال،ص۶۸

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے
کلیات اقبال،ص۴۱۶

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثل ِ بلالِ حبشی رکھتے ہیں
کلیات اقبال،ص۱۶۸

لکھی جائیں گی کتاب ِ دل کی تفسیریں بہت
ہونگی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت
آوارہ،ص۹۵۔کلیات اقبال،ص۹۰

جہاں بنی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں — کلیات اقبال،ص ۳۷۸

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکام ِ الٰہی کا ہے پابند — کلیات اقبال،ص ۵۲۶

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں — کلیات اقبال،ص ۵۴۴

ہر لحظہ نیا طور ،نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے — کلیات اقبال،ص ۵۸۹

ہند کے شاعر و صورت گرو ،افسانہ نویس
آہ بے چارو ں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار — کلیات اقبال،ص ۵۹۱

جمہوریت اک طرز ِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے — کلیات اقبال،ص ۶۱۱

اے باد ِ صبا کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا — کلیات اقبال،ص ۲۷۷

علاّمہ اقبال ایک عبقری نابغہ اور جینیس شاعر تھے۔انہوں نے شاعری برائے شاعری نہیں کی بلکہ شاعری کو پیغمبری کے درجہ تک پہنچانے کی سعی کی ۔مشرق اور مغرب کے قدیم و جدید فلاسفہ پر ان کو ناقدانہ عبور تھا۔حالات کو بدلنے کیلئے انہوں نے اپنی اردو، فارسی شاعری اور انگریزی خطبات میں جو کچھ لکھا وہ غیر فانی سرمایہ بن گیا ہے۔ان کا شمار دنیا کے بڑے فلاسفروں میں ہوتا ہے۔علاّمہ اقبال ۲۹رنومبر ۱۸۷۳ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔شمش العلماء مولانا سیّد میر حسن سے عربی اور فارسی پڑھی۔سیالکوٹ میں ہی میٹرک تک کی تعلیم حاصل کی۔اعلیٰ تعلیم کیلئے لاہور گئے۔۱۸۹۷ء میں بی اے کیا۔فلسفہ میں ایم اے کیا۔۱۹۰۵ء میں انگلینڈ گئے وہاں سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور جرمنی سے پی ایچ ڈی کر کے ۱۹۰۸ء میں ہندوستان واپس آئے۔دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں نے انہیں ڈی لٹ کی ڈگری عطا کی۔مختلف زبانوں میں آپ کے کلام کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

۲۱راپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں آپ اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

کلیاتِ اقبال، دیباچہ شیخ عبدالقادر، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دلّی، ۱۹۸۱ مملوکۂ نصرت

❁❁❁

علّامہ آرزو لکھنوی

وہ تند ہواؤں پر بنیاد ہے طوفاں کی
یا تم نہ حسیں ہوتے یا میں نہ جواں ہوتا — فغانِ آرزو، ص ۴۶

نہ سوچا نہ سمجھا نہ دیکھا نہ بھالا
جیو تم کو چاہا جسے مار ڈالا — دبستان لکھنؤ ۸۴۰

جس نے بنائی بانسری
گیت اسی کے گائے جا — گلستانِ ہزار رنگ، ص ۵۸

سانس جب تک آئے جائے — سریلی بانسری، ص ۳
ایک ہی دھن بجائے جا

آرام کے تھے ساتھی کیا کیا، جب وقت پڑا تھا کوئی نہیں — دبستانِ لکھنو، ص ۸۲۹
سب دوست ہیں اپنے مطلب کے دنیا میں کسی کا کوئی نہیں — فغانِ اردو، ص ۱۲۸

دفعتاً ترکِ تعلق میں بھی رسوائی ہے — فغانِ آرزو، ص ۹۵
الجھے دامن کو چھڑاتے نہیں جھٹکا دے کر

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ چھٹکا پانی — گلستانِ ہزار رنگ، ص ۱۲۴
جھوم کے آئی گھٹا، ٹوٹ کے برسا پانی — سریلی بانسری، ص ۸۹

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر — خوبصورت اشعار، ص ۶
ٹوٹ کے اتنا برسا بادل ڈوب چلا مے خانہ بھی — گلستانِ ہزار رنگ، ص ۴۳۶

مولوی سیّد انوار حسین آرزو ۱۶ر فروری ۱۸۷۳ء کو بارہ دری لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد اور بھائی بھی شاعر تھے۔ اس لئے گھر میں بھی شاعرانہ ماحول ملا۔ آرزو جلال کے شاگرد تھے۔ اس طرح ان کا سلسلہ ناسخ سے ملتا ہے۔ جلال کے جانشین بھی ہوئے۔ ان کے بڑھاپے سے ہی آرزو نے جلال کے شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح دینے لگے۔ ایک نئے رنگ کی ایجاد کی جس کیلئے انہوں نے کہا تھا کہ نہ وہ میؔر کے مقلّد ہیں اور نہ غالب کے۔ لہجے میں انکساری اور متانت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ انہیں اپنے منصب پر کبھی غرور نہیں آیا۔ مشاعرے میں ترنم سے پڑھتے تھے۔ کلکتہ اور بمبئی کی فلم انڈسٹری سے ان کا لگاؤ تھا۔ کئی فلموں میں کامیاب گیت لکھے ہیں۔ ادب کی دنیا کے مشہور محقق پروفیسر مجاہد حسین نے ان کے فن اور شاعری پر اچھی تحقیق کی ہے۔ آرزو کا دیوان، فغانِ آرزو، جانِ آرزو، سریلی بانسری ہیں۔ آرزو کے کئی کامیاب شاگرد تھے۔ محمود سروش، احسن داناپوری، حضرت بیتاب نظام پوری ان میں سے خاص تھے۔ ہجرت کر کے کراچی چلے

گئے اور وہیں ۱۶/اپریل ۱۹۵۱ء کو انتقال کر گئے۔

(سریلی بانسری، از: آرزو لکھنوی، ناشر، شیخ نذیر احمد، تاج آفس، مومن لائبریری، D-182............فغانِ اردو، از: آرزو لکھنوی، اشاعتِ اردو، حیدر آباد، مومن لائبریری، D-133)

شوکت علی خاں فانی بدایونی ۱۳ستمبر ۱۸۷۹ء کو اسلام نگر، بدایوں میں پیدا ہوئے۔ان کے جد اعلیٰ کابل سے آکر ہندوستان میں بس گئے تھے۔۱۹۰۸ میں علی گڑھ سے ایل۔ایل۔بی کرنے کے بعد لکھنو آئے۔وکالت شروع کی لکھنو، بریلی اور آگرہ میں وکالت کی مگر کامیاب نہیں ہو سکے۔انہوں نے یہ پیشہ چھوڑ دیا مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کی دعوت پر حیدر آباد گئے وہاں صدر مدرس بنے، مہاراجہ کس پرشاد شاؔدان کی ہمیشہ مدد کرتے رہے۔شہزادہ معظم جاہ کے استاد بھی رہے۔اسلئے انہیں کافی شہرت ملی۔مطبوعات میں دیوان فانی، باقیات فانی، کلیاتِ فانی، عرفانیات فانی اور وحدانیات فانی اہم ہیں آخری ایام بڑی کسمپرسی میں گزرے۔۲۷/اگست ۱۹۴۱ کو ان کا انتقال ہو گیا۔

کلیاتِ فانی، قومی کونسل، نئی دلّی ۱۹۹۹ (دوسرا ایڈیشن) مملوکۂ نصرت۔

❁❁❁

لالہ مادھو رام جوہر

بھانپ ہی لیں گے اشارہ سرِ محفل جو کیا
تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں
انتخابِ کلامِ جوہر، ص ۳۱

اب عطر بھی ملو تو تکلف کی بو کہاں
وہ دن ہوا ہوئے جو پسینہ گلاب تھا
انتخابِ کلامِ جوہر، ص ۲۰

نالۂ بلبل شیدا تو سنا ہنس ہنس کر
اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی
انتخابِ کلامِ جوہر، ص ۵۳

لالہ مادھو رام جوہر خلف جواہر مل، ساہوکار، محلّہ رستوگیان (فرخ آباد) میں ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔شاہی دربار کے ملازم تھے۔ان کی پرورش شاعرانہ ماحول میں ہوئی۔ان کے گھر شاعروں اور ادیبوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ان کے استاد منیر شکوہ آبادی بھی کئی سال تک ان کے گھر پر رہے۔ظاہر ہے ایسے میں کسی شاعر کی پرورش کا کیا کہنا۔۱۹۳۶ء میں انتقال کر گئے۔

انتخاب کلام: لالہ مادھو رام جوہر، مرتبہ: راجندر بہادر گوڑ، اتر پردیش، اردو اکاڈمی، کتب خانہ: خدا بخش

❁❁❁

سیماب

مرکز پہ اپنے دھوپ سمٹتی ہے جس طرح
یوں رفتہ رفتہ تیرے قریب آ رہا ہوں میں
سیماب، حامد اقبال، ص ۱۴۲، سدرۃ المنتہیٰ، ص ۷۶

قطرہ دریا ہے اگر شاملِ دریا ہو جائے
ذرہ اس بھید کو پا جائے تو صحرا ہو جائے
سدرۃ المنتہیٰ، ص ۱۷۰

ہے حصولِ آرزو کا راز ترکِ آرزو
میں نے دنیا چھوڑ دی تو مل گئی دنیا مجھے
ج۔کا۔کلیم عجم، ص ۲۱۰

خلوصِ دل سے جو سجدہ ہوا اس سجدے کا کیا کہنا
وہیں کعبہ سرک آیا ، جبیں ہم نے جہاں رکھ دی
ص۔ص۔کلیمِ عجم، ص ۲۰۴

منزل ملی مراد ملی ، مدعا ملا
سب کچھ مجھے ملا جو ترا نقشِ پا ملا
گلستانِ ہزار رنگ، ص ۸۸
کلیمِ عجم، ص ۳۷

ہر چیز پر بہار، ہر ایک شئے پہ حسن تھا
دنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب میں
پیارے پیارے شعر، ص ۱۰۰

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں
اک آئینہ تھا، ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں
غزلستان، ص ۹۰۔کلیم عجم، ص ۹۹

کہانی مری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے
کلیم عجم، ص ۱۳۹

عمرِ دراز مانگ کے لائی تھی چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
کلیم عجم، ص ۲۲۸

یہ کس نے شاخِ گل لا کر قریبِ آشیاں رکھ دی
کہ میں نے شوقِ گل بوسی میں کانٹوں پہ زباں رکھ دی
کلیم عجم، ص ۲۰۴

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگ جاں پر
کلیم عجم، ص ۶۸

حامد اقبال صدیقی اپنے مونوگراف میں لکھتے ہیں کہ سیماب نے تقریباً ۳۰۰ سے زیادہ کتابیں لکھیں جن میں نصف سے زیادہ اشاعت سے محروم رہ گئیں۔ ملک کے بہت سے محققوں نے ان کی زندگی پر کتابیں لکھی ہیں۔'' کئی یونیورسٹیوں میں سیماب پر ادبی مقالے تحریر کئے گئے ہیں۔ رسالوں نے ان کے نام کے نمبر نکالے ہیں۔ ان کے تقریباً ۳۰۰۰ شاگرد ہندوستان اور ہندوستان سے باہر پھیلے ہوئے ہیں۔ عاشق حسین سیماب ۱۸۸۰ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام چودھری نبی بخش تھا۔ ڈاکٹر سیّد بشیر احمد لکھتے ہیں: ''سیماب نے فارسی، عربی، منطق اور اصول میں مہارت حاصل کی تھی۔

آغا حشر کی پیدائش ۳/اپریل ۱۸۷۹ء کو ناریل بازار، دال منڈی، بنارس میں ہوئی۔ مے نوش تھے مگر غالب کی طرح مذہب بیزار نہیں تھے۔ مسلمانوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کی۔ غالب کی طرح ان کا بگڑا ہوا ذہن نہیں تھا۔ غالب نے کہا تھا شراب پیتا ہوں مگر سور کا گوشت نہیں کھاتا۔ آپ کے والد آغا غنی شاہ کشمیری شال کے تاجر تھے۔ بنارس میں آ کر بس گئے۔ حشؔر نے مرزا محمد حسن فائز سے اصلاح لی۔ ایک شعری بیاض چوری ہوگئی۔ ڈرامہ لکھے اور اس کو اسٹیج کیا۔ ہندی ڈرامے بھی لکھے۔ اردو ادب میں ان کے ڈرامے کو دیکھ کر انہیں شیکسپیئر کے نام سے نوازا گیا۔ کلکتہ، ممبئی اور بنارس میں رہے۔

ان کا ڈرامہ رستم وسہراب بہت کامیاب ڈرامہ تھا۔ ان کے کئی ڈرامے کی فلمیں بھی بنی۔ شیریں فرہاد اور یہودی کی لڑکی، عورت کا پیار، شرون کمار اور رستم وسہراب وغیرہ خاص ہیں۔ ۲۵/اپریل ۱۹۳۵ء میں انتقال کر گئے۔

تجلیات حشر، مرتبہ سید سفیل احمد بدر امروہوی، تاج کمپنی لمیٹیڈ، لاہور، ۱۹۴۴ء، مملوکہ اے جی انعامدار۔

❁❁❁

فانؔی بدایونی

روز بڑھتی ہی رہی اک آرزو — ساہتیہ اکیڈمی، ص۸۴
روز ترکِ آرزو کرتے رہے — کلیات فانی، ص۳۳۰

ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میت فانی — گلستان، ص۳۲۹
زندگی نام ہے مرمر کے جئے جانے کا — کلیاتِ فانی، ص۵۱

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا — گلستان، ص۳۲۹
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا — کلیاتِ فانی، ص۵۱

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہونچی تری جوانی تک — کلیات فانی، ص۱۱۸

دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم — گلستان، ص۱۰۸
بستی بسنا کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے — کلیات فانی، ص۱۸۹

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے — م۔ا۔م
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ — کلیات فانی، ص۱۵۵

دنیا مری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے — ساہتیہ اکیڈمی، ص۸۶
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے — کلیات فانی، ص۱۸۹

آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے — کلیات فانی، ص۱۸۹

جینے بھی نہیں دیتے مرنے بھی نہیں دیتے — جدید غزل، ص۱۹۸
کیا تم نے محبت کی ہر رسم اٹھا ڈالی. — کلیات فانی ص۱۹۱

فانی ؔ دکن میں آ کے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور — کلیات فانی، ص۱۰۷

اک فسانہ سن گئے اک کہہ گئے — جدید غزل، ص۱۹۸
میں جو رویا مسکرا کے رہ گئے — کلیات-----

یارب تری رحمت سے مایوس نہیں فانی — گلستاں، ص۶۸
لیکن تری رحمت کی تاخیر کو کیا کہئے — کلیات فانی، ص۲۰۷

اچھا یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ — گلستان، ص۴۸۰
اک تو ہی نا خدا نہیں ظالم خدا بھی ہے — کلیات فانی، ص۱۸۲

پھولوں سے تعلق تو اب بھی ہے مگر اتنا — جدید غزل، ص۱۹۸
جب ذکرِ بہار آیا سمجھے کہ بہار آئی — کلیات--

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم — گلستان، ص۶۸
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم — کلیات فانی، ص۱۲۹

علی گڑھ سے بی۔اے کی ڈگری لی وہیں سے سرسید کی تحریک میں میں شامل ہوئے۔فرنگی محل سے انہیں مولانا کی اعزازی سند حاصل ہوئی۔نسیم کے شاگرد تھے حسرت بحیثیت نقاد بھی مشہور تھے۔اردو معلیٰ میں انہوں نے تنقید لکھ کر اردو غزل کو فروغ دیا۔حسرت نے خود ہی ۱۹۴۳ میں اپنا کلیات مرتب کیا ان کے تیرہ دیوان شائع ہوئے لیکن بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔۱۳رمئی ۱۹۰۱ کو انتقال کر گئے۔

کلیات حسرت، کتاب منزل، لاہور بار اول ۱۹۵۵ مومن لائبریری D-47

❁❁❁

سعید احمد ناطق

کہہ رہا ہے شورِ دریا سے سمندر کا سکوت — جدید غزل گو، ص ۲۴۷
جس میں جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

اے شمع تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح — جدید غزل، ص ۲۴۸
میں نے تمام عمر گذاری ہے اس طرح

عشق کی خاطر سے انساں عشق کے قابل بنا — جدید غزل گو، ص ۲۴۹
درد پہلے بن چکا تھا بعد اس کے دل بنا

میکشو مے کی کمی بیشی پہ نا حق جوش ہے — شعرستاں، ص ۴۶۵
یہ تو ساقی جانتا ہے کس کو کتنا ہوش ہے — جدید غزل گو، ص ۲۴۷

سیّد ابوالکلام حکیم سعید احمد، والد کا نام واسطی بلگرامی۔ ۱۸۷۸ء میں لکھنو میں پیدا ہوئے۔امیر مینائی کے شاگرد تھے۔طبابت کرتے تھے۔حکیم ناطق کا، مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کے دربار میں آنا جانا تھا۔کانپور میں مطب تھا۔نواب رام پور سے بھی آپ کا لگاؤ تھا۔شاعر کے علاوہ تنقید نگار بھی تھے۔۹ر اکتوبر ۱۹۵۰ء کو چاٹگام میں انتقال کر گئے۔

جدید غزل گو، (تذکرہ بخطِ شاعر ۱۹۴۱ء)، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ء، مملوکہ نصرت

❁❁❁

مولانا محمد علی جوہر

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے — جذباتِ جوہر، ص ۶
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

تو حید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لئے ہے
جذباتِ جوہر،ص۱۲

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں
گنجینۂ جوہر،ص۸۸

پیغام ملا تھا جو حسین ؑ ابن علیؑ کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لئے ہے
جذباتِ جوہر،ص۱۲
تاریخ ادب اردو،ص۱۳۹۱

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے
جذباتِ جوہر،ص۱۲
بیت بازی،ص۹۹

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلا یا مگر
مر کے جوہرؔ آپ کے جوہر کھلے
جذباتِ جوہر،ص۱۲
گنجینۂ جوہر،ص۳

مولانا محمد علی جوہر ۱۰ ستمبر ۱۸۷۸ کو رامپور پیدا ہوئے۔ مولانا جوہر ہندوستانی تحریکِ آزادی کے ہیرو تھے۔ ان کو بین لاقوامی حیثیت کا انقلابی رہنما کہا گیا ہے اردو اور انگریزی کے مستند ادیب تھے۔ اردو کے اچھے شاعر تھے تقریر اس طرح کرتے تھے جسے سن کر ہر کوئی یہ کہے گویا یہ بھی میرے دل میں ہے ۱۹۰۴ میں آکسفورڈ سے بی اے کیا۔ ہندوستان آنے کے بعد عملی طور پر سیاست میں حصّہ لیا۔ کلکتہ سے ''ہمدرد'' نکالا اسکے ذریعہ قوم وملت کی خوب خدمت کی۔ سیاست میں حصہ لینے کے باوجود قول وفعل میں تضاد نہیں تھا جو کہا وہ کر دکھایا۔ ہندوستان کی آزادی کیلئے لندن کے گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ ۴ رجنوری ۱۹۳۱ میں لندن میں ہی انتقال کر گئے۔ فلسطین کی سرزمیں میں دفن ہوئے۔

(جذباتِ جوہر، سوراج پرنٹنگ ورکس دہلی، انجمن اسلام، 4241۔۔ گنجینۂ جوہر، محراب ادب کراچی، مرتب دوست قدوائی انجمن 4214)

❁❁❁

بیدم وارثی

دینے والے تجھے دینا ہے تو اتنا دے دے
کہ مجھے شکوۂ کوتاہیِ داماں ہو جائے
گلستاں ہزار رنگ،۷۵
غزل انسائیکلوپیڈیا،ص۱۷۸

تم جو چاہو تو مرے درد کا درماں ہو جائے
ورنہ مشکل ہے کہ مشکل مری آساں ہو جائے
غزل انسائیکلوپیڈیا،ص۱۷۸

نام سراج الدین اور تخلص بیدم ہے۔آپ کی پیدائش ۱۸۷۶ء میں اٹاوہ میں ہوئی۔نثار اکبرآبادی جو وحید الہ آبادی کے شاگرد تھے۔ان سے تلمذّ حاصل کیا اور آتش اسکول کے نامی گرامی معرفت نگار شاعر بنے۔حضرت حاجی وارث علی شاہ صاحب سے بیعت حاصل کی۔۱۹۰۵ء میں حاجی وارث علی کا انتقال ہوگیا۔ان کے انتقال کے بعد آپ کی شاعری نے نیا موڑ لیا۔آپ کا یہ معمول تھا کہ جب کوئی تازہ غزل کہتے پہلے مرقدِ وارث پر سنا آتے اس کے بعد دوسروں کو سناتے۔آپ کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔۱۹۳۶ء میں حسین گنج لکھنو میں انتقال ہوا۔

غزل انسائیکلوپیڈیا،از: ذکی کاکوروی،۱۹۶۲ء،مملوکہ نصرت

❁❁❁

حسرت موہانی

آئینہ میں دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے
جدید غزل،ص۱۴۶۔۔کلیات حسرت،ص۱۴۶

کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر
ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا
غزل انسا،ص۱۱۳ ۔۔کلیات حسرت،ص۱۴۸

بھلا تا لاکھ ہوں لیکن برا بر یادآتے ہے
الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یا د ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آ تے ہیں
ایوان،ص۱۹۹۲۔۔کلیات حسرت،ص۲۶

جب سے دیکھی ابو الکلام کی نثر
نظم حسرت میں بھی مزہ نہ رہا
کلیات حسرت،ص۱۵۱

شعر در اصل ہیں وہی حسرت
سنتے ہی دل میں جو ا تر جائیں
کلیات حسرت،ص۲۷

توڑ کر عہد ِکرم نہ آشنا ہوجایئے
بندہ پرور جایئے اچھا خفا ہوجایئے
ایوان اردو۱۹۹۲ء۔کلیات حسرت،ص۳۴

حسنِ بے پروا کو خود بین خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا
ایوان،ص۱۹۹۲۔کلیات حسرت،ص۳۴

عشق میں جان سے گذر جائیں
اب یہی جی میں ہے کہ مرجائیں
لکھنو دبستاں،ص۲۴۶۷۔کلیات حسرت،ص۲۷

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں ناز کرے
غزل،ص۱۱۵۔کلیات حسرت،ص۲۹

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے
گلستان،ص۱۱۰۔کلیات حسرت،ص۲۹

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کردیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
غزل،ص۱۱۵۔کلیات حسرت،ص۲۹

واں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب
آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی
غزل،ص۱۱۴۔کلیات حسرت،ص۸۵

دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا
غزل،ص۱۱۳۔کلیات حسرت،ص۱۲۳

ہے مشق ِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبعیت بھی
لکھنو،ص۷۶۰۔کلیات حسرت،ص۳۲

حسرت موہانی ۱۸۷۸ء میں اناؤ کانپور میں پیدا ہوئے۔حسرت کا نام غزل گو شعراء میں بڑی اہمیت رکھتا ہے وہ ایک کھرے اور حق پرست سیاست داں بھی تھے۔وہ بیک وقت مشق سخن کرتے تھے اور آزادی کے متوالوں کی طرح انھوں نے جیل کی اذیتیں بھی اُٹھائی۔انہوں نے سات ہزار شعر کہے ہیں۔مولانا نے ۱۳ سال کی عمر میں ۱۸۹۳ میں پہلی غزل کہی اور آخری غزل ۱۹۵۰ میں۔

❀❀❀

سودا

مرزا محمد رفیع سودا والد کا نام مرزا محمد شفیع نسلاً کابلی تھے۔ مصاحبت کرتے تھے۔ پیدائش ۱۷۰۶ء شاہ جہاں آباد میں ہوئی۔ بڑی خوشحالی میں زندگی گذاری۔ ابتداء میں قلی خان وداد اور بعد میں شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ بچپن سے ہی شعر کہنے لگے تھے۔ سودا اپنے قصیدے کی وجہ سے زیادہ مشہور تھے۔ پھر بھی غزلوں میں ان کا ایک خاص مقام تھا۔ وہ بڑے قادرالکلام تھے۔ بڑے غیور اور وضع کے پابند تھے۔ اپنی روزی روٹی کیلئے دلّی سے فرخ آباد، فیض آباد اور پھر لکھنو آئے۔ لکھنو میں نواب آصف الدولہ کے دربار سے منسلک ہوئے اور آخری وقت تک رہے۔

۷۵ برس کی میں ۱۷۸۱ء میں لکھنو میں انتقال ہوا۔

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا
موسیٰ نہیں کہ سیر کروں کوہِ طور کا — کلیاتِ سودا، ص۳

آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا — تذکرۂ ہندی، ص۱۳۶
کچھ آگ بچ رہی تھی کہ عاشق کا دل بنا — کلیاتِ سودا، ص۲۴

فکر معاش و عشق بتاں یادِ رفتگان — تذکرہ میر حسن، ۹۳
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے — کلیاتِ سودا، ص۲۱۰

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ — غزل نما، ص۳۷۔ کلیاتِ سودا، ص۲
دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

سمجھے تھے ہم جو دوست تجھے اے میاں غلط — شعروں کا کھیل، ص۱۷۱
تیرا نہیں ہے جرم ہمارا گماں غلط — کلیاتِ سودا، ص۸۷

خدا دشمنوں کو نہ وہ کچھ دکھاوے — کلیاتِ سودا، ص۱۰۸
جو کچھ دوست اپنے سے ہم دیکھتے ہیں

نے رستم اب جہاں میں نے سام رہ گیا
مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا
کلیاتِ سودا، ص ۳۷

یارب کہیں سے گرمئی بازار بھیج دے
دل بیچتا ہوں کوئی خریدار بھیج دے
کلیاتِ سودا، ص ۱۶۲

ترے خط آنے سے دل کو مرے آرام کیا ہوگا
خدا جانے کہ اس آغاز کا انجام کیا ہوگا
کلیاتِ سودا، ص ۱۲

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی
کلیاتِ سودا، ص ۲۰۷

سودا خدا کے واسطے کر قصّہ مختصر
اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانے میں
کلیاتِ سودا، ص ۱۲۱

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپھے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں
کلیاتِ سودا، ص ۱۲۱

ظالم میں کہہ رہا ہوں کر اس خوں سے درگذر
سودا کا قتل ہے یہ چھپا یا نہ جائیگا
کلیاتِ سودا، ص ۱۳

کلیاتِ سودا، اصل نسخہ ۱۸۷۳ء، مطبع نول کشور ۱۹۱۲ء، مومن لائبریری D-217

❁❁❁

میر محمد بیدار

نہ میکدے سے کام نہ مطلب حرم سے تھا　　غزل انسائیکلوپیڈیا،ص۵۲
محوِ خیالِ یار رہے ہم جہاں رہے　　دلی کا دبستان شاعری،ص ۳۰۸

میر محمد علی نام میر محمدی کے نام سے مشہور ہوئے۔ فارسی میں مرتضیٰ قلی بیگ فراقؔ اور اردو میں دردؔ کے شاگرد تھے۔ بیعت مولانا فخر الدین سے تھی۔ درویش آدمی تھے۔ میر و مرزا کے مانند صناّعیٔ کلام کے دلدادہ تھے۔ تصوف کا رنگ بھی ہے۔ آخر عمر میں دہلی سے آگرہ چلے گئے۔ اور وہیں ۱۷۹۴ء میں وفات پائی۔　　دلّی کا دبستانِ شاعری، ۳۰۸

شاہ محمد نصیر دہلوی

دیکھ لیتی جو اُٹھا کر ترے کیا ٹوٹتے ہاتھ[1]　　آوارہ گرد اشعار 61
لیلیٰ ایسا تو نہ تھا پردۂ محمل بھاری

پیدائش 1775 میں ہوئی۔ پورا نام سیّد محمد نصیر الدین عرف کلّو تھا۔ عرفیت ان کے کالے پن کی وجہ سے تھا۔ ظفرؔ اور ذوقؔ کے استاد تھے۔ دلّی کے رہنے والے تھے۔ شاہ محمدی مائل کے شاگرد تھے۔ بادشاہ شاہ عالم کے دربار سے وابستہ رہے۔ حیدرآباد کا رُخ کیا اور وہیں 1840 میں انتقال کر گئے۔ دلّی بھی آتے جاتے رہے۔ دلّی، حیدرآباد اور لکھنؤ تینوں جگہوں پر شعراء ان کے استاذی کے قائل تھے۔
حیدرآباد گئے اور وہیں ۱۸۴۰ء میں انتقال کر گئے۔

[1] اک نظر دیکھنے سے ٹوٹ نہ جاتے ترے ہاتھ

❁❁❁

نواب مرزا شوق لکھنوی

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ، کل ہماری باری ہے

اب نہ رستم نہ سام باقی ہے
اک فقط نام ہی نام باقی ہے

عمر بھر کون کس کو روتا ہے
کون صاحب کسی کا ہوتا ہے　　مثنوی زہرِ عشق

مشورے ہو رہے ہیں آپس میں
بھیجتے ہیں مجھے بنارس میں

مثنوی زہرِ عشق

مخربِ اخلاق

اونچے اونچے مکان تھے جن کے
آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے

لکھنؤ کا دبستان، ص ۵۶۷۔۵۶۸

پیدائش ۱۷۸۳ء میں لکھنو میں ہوئی۔ یہ آصف الدولہ کا زمانہ تھا۔ پورا نام حکیم تصدق حسین خان نواب مرزا شوقؔ۔ والد کا نام آغا علی خان ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ اودھ میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھے۔ بادشاہ کی طرف سے ''حکیم الملک'' کا خطاب ملا تھا۔

ان کا پورا خاندان حکمت کے پیشے سے منسلک تھا۔ شوق خود بھی مشہور حکیم تھے۔ ان کے چچا مرزا علی خان لکھنو کے مشہور حکیموں سے تھے۔ شوقؔ، نواب واجد علی شاہ کے بہت ہی قریبی تھے۔ انہیں تنخواہ کے علاوہ کئی انعامات سے نوازا گیا۔ شوقؔ نے آٹھ حکمرانوں کا زمانہ دیکھا تھا۔ آتشؔ کے شاگردوں میں سے تھے۔ اُن کے زمانے میں آتشؔ کا بڑا بول بالا تھا۔

شوقؔ لکھنوی اسکول کے ممتاز مثنوی نگار تھے۔ ان کی مثنوی کو ڈرامے کی شکل میں تیار کیا جا چکا ہے۔ ۲۵/جون ۱۸۷۱ء بروز جمعہ لکھنو ہی میں فوت ہو گئے۔

❁❁❁

شاد لکھنوی

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

غزل نما، ص ۴۵۰

شیخ محمد جان شاد، ۱۸۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام وارث علی تھا جو اودھ کی سرکار میں ملازم تھے۔ شادی نہیں کی، بڑی کسمپرسی میں زندگی گذری۔ لکھنؤ کے حالات بگڑے تو شعراء پر بھی اس کا اثر ہوا۔

میر کلّو عرشؔ کے شاگرد ہوئے اور انہوں نے انہیں پیر و میر سے مشہور کیا۔ دیوان شائع ہو چکا ہے۔ ۱۸۹۹ء میں موت آئی۔

❁❁❁

سعادت یار خان رنگین

تا حشر رہے یہ داغ دل کا
یارب نہ بجھے چراغ دل کا

دبستان لکھنؤ، ص ۳۲۰

ابواللیث صدیقی کی کتاب کے مطالعے سے پتہ چلا ہے کہ والد کا نام طہاس بیگ خان تھا۔ شاہ عالم کی فوج میں تھے۔ ۱۷۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ پندرہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ پہلا دیوان ۱۲۰۳ء میں شائع کروایا۔ شاہ حاتم کے شاگرد تھے۔ انہوں نے فوج میں

ایک سپاہی کی طرح زندگی شروع کی۔ پہلے بھرت پور بعد میں لکھنؤ شہزادہ سلیمان شکوہ کے دربار سے منسلک ہوئے۔لکھنؤ کی تہذیب میں رچ بس گئے کچھ عرصہ تک ہی رہے وہاں سے مرشد آباد اور ڈھاکہ سے گوالیار جا کر نوکری کر لی ہے۔

شاہ خرچ رہے اس وجہ سے انہیں تکلیف میں زندگی گزارنی پڑی۔اردو، فارسی اور عربی کے علاوہ کئی ہندوستانی زبانیں جانتے تھے۔رنگین کے نو دیوان شائع ہو چکے ہیں۔کئی مثنویاں ہیں۔جس کی تفصیل صدیقی صاحب نے اپنی تحقیق میں دی ہے۔ان کی کئی نثری تخلیقات بھی ہیں۔بڑے قادرالکلام شاعر تھے۔ان کی استادی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۸۳۵ء میں انتقال کر گئے۔

❀❀❀

اصغر

اگر بخشے زہے قسمت ، نہ بخشے تو شکایت کیا — انقلاب،03.08.2009
سر تسلیم خم ہے، جو مزاج یار میں آئے — شہکار غزلیں،ص۲۲

نہیں دیر وحرم سے کام ہم الفت کے بندے ہیں
وہی کعبہ ہے اپنا آرزو دل کی جہاں نکلے — دبستان آتش،ص۷۸

نواب اصغر علی خان آپ مولوی علی اکبر کے صاحبزادے تھے۔آتش کے شاگرد تھے۔دبستان آتش میں مختلف تذکروں کا حوالہ دے کر شاہ عبدالسلام لکھتے ہیں:

''اصغر بہادر شاہ ظفر دہلی کے وزیر تھے انہیں بہادر شاہ کی سرکار سے ظفر الدولہ معتمد الملک رفیع الامراء کا خطاب ملا۔ان کی پرورش پر بادشاہ دہلی کی خاص توجہ تھی۔یہ محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کے داماد اور نواب شرف الدولہ بادشاہ لکھنؤ کے عزیزوں میں تھے۔اصغر لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور یہیں پرورش پائی۔کلکتہ میں بھی بہت دنوں تک قیام رہا۔اصغر اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔

۱۲۷۶ھ میں انتقال کر گئے۔

❀❀❀

واجد علی شاہ اختر

درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں — گلستانِ ہزار رنگ،ص۸۴
ا خوش رہو رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں — تاریخ ادب اردو،ص۱۸۸

۳۰؍جولائی ۱۸۲۳ء کی پیدائش ہے۔اودھ کے آخری تاجدار تھے۔۱۸۴۷ء میں تخت نشیں ہوئے۔۱۸۵۶ء میں ان کو گرفتار کر کے انگریز کلکتہ لے گئے وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔

اسیر سے اصلاح لی۔برق کو بھی اشعار دکھائے۔واجد علی شاہ خود بھی شاعر تھے۔انہوں نے تقریباً ۱۷۰۰ اہل قلم اور اہلِ علم کو اپنے دربار میں ملازم رکھا تھا۔ان کے زمانے میں لکھنو میں اتنے اردو کے شعراء تھے جتنے پورے ہندوستان میں نہیں تھے۔

ہندوستان کے پہلے بادشاہ تھے جنہوں نے سے ۱۰۰ سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ انہیں شاعری کے علاوہ فنونِ لطیفہ سے بھی لگاؤ تھا۔ انہوں نے رادھا اور کنہیا کا قصّہ خود لکھ کر اسکو ڈرامائی انداز میں پیش کیا جو آج تک مشہور ہے۔ چھ دیوان، کئی مثنویاں اور قصیدے لکھے۔ تاریخ ادبِ اردو صفحہ نمبر ۱۸۸ پر رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں ''سلطان عالم کو شروع میں چندروز انتظام مملکت کا شوق اور عدالت و رعایا پروری کا ذوق رہا۔ نالائق مصاحبوں اور بدخواہ ہم نشینوں نے مزاج کو بدل دیا۔ اور عیش و عشرت کی طرف مائل کر دیا۔ اب بجز محفل رقص و سرور اور کوئی مشغلہ باقی نہ رہا۔ صدہا خوبصورت اور خوش گلو طوائفیں ملازم ہو گئیں جو محفلِ شاہی کو اپنے پر اثر نغموں سے محظوظ کیا کرتی تھیں۔''

۱۸۸۷ء میں مٹیا برج، کلکتہ میں انتقال کر گئے۔

❁❁❁

میر وزیر صبا

بات بھی آپ کے آگے نہ زبان سے نکلے
لیجئے آئے تھے ہم سوچ کے کیا کیا دل میں — غزل انسائیکلو پیڈیا، ص ۶۵

دل میں اک درد اُٹھا آنکھ میں آنسو بھر آئے — غزل انسائیکلو پیڈیا 62
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا — لکھنؤ کا دبستانِ شاعری

میر وزیر علی نام، والد کا نام میر بندہ علی۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ابو اللیث صدیقی لکھتے ہیں: ''صبا کے چچا میر اشرف علی سے صبا نے بقدر ضرورت عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ واجد علی شاہ کے دربار سے تعلق رکھتے تھے اور دو سو روپئے ماہوار ان کو بطورِ وظیفہ ملتا تھا۔

صبؔا آتشؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ ان کے شاگردوں میں علی بقا، فوق، سہا وغیرہ تھے۔

۱۸۵۴ء میں گھوڑے سے گر کر موت ہو گئی۔ کاظم علی خان نے 'انتخابِ صبا' شائع کیا ہے۔

❁❁❁

فکر یزدانی رامپوری

وہ آئے بزم میں اتنا تو فکر نے دیکھا — ش۔و۔
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی — ہماری زبان ۲۸؍ مارچ ۲۰۰۵

الطاف الرحمٰن فکر یزدانی، رازؔ یزدانی رامپوری کے شاگرد تھے۔ والد کا نام مولوی حبیب الرحمٰن تھا۔ رازؔ کہتے ہیں کہ اُن کی موجودگی میں مذکورہ شعر کی غزل صاحبزادہ محمود علی خاں رزمؔ کے دولت کدہ واقع محلّہ راجدوارہ، رامپور پر ۱۹۴۰ء میں ایک مشاعرے میں سنایا تھا۔ جس میں رامپور کے بزرگ محقق شبیر علی خاں شکیبؔ بھی موجود تھے جنہوں نے اس شعر کا ذکر اپنی کتاب 'رامپور کا دبستانِ شاعری' مطبوعہ ۱۹۹۹ء میں کیا ہے۔ (ہماری زبان ۲۲۔ ۲۸ مارچ، ۲۰۰۵ء)

یہ شعر میرؔ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ کچھ لوگ اس کو مہاراجہ بہادر برقؔ کا شعر کہتے ہیں جو دلّی کے رہنے والے تھے۔ مہاراجہ بہادر برقؔ کے استاد بھائی پنڈت گلزارؔ دہلوی سے جب میں نے اس تعلق سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ مذکورہ شعر مہاراجہ بہادر برقؔ کا نہیں ہے۔ وہ ہمارے عزیزوں میں تھے اور سائلؔ کے شاگرد تھے میں بھی سائل کا شاگرد ہوں۔ فکر کا انتقال ۱۹۶۴ء میں ہوا۔

(ہماری زبان، ۲۸ /مارچ ۲۰۰۵ء، دلّی، مملوکہ نصرتؔ)

❁❁❁

منّو لال صفا لکھنوی

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے دل آزاری میں — تذکرۂ سرور، ص ۳۹۸
کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں — گلشنِ بے خار، ص ۲۳۹

منولال صفاؔ مصحفیؔ کے شاگرد تھے۔ والد کا نام رائے پورن چند تھا۔ اخبار نویسی کا کام کرتے تھے۔ ۱۸۷۰ء میں دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

تذکرۂ سرور، نواب اعظم الدولہ، میر محمد خان، بہادر سرور، ۱۹۴۱ء، عوامی ادارہ، 5675A

❁❁❁

یگانہ چنگیزی

یکساں کبھی کسی کی نہ گذری زمانے میں — کلیاتِ یگانہ، ص ۱۴۷
یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا — نگار غزل نمبر ۱۹۴۱ء، ص ۱۹۷
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا — کلیاتِ یگانہ، ص ۴۰۹

انگور حلال اور مے انگور حرام
گُڑ کھائیں گلگلوں سے پرہیز کریں — کلیاتِ یگانہ، ص ۳۹۷

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے — جدید غزل گو، ص ۲۷۰
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا — کلیاتِ یگانہ، ص ۴۶۴

سب ترے سوا کافر آخر اس کا مطلب کیا
سر پھرا دے انساں کا ایسا خبطِ مذہب کیا — کلیاتِ یگانہ، ص ۴۵۶

طاعت ہو یا گناہ پسِ پردہ خوب ہے یگانہ شخص و شاعر،ص ۶۸
دونوں کا جب مزہ ہے کہ تنہا کرے کوئی کلیاتِ یگانہ،ص ۴۱۹

چت بھی اپنی ہے، پٹ بھی اپنی ہے لکھنؤ کا دبستان،۸۴۵
میں کہاں ہار ماننے والا کلیاتِ یگانہ،۴۵۴

مجھے دل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا لکھنؤ کا دبستان،۸۴۴
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا کلیاتِ یگانہ،۲۲۲

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دعا کر چکے اب ترکِ دعا کرتے ہیں کلیاتِ یگانہ،۲۷۲

مزہ گناہ کا جب تھا کہ باوضو کرتے
بتوں کو سجدہ بھی کرتے تو قبلہ رو کرتے کلیاتِ یگانہ،۳۰۱

مرزا واجد حسین یاسؔ یگانہؔ چنگیزی ۱۷/اکتوبر ۱۸۸۴ء کو مغل پورہ عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس پاس کیا۔ بیتابؔ عظیم آبادی سے اصلاح لی، شاد کو بھی اپنا کلام دکھایا۔ پٹنہ سے لکھنؤ گئے اور لکھنؤ کو ہی اپنا وطنِ ثانی بنا لیا۔ یگانہؔ غالبؔ شکن تھے۔ انہوں نے شعرائے لکھنؤ پر تنقید کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ دوسری جانب لکھنؤ والوں نے بھی انہیں نیچا دکھانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ ایسے سلوک سے ان میں چڑ چڑا پن آ گیا۔ ۱۹۵۰ء میں لکھنؤ سے حیدر آباد چلے گئے۔ وہاں سب رجسٹرار کے عہدے پر فائض ہوئے۔ یہاں آ کر انہیں سکون ملا۔ ریٹائر ہونے کے بعد پھر لکھنؤ آ گئے۔ ۴/فروری ۱۹۵۶ء کو انتقال کر گئے۔ اور وکٹوریہ گنج لکھنؤ میں تدفین عمل میں آئی۔ کلیاتِ یگانہ، مرزا یگانہؔ چنگیزی، مرتب مشفق خواجہ ایجوکیشنل بک ہاؤس، دلّی، عوامی ادارہ ۲۰۰۱

❁❁❁

بیخود دھلوی

بات وہ کہئے کہ جس بات کے سو پہلو ہوں بیاضِ سخن، ص ۱۶۵
کوئی پہلو تو رہے بات بدلنے کے لئے دیوانِ بیخودؔ، ص ۲۴۸

دل میں کچھ چبھتی ہوئی تقریر ہونی چاہیئے بیاضِ سخن، ص ۱۶۵
نالہ کیسا بات میں تاثیر ہونی چاہیئے دیوانِ بیخود، ص ۲۴۹

جھوٹا ہی کیوں نہ کیجئے وعدہ تو منہ سے کیجئے علمِ مجلسی، ص ۴۸
انکار سنتے سنتے برسوں گذر گئے دیوانِ بیخود، ص ۱۴۳

رقیبوں کے لئے اچھا ٹھکانا ہوگیا پیدا
خدا آباد رکھے میں تو کہتا ہوں جہنم کو دیوانِ بیخود، ص۱۸۲

منشی سید وحیدالدین احمد بیخؔود دہلوی ۱۸۵۶ء میں بھرت پور (اِن دنوں راجستھان) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شمس الدین احمد تھا۔ پہلے حالؔی کے شاگرد تھے۔ حالؔی جب دلّی سے علیگڑھ جانے لگے تو بیخؔود دہلوی کو داؔغ سے ملوا دیا۔ تب سے ان کے استاد داؔغ دہلوی ہوگئے۔ ۳۲ رسال تک انگریزوں کو اردو اور فارسی کی تعلیم دیتے رہے۔ اکابرینِ دلّی نے انہیں داؔغ کا جانشین مانا۔ آپ کے شاگردوں میں اکثر صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ بیخؔود نے رسالہ 'شاہجہاں' میں سلسلہ وار ناول لکھا تھا۔ جو نامکمل ہونے کے باوجود ایک کامیاب ادبی شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ دیوانِ بیخؔود دہلوی (عکسی کاپی ۱۳۲۳ھ) مطبع فرید بکڈ پو، دلّی، مملوکہ نصرت

❁❁❁

حفیظ میرٹھی

شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے
دل ٹوٹے آواز نہ آئے کلیاتِ حفیظ میرٹھی، ص۶۴

حیات جس کی امانت تھی اس کو لوٹا دی کلیاتِ حفیظ میرٹھی، ص۲۳۴
میں آج چین سے سوتا ہوں پاؤں پھیلا کر

کیسی ہی مصیبت ہو بڑے شوق سے آئے بیت بازی، ص۹۸
کم ظرف کے احسان سے اللہ بچائے کلیاتِ حفیظ، ص۱۱۸

اپنے دامن کیلئے خار چنے خود ہم نے کلیاتِ حفیظ، ص
اب یہ چبھتے ہیں تو پھر ان سے شکایت کیا ہے

پروانوں کا تو حشر جو ہونا تھا ہو چکا بیت بازی، ص۹ / کلیاتِ حفیظ، ص۱۴۲
گذری ہے رات شمع پہ کیا دیکھتے چلیں

سارا کلیجہ کٹ کٹ کر جب اشکوں میں بہہ جاتے ہیں شعروں کا کھیل، ص۱۷۲
تب کوئی فرہاد بنے ہے تب مجنوں کہلائے ہے کلیاتِ حفیظ، ص۲۴۷

احباب سے کہہ دو ذرا دامن کو بچائیں شعروں کا کھیل، ص۹ / کلیاتِ حفیظ، ص۳۰۰
میں ڈوب رہا ہوں میرے نزدیک نہ آئیں

کلیاتِ حفیظ کے مقدمہ سے پتہ چلتا ہے کہ نام حفیظ الرحمٰن اور تخلص حفیظ تھا۔ انٹر میڈیٹ تک تعلیم حاصل کی۔ کلکٹریٹ میں سروس کی ۱۹۵۰ء میں ادب رسالہ 'معیار' کی ادارت کی۔ اور ادارۂ ادبِ اسلامی سے وابستہ ہو گئے۔ اور اسی ادارے میں ۱۹۹۱ء میں ملک گیر سطح پر آپ کا جشن منایا گیا۔ گلزار دہلوی کہتے ہیں کہ حفیظ اچھے انسان بھی تھے اور اچھے شاعر بھی تھے۔ ادبی تخلیقات، شعر و شعور، متاعِ آخرت۔ حفیظ تقریباً نصف صدی تک چارغِ شعر و ادب روشن کئے ہوئے تھے۔

پرواز رحمانی نے لکھا ہے کہ بامقصد تعمیری اور اعلیٰ اخلاقی قدروں پر مبنی شاعری کی تاریخ مرتب کی جائے تو حفیظ کے بغیر نامکمل رہے گی۔ ۷ر جنوری ۲۰۰۰ء بمقام میرٹھ فوت کر گئے۔ کلیات حفیظ میرٹھی، ادارۂ ادبِ اسلامی ہند، دلّی، ۲۰۰۰ء، مومن لائبریری، ص ۳۱۸

❀❀❀

وحشت کلکتوی

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موجِ دریا کا حریف — نساخ سے وحشت تک، صفحہ نمبر ۲۱۰
ورنہ میں بھی جانتا ہوں ، عافیت ساحل میں ہے

خیال تک نہ کیا اہلِ انجمن نے ذرا
تمام رات جلی شمع انجمن کیلئے — غزل انسائیکلوپیڈیا، ص ۱۲۵

مزہ آتا اگر گذری ہوئی باتوں کا افسانہ — گلستانِ ہزار 497
کہیں سے ہم بیاں کرتے کہیں سے تم بیاں کرتے — جدید غزل گو، ص ۲۶۵

سیّد رضا علی وحشتؔ ۱۸ر نومبر ۱۸۸۱ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ کالج کلکتہ میں اردو کے پروفیسر تھے۔ لیڈی براؤن کالج میں بھی پروفیسر ہوئے۔ ان کے والد شمشاد علی صاحب پولس محکمہ میں انسپکٹر تھے۔ اس نوکری کو چھوڑ کر پوسٹ آفس کی نوکری کی۔ وحشتؔ کا ۱۹۱۰ء میں دیوان شائع ہوا۔ اس کے بعد ترانۂ وحشتؔ شائع ہوا۔ اردو، فارسی اور انگریزی پر دسترس حاصل تھا۔ سرکار نے انہیں خان بہادر کا خطاب بھی دیا تھا۔ شمس کے شاگرد تھے۔ انگریزی اخباروں کیلئے مضامین لکھا کرتے تھے۔ استاد شاعر تھے ان کے تلامذہ میں علامہ جمیل مظہری کا نام آتا ہے۔ وحشتؔ غالب ثانی کہلاتے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں مشرقی پاکستان چلے گئے وہیں ۲۰ر جولائی ۱۹۵۶ء کو انتقال کر گئے۔

نساخ سے وحشت تک، سیّد لطیف الرحمٰن، سن اشاعت ۱۹۵۹ء، عوامی ادارہ

❀❀❀

صفی اورنگ آبادی

جان جاتی تو نہ ہوتا مجھے دکھ اتنا صفیؔ — کلیاتِ صفی، صفحہ نمبر ۴۴
روٹھ کر ہائے مرے گھر سے کسی کا جانا

میر بہبود علی صفیؔ اورنگ آبادی، ولادت ۱۴ر فروری ۱۸۸۳ء کو جونا بازار، اورنگ آباد میں ہوئی۔ والد کا نام حکیم منیر الدین تھا۔ ان

کے والد اپنے بال بچوں کے ساتھ حیدر آباد چلے گئے۔ شاعری میں مرزا منیر الدین ضیاؔء دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ بعد میں ظہوؔر دہلوی سے بھی اصلاح لی۔ فروغ علی کیفی کی بھی شاگردی اختیار کی۔ بڑے زود گو واقع ہوئے۔

نواب معین الدولہ کے دربار سے منسلک تھے۔ محبوب علی خان اخگر نے صفی پر بہت کام کیا۔ ان کے دادا استاد تھے۔ میں نے صفؔی کی خودداری کے کئی واقعات پڑھے ہیں۔ ناصر الدین احمد مہتمم، آبکاری گلبرگہ صفؔی کے مداحوں میں تھے۔ ڈاکٹر سیّد بشیر احمد اردو کے 'روشن مینار' میں لکھتے ہیں:

''ناصر نے ایک بار تانڈوڑ کے ایک تاجر صندل پلیا سے کہہ کر ایک سو روپے بذریعہ منی آرڈر صفؔی کو بھجوایا۔ صفی کو پیسے کی سخت ضرورت تھی لیکن ان کی غیرت نے قبول نہیں کیا کہ وہ ایسے آدمی کا منی آرڈر قبول کریں جس کو وہ جانتے نہیں تھے۔ چنانچہ منی آرڈر واپس کر دیا اور پشت پر یہ لکھ دیا کہ وہ منی آرڈر بھیجنے والے سے واقف نہیں ہیں۔''

وفات ۲۱/مارچ ۱۹۵۴ء کو ہوئی۔ کلیاتِ صفی، مرتب محبوب خاں اخگر، ۲۰۰۰، حیدر آباد، مملوکہ اخگر

❁❁❁

خاک پونوی

مقدر کی ہیں باتیں جب مقدر پھوٹ جاتے ہیں — کتابچۂ مشاعرہ ص ۶
تو لب تک آتے آتے کتنے ساغر ٹوٹ جاتے ہیں — ا لاکھ ساغر شعراءِ پونہ صفحہ ۱۴۵

نام: شیخ عباس، ولادت: 22.07.1888 مہو چھاؤنی (مدھیہ پردیش) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد صاحب احمد آبادی تھا۔ وہ فوج میں ملازم تھے۔ خاکؔ سائلؔ دہلوی کے شاگرد تھے۔ دکن کالج، پونہ سے تعلیم حاصل کی۔ خاکؔ پونہ کے رہنے والے تھے۔ شہر بھیونڈی (مہاراشٹر) میں جب ۱۹۲۹ء میں کوکن مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی بنی تو اینگلو اردو ہائی اسکول قائم کیا گیا۔ اس میں کئی قابلِ قدر اساتذہ ملک کے دوسرے علاقوں سے آئے۔ ان میں خاکؔ پونوی کا نام بڑا اہم ہے۔ آج کے بزرگ اور کہنہ مشق شاعر ابوبکر جناب اور ملک تاسے بھی ان کے شاگرد رہ چکے ہیں۔

بڑے باصلاحیت استاد تھے۔ اردو، فارسی اور عربی کے جانکار تھے۔ اپنے شاگردوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آتے تھے، استادوں سے بھی خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔

نذیر فتح پوری اپنی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ خاکؔ کا مجموعۂ کلام ۱۹۸۶ء میں ان کے صاحبزادے منشی صاحب کے پاس تھا لیکن وہ اسے شائع نہیں کرا سکے۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد ۲۵/ستمبر ۱۹۵۱ء کو پونہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

شعراءِ پونہ، از: نذیر فتح پوری، ناشر: حاجی غلام محمد اعظم ایجوکشنل ٹرسٹ، پونہ — کتابچہ: مشاعرہ منعقدہ ۲۵/ستمبر ۱۹۷۲ء، پیش لفظ صفحہ نمبر ۶، بمقام: بھیونڈی (مہاراشٹر)

❁❁❁

بشیر بدر

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں — کلیات بدر،ص۲۰۱

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے — کلیات بدر،ص۸۵

سر سے چادر بدن سے قبا لے گئی
زندگی ہم فقیروں سے کیا لے گئی — کلیات بدر،ص۳۱۸

۱۹۳۵ء میں کانپور میں پیدا ہوئے۔ بشیر بدؔر جدید شعراء میں عمدہ شعر کہنے والوں میں ہیں۔ طالبِ علمی کے زمانے سے ہی شعر کہتے تھے۔ جب وہ ایم اے کے طالبِ علم رہے تو ان کی غزل کورس میں شامل تھی۔ یہ شرف بہت کم شاعروں کو ان کی طالبِ علمی کی زمانے میں میسر ہوا۔ میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ انہوں نے ہمارے کالج کے کئی مشاعرے میں شرکت کی ہے۔ بھیونڈی اور ممبئی میں بھی ان سے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔

ادبی رسالوں کے ساتھ ساتھ مشاعرے کے بھی کامیاب شاعر ہیں۔ لیکن ادھر چند برسوں سے مشاعرے میں شامل نہیں ہو رہے ہیں۔ ان دنوں بھوپال میں ہیں۔ اور مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کے صدر ہیں۔

کلیاتِ بشیر بدؔر، کتب خانہ خورشیدیہ، لاہور، مملوکہ نصرت

❁❁❁

پنڈت برج نارائن چکبست

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب — خمخانۂ جاوید (۲)،ص۳۳۰
موت کیا ہے انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا — کلامِ چکبستؔ ،ص۱۰

اگر دردِ محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ کچھ مرنے کا غم ہوتا نہ جینے کا مزہ آتا — پیارے پیارے شعر،ص۵۳

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے — کلامِ چکبست ،ص۸

ایک ساغر بھی عنایت نہ ہوا یاد رہے
ساقیا جاتے ہیں محفل تری آباد رہے — غزل انسائیکلو پیڈیا،ص۱۲۶

پنڈت برج نرائن چکبستؔ ۱۸۸۲ء میں راٹھور حویلی فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام پنڈت ادت نرائن چکبست تھا۔ جو ڈپٹی کلکٹر تھے۔ کشمیری برہمن تھے۔ ایل۔ ایل۔ بی کیا اور اپنی وکالت کی وجہ سے لکھنو میں خوب مشہور ہوئے۔ اردو اور فارسی پر عبور تھا۔ اسیرؔ کے صاحبزادوں سے اصلاح لی۔ حب الوطنی کیلئے بھی کافی مشہور تھے۔ نثر میں 'کشمیر درپن' کافی مشہور ہوا۔ انتخابِ مضامین چکبست ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں استاد شعراء کی شاعری کا جائزہ ہے۔ کالی داس گپتا رضا نے ان کے فن پر کام کیا ہے۔ صرف ۴۴ برس کی عمر میں ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو رائے بریلی کسی کیس کی پیروی کیلئے گئے واپسی میں دماغ کی نس پھٹ گئی اور انتقال کر گئے۔

کلامِ چکبست، نصاب برائے ایم۔ اے، رزاق پریس، کانپور، سنِ اشاعت ۱۹۷۴ء، موس D157

❁❁❁

عزیز لکھنوی

کبھی حوصلے دل کے ہم بھی نکالیں ا۔ر۔
ادھر آؤ تم کو گلے سے لگا لیں انتخابِ عزیز، ص ۳۴

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن گلستانِ ہزار رنگ، ص ۱۳۸
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا انتخابِ عزیز، ص ۱۵

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا گلستانِ ہزار رنگ، ص ۱۱۴
وہ میرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا انتخابِ عزیز، ص ۱۸

عہد میں تیرے ظلم کیا نہ ہوا انتخابِ عزیز، ص ۱۵
خیر گذری کہ تو خدا نہ ہوا

ولادت ۱۴؍ فروری ۱۸۸۲ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔ مرزا محمد ہادی، تخلص عزیزؔ تھا۔ والد کا نام مرزا محمد مہدی تھا۔ مولوی محمد حسین صاحب، پیارے مرزا صاحب، شمس العلماء مولوی عبدالحمید صاحب فرنگی محلی سے علم حاصل کیا۔ آپ کے آبا و اجداد شیراز سے کشمیر آئے۔ اردو کے ممتاز ترین شاعروں میں آپ کا نام آتا ہے۔ علّامہ اقبال نے بھی آپ کے کلام کو سراہا ہے۔ ان کا ایک شعری مجموعہ ۱۹۱۸ء میں 'گل کدہ' شائع ہوا۔ بعد میں خلیق انجم نے انتخاب شائع کیا۔ آپ صفی لکھنوی کے شاگرد اور جوشؔ اور اثرؔ لکھنوی کے استاد تھے۔ ڈپٹی کمشنر مرزا محمد عباس خان کے پرائیوٹ سکریٹری رہے۔ راجہ محمود آباد کے اتالیق تھے۔ ۲۹؍ جولائی ۱۹۳۵ء کو انتقال کر گئے۔

انتخابِ عزیز، مرثیہ خلیق انجم، انجمن ترقی اردو دلّی، ۲۰۰۱ء، مملوکہ نصرت

❁❁❁

بیخود موہانی

نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی کیا ہے — غزل انسائیکلوپیڈیا،ص۱۴۰
کبھی روئے کبھی سجدے کئے خاکِ نشیمن پر

نام سیّد احمد بیخود موہانی ہے۔ ۱۸۸۳ء میں قصبہ موہان (کانپور) میں پیدا ہوئے۔ ایم۔اے کیا۔ ریلوے میں ملازم ہوئے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ 'شرح دیوانِ غالب' ہے۔ آج بھی ان کی شرح سے کہیں کہیں نئے غالب سے آشنائی ہو جاتی ہے۔ کلیات کے علاوہ نثر میں گنجینۂ تحقیق، منظرِ آئینہ اور جوہرِ آئینہ ہے۔ اتر پردیش اردو اکاڈمی نے انتخاب بیخود موہانی شائع کیا تھا۔

❁❁❁

اصغر گونڈوی

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے — گلستان ص،۳۱۶
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے — کلیات اصغر،ص۸۲

گلستان ہزار،ص۱۴۶

یہ آستانِ یار ہے صحنِ چمن نہیں — کلیات اصغر،ص۵۳
جب رکھ دیا ہے سر تو اٹھانا نہ چاہئے

ایوان،۱۹۹۲

یہاں کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری — کلیات اصغر،ص۷۰
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

ایوان،۱۹۹۲

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا — کلیات اصغر،ص۳۹
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

ایوان،۱۹۹۲

اصغؔر سے ملے لیکن اصغؔر کو نہیں دیکھا — کلیات اصغر،ص۳۹
اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

غزل،ص۱۳۶

نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظِ ناداں — کلیات اصغر،ص۲۲
ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھ دی

غزل،ص۱۳۶

سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی — کلیات صغر،ص۲۱
کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرزِ ادا ہے

ا؍ مارچ ۱۸۸۴ کو گورکھپور میں پیدا ہوئے۔مولوی اصغر گونڈی اصغر کو اپنے ہم عصروں میں ایک منفرد مقام حاصل تھا۔وہ غزل کے کامیاب شاعر تھے۔کم کہنے کے باوجود اردو کے کامیاب شعرا میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔علامہ اقبال کے ساتھ رہنے کا بھی انہیں شرف حاصل ہے۔نشاط روح سرود زندگی ان کے مجموعے تھے۔اصغر ایک اچھے صحافی اور نثر نگار بھی تھے۔انہوں نے ہندوستان اکیڈمی کا جریدہ ''ہندوستاں'' کی بھی ادارت کی۔۳۰؍نومبر ۱۹۳۶ کو الہٰ آباد میں انتقال کر گئے۔

کلیات اصغر گونڈی، مقدمہ مجنوں گورکھ پوری، فرید بک ڈپو، دلّی مملوکۂ نصرت

❁❁❁

امجد حیدر آبادی

کس چیز کی کمی ہے مولیٰ تری گلی میں — یادِ رفتگان اول، ص ۱۰۲
دنیا تری گلی میں عقبیٰ تری گلی میں — اردو کے روشن مینار، ص ۲۰۵

ذرے ذرے میں ہے خدائی دیکھو
ہر بت میں شان کبریائی دیکھو
اعداد تمام مختلف ہیں باہم
ہر ایک میں ہے مگر اکائی دیکھو — رباعیاتِ امجد، ص ۳۴

سید امجد حسین امجؔد ۲۹؍ مارچ ۱۸۸۶ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔گود ہی میں تھے تو آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔آپ کی والدہ نے آپ کی پرورش کی۔دکن کے مقامی شعراء میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔انہیں رباعی کا بے تاج بادشاہ کہا جاتا ہے۔ان کی رباعی میں صوفیانہ انداز ملتا ہے۔اخلاقی اقدار کے فروغ کیلئے انہوں نے بے شمار رباعیاں کہی ہیں۔ان کے آباء واجداد میں کئی صوفی بزرگ گذرے ہیں۔اس کا بھی اثر ان پر پڑا۔مولانا سید سلمان ندوی نے انہیں حکیم الشعراء کے خطاب سے نوازا تھا۔۲۹، مارچ ۱۹۶۱ کو انتقال کر گئے۔

رباعیات امجد، حامی بک ڈپو، حیدر آباد، مملوکہ نصرت

❁❁❁

قمر جلالوی

شکریہ! اے قبر تک پہنچانے والو شکریہ
اب اکیلے ہی چلے جائیں گے اس منزل سے ہم

کہا کسی سے نہ میں نے ترے فسانے کو
نہ جانے کیسے خبر ہو گئی زمانے کو — یادِ رفتگان (جلد دوّم)، ص ۱۸۴۔۱۸۳

سیّد محمد حسین شاعری کے میدان میں استاد قمر جلالوی کہلاتے تھے۔عرصے تک ہندوستان میں رہے۔استاد شاعر تھے مشاعرے

میں بھی چھا جاتے تھے۔ جلالی ضلع علی گڑھ کا مشہور قصبہ ہے وہیں کہ ایک زمیندار گھرانے میں ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئے۔ علیگڈھ میں سائیکل کی مرمت کی ایک دکا نچلاتے تھے۔ امیر مینائی سے اصلاح لی۔ بٹوارے کے وقت پاکستان چلے گئے۔ وہاں جانے کے بعد شاعری میں بہت نکھار پیدا ہوا۔ آل انڈیا ریڈیو پر انہوں نے خوب غزلیں سنائیں۔ آل پاکستان مشاعرے کے بھی زینت بنے۔ ان کی شاعری کا بڑا چرچا رہا۔ رسالوں میں بھی خوب چھپے، زود گوئی کیلئے بھی کافی مشہور تھے۔ آخری دنوں میں یرقان میں مبتلا ہوئے اور ۲۴ر اکتوبر ۱۹۶۸ء کو لیاقت آباد میں انتقال کر گئے۔

اُردو کے صحافیوں نے اس وقت بے جگری اور بے باکی سے مضبوط پنجہ گڑوئے ہوئے، سخت گیر ظالم برٹش حکومت پر اپنے شعلہ بار قلم سے انگارے برسانے شروع کئے۔ دار و گیر، جائیداد و املاک کی ضبطیاں ہوئیں، سولیوں پر لٹکائے مگر ۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں　　ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اس شعر کے مطابق نا مساعد حالات اور غیر یقینی آزادی کو مساعد اور یقینی بنا دیا۔ اردو زبان پر تحریک مجاہدین کے اثرات تھے جو سر زمینِ بہار سے اٹھی اور بالا کوٹ کے میدان میں جس نے شہادت کی تاریخ بنائی۔ سید احمد شہیدؒ۔ سید اسمٰعیل شہیدؒ جس کے قائد تھے۔ اس کے بعد سر سید احمد خاںؒ کی علی گڑھ تحریک، مولینا قاسم نانوتویؒ کی دیو بند تحریک اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کی اسلامی تحریک نے اس زبان کی مزاج سازی کی۔ یوں اردو زبان میں اوّل روز سے مجادلت اور مقادمت دونوں کے جذبات موجود رہے ہیں۔ آج اس مشکل دور میں بھی اُردو صحافت زندہ ہے، بلکہ اس میں عصری تبدیلیوں کے انداز بھی آ گئے ہیں۔ طباعتی پہلو سے لے کر کمپیوٹرائز، کیلی گرافی، ملٹی کلر پُرکشش پرنٹنگ کے باعث اُردو اخبارات آج کے بڑے اخبارات سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اور ان کے تمام لکھنے والوں کا مزاج آج بھی آزاد اور جرات مند ہے۔ ملکی، لسّانی، اور قومی مسائل پر اخبارات بڑی جرأت اور بے باکی سے لکھتے ہیں۔ لیکن ایسے اردو جرائد اور ڈائجسٹ آج بھی بکثرت نکل رہے ہیں، جن سے اُردو کا نام ہندوستان میں زندہ تابندہ اور روشن ہے۔

اسی طرح ماضی سے اردو کا وہ تعلق اور رابطہ ٹوٹا نہیں ہے بلکہ بدرجۂ احسن قائم اور روز افزوں ہے جو آزادئ ہند سے قبل قائم تھا۔ اس وقت ملک میں بہت سارے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، اکیڈیمیاں قائم تھیں۔ جو اُردو کتابوں کی اشاعت کا کام کیا کرتی تھیں۔ ان میں سے کچھ آج تک موجود ہیں۔ بعض نئی قائم ہوئی ہیں۔ الہ آباد کی ہندوستانی اکیڈیمی نے ایک زمانے میں اُردو کی زبردست خدمت کی تھی۔ اگر چہ وہ اب ہندی اکیڈیمی بنا دی گئی ہے۔ حیدرآباد کی سلیم اکیڈیمی جس کے سربراہ چودھری اقبال سلیم گاہندری تھے۔ آزادی سے قبل اس اکیڈیمی نے اُردو کی بیش بہا کتابیں شائع کی تھیں، اب موجود نہیں ہیں۔ دائرۃ المعارف حیدرآباد کی خدمات کبھی بھلائی نہیں جا سکتیں۔ مگر سقوطِ حیدرآباد کے بعد اس کی سرگرمیاں بھی سرد سرد ہیں۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، اُردو یونیورسٹی سے تیلگو یونیورسٹی بنا دی گئی ہے۔ اس کے باوجود خدا نے اُردو اور اُردو والوں کو جو انداز عطا فرمائے ہیں کہ ۔

ہم اہلِ دل، جہاں میں صورتِ خورشید جیتے ہیں

اِ دھر ڈوبے۔اُدھر نکلے،اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

آج بھی یہ انداز اُردو میں موجود ہے، بہت سارے طباعتی واشاعتی ادارے نہ صرف قائم ہیں بلکہ ان کی ادبی خدمات کی حدیں بھی پھیلی ہیں۔ نئے طباعتی واشاعتی ادارے بھی قائم ہوئے ہیں۔اُردو اکاڈیمیاں حکومت کی سرپرستی میں کام کرنے لگی ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ یہ سب مطلوبہ معیار کے مطابق کام کررہی ہیں۔مگر اس سے اُردو کی زندگی اور رفتار کا پتہ ضرور لگتا ہے۔دارالمصنفین (اعظم گڑھ) آج بھی قائم ہے، اور اس کی علمی وادبی جریدہ معارف اب بھی اپنے نئے سابقہ معیار کو سنبھالے ہوئے نکل رہا ہے۔اگرچہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور شاہ معین الدین ندوی انتقال فرما چکے ہیں۔لیکن شبلی اسکول کے ان اُردو کے اکابرنے معارف کے لئے جو رستہ بنایا تھا۔ وہ آج بھی اس پر رواں دواں ہے۔حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ اور حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادیؒ وفات پا چکے ہیں لیکن دہلی کا ندوۃ المصنفین باقی ہے۔یہ ادارہ حالات کے سخت اور موت آسا تھپیڑوں کی زد پر ہے لیکن اب بھی اپنی زندگی کے لئے جدوجہد کررہا ہے۔اُردو کے یہ وہ عظیم الشان ادارے ہیں جن کے دم قدم سے اُردو زبان میں ان گنت علمی وتحقیقی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔اس کے علاوہ بہار کا ایک اہم ادارہ خدابخش اورینٹیل لائبریری پٹنہ ہے۔جو آج پوری طرح حکومتِ بہار کی زیرنگرانی چل رہا ہے۔اس کے ڈائریکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی وجہ سے یہ لائبریری ریسرچ کا مرکز بن گئی ہے۔

❁❁❁

شوخ اکبر آبادی

جو دیکھا جانبِ غیر اس نے دل پکارا اٹھا
نگاہِ لطف کے امید وار ہم بھی ہیں (نقوش لاہور غزل نمبر)

شوخ کا پورا نام سید سخاوت علی جعفری ہے۔ پہلے آغا شاعر کے شاگرد ہوئے بعد میں رئیس اکبرآبادی کے شاگرد ہوگئے۔ ریلوے میں کلرک تھے۔

❁❁❁

شفیق کوٹی

کانٹوں کو چھوا ہے نرمی سے اکثر
بے درد ہیں پھولوں کو مسل دیتے ہیں

منشی شیر علی خاں ریاست کوٹہ (یوپی) جو ہسوا، فتح پور کے زمینداروں میں تھے،ان کے گھر ۱۹۰۳ء میں شفیق اللہ خاں شفیق کوٹی پیدا ہوئے۔گھریلو تعلیم حاصل کرنے کے بعد لکھنؤ میں رہ کر گورمنٹ کے ٹیکنیکل اسکول میں تعلیم حاصل کی اور زراعت کے محکمے میں کام کیا۔ بٹوارے کے وقت پاکستان گئے اور وہاں اسسٹنٹ ڈائریکٹر آف انسپکشن، محکمہ سپلائی اینڈ ڈولپمنٹ کے عہدے پر ریٹائر ہوئے۔شاعری

اچھی کی۔یوں بھی پاکستان میں مہاجر شعراء نے بڑا نام کیا۔مہاجر ہونے کی وجہ سے جو تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں اس کا خمیازہ بھی بگھتا ہے۔اشعار میں جابجا اس کا اظہار ہے۔اس طرح کے ماحول نے بڑے بڑے شعراء مشہور اکبر آبادی کے شاگرد ہوئے۔دیار غزل ان کا شعری مجموعہ شائع ہوا۔

۱۱/فروری ۱۹۷۶ء کو لاہور میں موت آئی۔

❁❁❁

بہزاد لکھنوی

اوروں کو عطا کردے یہ ساغر ومینا
آنکھوں سے پلا ساقی گر تجھ کو پلانا ہے

ے دیکھنے والو مجھے ہنس ہنس کے نہ دیکھو
تم کو بھی محبت کہیں مجھ سا نہ بنادے (نغمۂ نور ص۲۴)

اوروں کی جفا یاد نہ اپنوں کی جفا یاد
اب کچھ بھی نہیں مجھ کو مدینے کے سوا یاد ا۔ محبت (سخن ور تذکرہ ص۶۰)

ہماری بزم میں اور بزم میں ہے فرق اتنا
وہاں چراغ یہاں دل جلائے جاتے ہیں

اے جذبۂ دل جب میں چاہوں ہر چند مقابل آجائے
منزل کے لئے دوگام چلوں اور سامنے منزل آجائے (اردو کے روشن مینار ص۲۴۸۔ چراغ طور ص۱۱)

اوروں کو عطا کردے یہ ساغر ومینا
آنکھوں سے پلا ساقی گر تجھ کو پلانا ہے

اے دیکھنے والو مجھے ہنس ہنس کے نہ دیکھو
تم کو بھی محبت کہیں مجھ سا نہ بنادے (نغمۂ نور ص۲۴)

اوروں کی جفا یاد نہ اپنوں کی جفا یاد
اب کچھ بھی نہیں مجھ کو مدینے کے سوا یاد ا۔ محبت (سخن ور تذکرہ ص۶۰)

سردار احمد خان بہزاد لکھنوی ۱۹۰۰ء میں امین آباد لکھنو میں پیدا ہوئے۔ فانی سے اصلاح لی مشاعرے میں خوب شرکت کرتے تھے اور ترنم سے پڑھ کر سامعین میں بے حد مقبول تھے۔ بہزاد اپنی نعت کی وجہ سے مشہور تھے۔ پہلے ہندوستانی فلم سے جڑے۔ تقریباً ۵۰ فلموں کے گیت لکھے۔ مشہور گلوکاروں نے ان کی غزلیں گائی ہیں۔ ۱۹۴۸ء کی فلم ''آگ'' کی غزل ''زندہ ہوں اسطرح کہ غمِ زندگی نہیں۔ جلتا ہوا دِیا ہوں مگر روشنی نہیں'' بہت مشہور ہوئی تھی۔ ان کی کچھ فلموں کے گانے خوب مشہور ہوئے تھے۔ انہوں نے تقریباً ۲۴ فلموں کے گانے لکھے۔ رومی، زمیندار، آگ اور جگنو بہت مشہور ہوئی۔ پوربی گانوں نے تو خوب دھوم مچائی تھی۔

۱۹۵۱ء میں پاکستان چلے گئے۔ وہاں پہلے ریلوے اور بعد میں ریڈیو پر کام کیا۔ ان کے شعری مجموعے کفر وایمان، چراغ طور کیف وسرور، نغمہ نور اور موج طور شائع ہوئے۔ یہ مجموعے خوب بکتے تھے۔

دلی ریڈیو اسٹیشن سے ہر جمعہ ایک نعت پیش کرتے تھے۔ اس نعت کا سننے والوں کو بڑا انتظار رہتا تھا۔ مالک رام لکھتے ہیں کہ بہزاد مستقلاً سوت کی اچھی خاصی موٹی دوہری رسی گلے میں ڈالے رہتے تھے۔ جب کلام پڑھتے ,جوش میں آجاتے تو دونوں ہاتھوں سے اسے کھینچتے۔ آخری وقت میں ٹی۔ بی کے مرض میں مبتلا ہوگئے۔ ۱۰/اکتوبر ۱۹۷۴ء کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

☆

ہو نچی و ہا ں بھی شیخ و بر ہمن کی کشمکش
اب میکد ہ بھی سیر کے قا بل نہیں ر ہا

سہیل اقبال (۱۸۸۵-) نے اس بات کی نفی کی ہے۔ سہیل کے مطابق شیخ اور برہمن کی لڑائی یہاں بھی جاری ہے۔ اس مفہوم میں ایک ہی بات کو ایک جگہ ہاں دوسری جگہ نہ کہا گیا ہے، سہیل نے بدلتے ہوئے حالات کی صحیح عکاسی کی ہے۔ اب دونوں قوموں میں اتنی دوریاں ہوگئی ہیں کہ ان کا مزاج ذرا اور بدلے گا تو ان کے مے خانے بھی الگ الگ ہونگے ابھی تک اسکول، کالج ہی الگ الگ بنائے گئے ہے۔ لوگوں نے رہنے کے لئے اپنے اپنے گاؤں اور کالونیاں بنالی ہیں۔ دونو الگ الگ ڈھنگ سے اپنے اپنے طور طریقے سے رہتے ہیں۔ سبھی مذہبوں نے اپنی اپنی سہولت کے لئے اپنا سب کچھ الگ کرلیا ہے۔ ایک شہر میں رہ کر دو قوموں کی نسل ایک دوسرے سے آشنا نہیں ہیں۔ پہلے مندر، مسجد اور گردوارے ہی الگ الگ ہوتے تھے۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ ہمارے زمانے میں ہندی اردو دونوں کے طلبا ایک ساتھ پڑھتے تھے پڑھانے والے دونوں کو ایک ہی طرح سے پڑھاتے تھے۔ ہم اردو میڈیم والے اردو میں لکھتے تھے۔ ہندی میڈیم والے ہندی میڈیم سے لکھتے تھے۔ آج بھی غالباً اسی طرح کی تعلیم جاری ہے۔ آج بھی ہندو مسلمان دونوں ایک ساتھ رہتے ہیں۔ اختلافات تو زمانے کے مطابق ہیں۔ ہم تہواروں میں ایک دوسرے کے گھر جاتے ہیں۔

رضا تھانیسری

آدمی بلبلہ ہے پانی کا
کیا بھروسہ ہے زندگانی کا (عیارالشعراء ص۔۳۰۹)

سید ضمیر جعفری

میری بیوی قبر میں لیٹی ہے حسن گام سے
وہ بھی ہے آرام سے سے اور میں بھی ہوں آرام سے ضرب المثل ص۔۱۶

مولوی اونٹ پہ جائے ہمیں منظور مگر
مولوی کار چلائے ہمیں منظور نہیں ضرب المثل ص۔۱۶

سید ضمیر کی پیدائش ۱۹۱۶ء کو پاکستان میں ہوئی۔ اسلامیہ کالج، لاہور سے فارغ ہوئے۔ وہ مزاحیہ شعر ہی نہیں کہتے تھے، نثر بھی لکھتے تھے۔ کئی رسالوں نے ان کے خاص نمبر بھی شائع کئے تھے۔ کئی رسالوں کے وہ خود بھی ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ کئی گولڈ مڈل ملے۔ ان کی پچاس سے زیادہ کتابیں مختلف نصابوں شامل ہیں۔ غیر مطبوعہ کتابیں بھی بہت ہیں۔ ہر طرح کے اشعار کہنے میں مہارت حاصل تھی۔ انہوں نے اپنے رسالہ چہارسو کے کئی خاص نمبر شائع کئے۔

طرفہ قریشی

دررسول[1] پہ مرنے کی آرزو کیسی ؎ حبیب
حیات مانگ کے لائیں گے ہم مدینے سے (ع۔ا۔ع) (شعری مجموعہ ص۱۱۱)

طرفہ قریشی ۳ / مارچ ۱۹۱۴ء کو بھنڈارہ میں ہوئی۔ ان کا پورا نام ابوالمختار عبدالوحید قریشی تھا۔ مولانا انور کامٹی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ بعد میں حضرت سیماب اکبرآبادی کے شاگرد ہوئے اور ان کے تلامذہ میں سیکڑوں شاعروں اور ادیبوں کا نام آتا ہے۔ اسکول میں پڑھاتے تھے۔ ان کی شاعری جتنی کامیاب تھی اس سے زیادہ ان کی نثر تھی۔ پہلا شعری مجموعہ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ دوسرے مجموعوں میں شہید اکبر، نصف النہار اور فانوسِ حرم۔ آل انڈیا مشاعرے کی صدارت کے لئے کافی دور دور تک بلائے جاتے تھے۔ رسالوں میں بھی خوب چھپتے تھے۔ علم عروض میں کمال حاصل تھا۔ مجروح کا ایک شعر یاد آتا ہے۔

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

طرفہ صاحب نے ۱۹۵۲ء میں اپنا مکان بیچ کر اپنا مجموعہ شائع کیا۔

طرفہ ہندوستان پاکستان دونوں جگہ کافی مشہور تھے۔ اکثر ان کی غزلیں آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوتی تھیں۔ H.M.V کے ریکارڈ بھی بنے تھے۔ ان کی شعری خدمات کو دیکھتے ہوئے انہیں ضمیر الشعراء کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔

ظہیرؔ کاشمیری

ہمیں یہ علم کہ ہم ہیں چراغِ آخری شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے

سیرت نہ ہو تو عارض و رخسار سب غلط
خوشبو اڑی تو پھول فقط رنگ رہ گیا

دستگیر ظہیر 21 / اگست 1920ء کو امرت سر میں پیدا ہوئے۔ گیارہ سال کی عمر میں تک بندی شروع کی۔ اپنے گھر کے بزرگوں نے انھیں تقویت دی جو شاعر تھے۔ مشاعرے میں بڑی گرج دار آواز کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اخباروں میں کالم لکھنا شروع کیا۔ کئی اخباروں کے مدیر رہے۔ فلمیں بھی بنائیں۔ ٹریڈ یونینوں سے وابستہ رہنے کی وجہ سے کئی بار جیل جانا پڑا۔ بہت لکھاڑ مانے جاتے ہیں۔ روزنامہ ''احسان'' میں 'مجنوں' کے نام سے کالم لکھتے تھے۔ ترقی پسندوں کے ہم نوا بنے رہے۔ اس زمانے کی تاریخی جنگ میں عملاً شامل رہے۔ آج کے حالات ویسے نہیں ہیں، اس لیے کہ اب شیر دل لوگ کہا ہیں۔ اپنے اشعار میں بھی بے باکی کا اظہار کرتے رہے۔

ظریف لکھنوی

وحشت میں ہر ایک نقشہ الٹا نظر آیا ہے
مجنوں نظر آئی ہے، لیلی نظر آیا ہے (م۔ا۔م کلیات ظریف ص ۱۲۳)

نر ہے یا مادہ عجب ترکیب ہے اسلام کی
کچھ حقیقت ہی نہیں کھلتی ہے سیتا رام کی م۔ا۔م (کلیات ظریف ص ۱۲۳)

۲۴ رفروری ۱۸۷۷ء کو لکھنو میں پیدا ہوئے ,والد مرزا سلیمان قدر بہادر کی سرکار میں مدارالہام میں ملازم تھے۔ ۱۸۷۷ء سے ان کی تعلیم شروع کروائی گئی۔ اپنی بڑی بھاوج یعنی صفی لکھنوی کی بیوی سے پڑھا۔ مدرسے صفی کے مکتب میں بھی پڑھا۔ سنسکرت بھی سیکھی تھوڑی بہت انگریزی بھی جانتے تھے۔ عربی، فارسی اردو تو خوب جانتے تھے۔

چھوٹی عمر سے ہی اپنے بڑے بھائی صفی لکھنوی کے ساتھ مشاعرے میں جانا شروع کر دیا۔ ظریف کافی ذہین تھے اپنے بھائی کے ہزاروں اشعار یاد کرتے تھے۔ سلیمان قدر بہادر انہیں بلوا کر ان سے اشعار سنتے تھے۔ انہیں بہت سے دوسروں کے اشعار بھی ازبر تھے۔ انہوں نے ہر موقع کے لئے نظمیں لکھیں ہیں۔ بہت سے مسائل اور حالات کو اپنے انداز میں نظم پیش کیا ہے۔ بقرعید کے دن نل میں پانی نہیں آیا تو بخل آب رسانی لیڈروں کے نا اہل پن پر ہمارے لیڈر، جہاں انہوں نے آشوب اسلام لکھا ہے وہیں شعرِ آشوب بھی لکھا۔ کتاب کے موضوع اور طریقے کی وجہ سے ہم ان کے دوسرے اشعار کا ذکر نہیں کر سکتے ہیں۔

اور آخر میں سارے ہندوستان کے سامعین کو ہنسا ہنسا کر ۳۰ ردسمبر ۱۹۳۷ء کو خود خاموش ہو گئے اور اس خاک میں مل گئے جس میں سب لوگ ملتے ہیں۔ (مطالعہ پیش لفظ)

بھائی صفی نے ظریف کے شعروں پر اصلاح دینی شروع کی ۔والد صاحب کے سبکدوش ہونے کے بعد نوکری کرنے کی ٹھانی ۔ پہلے سلیمان قدر بہادر کے میر منشی پھر پرائیوٹ سکریٹری ہو گئے ۔کچھ عراق میں اپنے ریاست محمود آباد کے یہاں نوکری کی ۔
نوابوں کی صحبت میں رہ کر ظریفانے بہت کچھ سیکھا۔ذاتی خوبیوں میں زیادہ' نیز سائیکل چلانا' شکار اور محفل جمانے

ظفر گورکھپوری

یہ لوگ کیسے اچانک امیر بن بیٹھے
یہ سب تھے بھیک مرے ساتھ مانگنے والے (جدید غزل ص ۲۴۴)

کتنی آسانی سے مشہور کیا ہے خود کو
میں نے اپنے سے بڑے شخص کو گالی دی ہے (جدید غزل ص ۲۴۴)

اب بھیک مانگنے کے طریقے بدل گئے
لازم نہیں کہ ہاتھ میں کاسہ دکھائی دے (جدید غزل ص ۲۱۷)

ظفر الدین ظفر کی پیدائش ۵ ؍مئی ۱۹۳۵ء کو بیدولی, بابو بانس گاؤں (ضلع گورکھپور) میں ہوئی۔۱۹۴۴ء میں اپنے والد صاحب کے ساتھ بمبئ آئے۔ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے۔جدیدیت کے زمانے میں جدت پسندوں کے ساتھ رہے،یعنی "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کے مصداق زندگی بسر کی ابتدا میں ممبئ کارپوریشن کے پرائمری اسکول کے ٹیچر رہے۔ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے ۔ان دنوں بمبئ کے ایک پاش علاقے میں رہ رہے ہیں۔چند فلموں میں گیت لکھے مگر کامیابی ان کے ہاتھ نہیں لگی یہ میدان چھوڑ دیا۔ادبی رسالوں میں چھپتے چھپاتے رہے اور یہی وجہ ہے کہ شعر و ادب کی دنیا میں ان کا نام بڑا اہم ہے۔قوالوں اور غزل سنگروں نے ان کی غزلیں خوب گائی ہیں۔اب تک ان کے ۱۰ ؍مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ان میں تیشہ۔وادئی سنگ، گوگھرو کے پھول بڑے اہم ہیں،بچوں کی نظموں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔تمام صنفوں میں طبع آزمائی کی تھی۔دوہے بھی لکھے ہیں' اس بڑھاپے میں مجھ کو یاد کرتے رہتے ہیں ۔مجھے برمحل اشعار کے لئے دعائیں دیں اور کہا کہ ایسی کتابوں پر ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ ملنا چاہیئے ۔لیکن میں تو جانتا ہوں کہ ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ کسے ملتا ہے' میں خاموش رہا۔

ان کا ایک واقعہ لطیفہ بنا دیا گیا,کرلا کے ایک مشاعرے میں ظفر صاحب

اب بھیک مانگنے کے طریقہ بدل گئے
لازم نہیں کہ ہاتھ میں کاسہ دکھائی دے

والی غزل پڑھ رہے تھے سامعین اس شعر کو خوب پڑھوا رہے تھے ایک صاحب اپنی کار میں بیٹھے مشاعرہ سن رہے تھے انہیں بھی

پسند آیا۔ وہ اسٹیج پر گئے اور ظفر کے ہاتھ میں دس روپیہ تھما دیا، محفل قہقہہ زار ہو گیا۔ آخری عمر میں یہ زندہ دل شاعر بیمار رہنے لگا اور سنیچر ۲۹/جولائی ۲۰۱۷ء جب یہ پیج تیار ہو چکا تھا اس دنیا سے رخصت ہو گیا اور ہماری بدقسمتی دیکھئے بھیونڈی میں رہنے کی وجہ سے (دوری کی وجہ) سے ان کی میت میں شامل بھی نہ ہو سکے۔

ظفر کلیم

آنکھیں نیچی کرکے اپنی راہ چلو
پلکوں سے الفاظ چرا لیتے ہیں لوگ — دیارِ فکر ص۔۱۹

ظفر کلیم کی پیدائش ۵/دسمبر ۱۹۳۸ء کو مہاراشٹر میں ہوئی۔ شاعری سے بلڈر بنے۔ بھویندر نے مذکورہ شعر کی غزل گائی تھی۔ اور بہت مقبول ہوگئی۔ ہر ایک شعر میں تو نہیں ہر ایک غزل میں کوئی نیا شعر ضرور ہوتا ہے اور اسی کو میں شاعری کہتا ہوں۔ اب تو ایسے ایسے شعری مجموعے چھپتے ہیں جن جس میں ایک شعر میری پسند کا نہیں ہوتا۔ بلڈر بننا عقلمندوں کا کام ہے۔ یہ ان کی ہوشمندی ہے, جس سے وہ جانتے ہیں کہ فلاں جگہ بلڈنگ بنائی جائے تو لوگ پسند کریں گے اور اسے خریدیں گے۔ ظفر کلیم نے جس طرح شاعری میں تجربہ کئے ہیں اسی طرح مکان میں بھی نئی نئی کھوج کی ہے۔ ان کی شاعری میں فکر کی گہرائی اور گیرائی ہے جو ان کے اپنے تجربات سے حاصل کئے گئے ہیں۔ انہوں نے مردانہ وار حالات چاہے جیسے ہوں اس سے مقابلہ کیا ہے اس سے پیدا ہوئی بے چینی کا اظہار نہیں کیا۔ ہاں سچائیوں کا اظہار دیدہ دلیری سے کیا ہے۔

ظہور

اگر ہم نہ تھے غم اٹھانے کے قابل
تو کیوں ہوتے دنیا میں آنے کے قابل

چھٹے بھی قفس سے تو کس کام کے ہیں
نہیں جب چمن تک بھی جانے کے قابل

کیا ترک دنیا میں جب تو یہ سمجھے
کہ دنیا نہیں دل لگانے کے قابل — (آوارہ گرد ص ۳۹)

مولوی محمد ظہور علی مولوی فتح علی خان بہادر کے صاحبزادے تھے۔ والد جاگیر دار تھے۔ ۱۸۰۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ درسی کتابیں صدر الدین آزردہ سے پڑھیں۔ ابتدا میں نصیر اور مومن سے اصلاح لی۔ ذوق کے اہم شاگردوں میں آپ کا نام آتا ہے۔ خوش

نویسی کا پہلے پیشہ اختیار کیا۔ بعد میں مدرس ہوئے معمہ حل کرنے میں ماہر تھے۔ دیوان مطبوعہ ہے مگر نایاب ہے۔ (ماخذ خمخانہ جاوید)

زبان داں تھے اور برجستہ کہتے تھے۔ مرثیہ پر کافی دسترس تھا سننے والے عش عش کرتے تھے۔ نادر شاہ نے جب دلی کو اپنے قبضے میں لیا تو اس وقت ظہور ۲ سال کے تھے۔ ایک واقعہ ظہور کے بارے میں امیر اللہ نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے۔ نواب نیابت جنگ کے زمانے میں جب ان کے بھتیجے شہامت خاں نے ایک خوبصورت امام باڑہ بنایا تو ظہور کے والد کو دلی سے بلا لیا اپنے والد کے ساتھ ظہور بھی گئے۔ نواب مبارک الدولہ سے بڑی رغبت رہی اور انہیں کی وجہ سے رہ گئے۔ ۱۸۶ء میں انتقال کیا۔

باب۔۳

عام زندگی میں استعمال ہونے والے اشعار جائزے کے ساتھ

(سماجی سروکار)

باب۔۳ عام زندگی میں استعمال ہونے والے اشعار جائزے کے ساتھ (سماجی سروکار)

اردو غزل تاریخی شواہد کے پس منظر میں زمیں داری اور جاگیرداری دور کی پیداوار ہے، جبکہ اردو زبان تمدنی ضرورت کے تحت پیدا ہوئی ہے۔اس زمانے میں جب فراغت تھی۔فرصت میسر تھی۔ جب ''بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے۔'' کے بغیر وقت کاٹنا محال ہوتا تھا۔اس وقت اربابِ نشاط سے''غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا'' اور عمر رفتہ کو آواز دینے کے لیے فراغت یاب زمیندار اور رنگین مزاج جاگیردار طبقہ اسی الھڑ، چھیل چھبیلی صفِ سخن ''غزل'' کے پیروں میں گھنگھرو باندھ کر خوش وقت اور خوش کام ہوا کرتا تھا۔لیکن بہت جلد غالبؔ، حالیؔ اور سرسید تک آتے آتے، اردو غزل درباداری کے چونچلوں سے بغاوت کر کے علمی اور ادبی سطح پر نمایاں ہوگئی۔پہلی بار حالیؔ نے کہا۔

حالیؔ اب آؤ پیروئ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفیؔ و میرؔ ہوچکی

مصحفیؔ و میرؔ اسی غزل کے ناخدائے سخن تھے، جو عورتوں سے بات کرتی تھی، جو زمینداری اور جاگیرداری دور کے دلچسپ وقت گذاری کے شغل اور اربابِ نشاط کی جنّت کو اپنی چنچل اور خوبصورت غزلوں سے سجا رہے تھے۔حالیؔ اور سرسیدؒ کے بعد اردو غزل اور شاعری میں حقائق کی گہرافشانی، گہرائی، فکر اور بدلتی تہذیب وثقافت کے جلوے سمٹنے لگے اور آہستہ آہستہ اردو غزل اور اردو شاعر دنیا کی عظیم شاعری کے زمرے میں شامل ہوگئی۔

۱۹۳۶ء میں جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، پریم چند اور ڈاکٹر ملک راج آنند نے ادب میں اشتراکی نظریہ کے حامل ترقی پسند ادب کی داغ بیل ڈالی۔اردو شاعری میں نظریاتی ادب کا اضافہ ہوا۔عین اسی کے متوازی اردو غزل کے تعلق سے کلیم الدین احمد کے تصورات بھی سامنے آئے۔غزل ایک وحشیانہ صنفِ سخن ہے۔اس کی گردن بے تکلف مار دینی چاہیئے۔یہ نظریہ آندھی بن کے چل نکلا۔کالی آندھی بن کر اشتراکی نظریہ اور کلیم الدین احمد کی اس رائے نے اردو غزل کا خیمہ ہی اکھاڑ کر رکھ دیا۔غزل، اس کا حسن، اس کا فنّی جوہر پھیکا پڑ گیا۔پروپیگنڈائی شاعری اور ادب کا دور آ گیا۔اس انتہا کا منطقی ردّعمل لازمی تھا۔دو دہائیوں کے بعد ہی جدید ادبی بساطِ شعروسخن بچھا دی گئی۔اردو غزل اور شاعری میں ذات کا کرب سمو دیا گیا۔بے سمتی، بے یقینی اور مایوسی کا احساس اتنا بڑھا کہ کتنے ہونہار اور سوچنے سمجھنے والا دماغ رکھنے والے فنکاروں نے خودکشی کر لی۔کسی نے بھاگتی ریل کے آگے جان گنوادی، کسی نے حد سے زیادہ پی کر، اور کسی نے کسی اور غیر فطری طریقے سے اپنے کو ہلاک کرلیا۔ان کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اردو ادب، اردو شاعری اور اردو غزل میں داخل ہونے والے یہ سارے نظریات امپورٹیڈ اور غیر ملکی تھے۔ان کا اردو تہذیب اور معاشرے کے زندگی بخش اصولوں سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔طرح سے صحافتی اور ہنگامی نوعیت کا ہے، اس کا ادب کے بنیادی تخلیقی عمل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ہر ادبی تخلیق ایک زندہ اور قائم رہنے والا جمالیاتی فن پارہ ہے، وہ اگر مواد اور ہیئت کے ناگزیر اور فطری انضمام سے وجود میں آتا ہے تو وہ زندہ اور نیا ہوتا ہے اور آنے والے زمانوں میں بھی اس کی یہ حیثیت برقرار رہتی ہے، اس کو کسی عہد میں منسوخ نہیں کیا جاسکتا۔'' (نئی نظم کا سفر ص ۳۰)

''ادب بہرحال انسانوں کی تہذیب کا نمائندہ اور پروردہ ہوتا ہے اور یہ سماجی، معاشی، سیاسی اقتصادی اور ہنگامی حالات میں پیدا

ہونے والے تہذیبی تغیرات کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر عبدالحق:

''ادب تہذیب کا پروردہ اور نمائندہ ہوتا ہے، انسانی فکر و شعور کی ترجمانی کے ساتھ ان کے سوز و گداز کی بھرپور کیفیت کا احساس، تخلیقی فن پاروں ہی میں ملتا ہے۔ اردو ادب بطور خاص ہماری ہزار سالہ تاریخ کا ایک دلکش مجموعہ ہے۔ جس میں ان گنت ٹوٹتی بکھرتی تصویریں موجود ہیں۔ اس تہذیب کے ادراک کیلئے اردو کے تخلیقی فن پاروں کا مطالعہ نئی جہت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ادب، تہذیب اور اس کے کوائف کا شفاف آئینہ ہوتا ہے۔'' (متاع سخن ص ۷)

حالات جب اپنی کینچلی اتارتے ہیں، نئے علوم، انکشافاتِ نو بہ نو سے جب امکانات کے دائرے پھیلنے اور سکڑنے لگتے ہیں اس وقت انسانی فکر میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ فکر و نظر کے زاویے بدل جاتے ہیں اور جگر کے لفظوں میں ''ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی سے انسان روشناس ہوتا ہے اور لازماً ادب میں بھی اس کے مظاہرے سامنے آجاتے ہیں اور شعر و ادب اپنے لیے نئی راہ بنانے میں لگ جاتے ہیں۔

غزل اردو ادب کی سب سے قدیم اور سب سے الھڑ صنف سخن ہے۔ غزل کا ذکر آتے ہی تصور بھی سامنے آجاتا ہے جیسے ایک الھڑ شوخ اور چنچل نار اٹھکھیلیاں کرتی نگاہوں کے سامنے گذر گئی ہو۔ بقول غالبؔ

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
عشوہ و غمزہ و ادا کیا ہے

غزل کی تعریفیں بہت مختلف نوعیت کی نہیں ہیں۔ قدیم زمانے سے غزل کی شاعری میں تغزل کو شرطِ لازم قرار دیا گیا ہے۔ بہت سے لوگ لفظی دروبست پر زور دیتے ہیں اور بہت سے لوگ جدّتِ تخیّل سے کام لینے کو بنیادی شرط مانتے ہیں۔ اصل میں یہی وہ لوگ ہیں جو حالات کے بدلتے موسموں کے مطابق غزل میں نئی فکری تخم ریزی کرتے ہیں۔ اردو غزل کو عصری ضرورتوں کے عنوان سے سنوارتے اور ڈھالتے ہیں، اس میں تسلسل، بوقلمونی، تنوع اور امکان کا حسین روپ اجالتے ہیں۔ اردو غزل کا سارا سانچہ یہاں تک کہ اصطلاحات، الفاظ، علائم، استعارے اور بڑی حد تک تشبیہات و تعلیقات تک فارسی سے مستعار ہیں۔ مگر اردو ادب میں انسان کے کائناتی تصورات اور عصری میلانات کا جتنا گہرا عکس ملتا ہے وہ فارسی کیا برصغیر کی دوسری زبانوں میں بھی نظر نہیں آتا۔ اردو غزل کے سامنے دوسری زبانوں کی غزل ایک ایسی دوشیزہ کے روپ میں سامنے آتی ہے جس کا سارا روپ، بناؤ سنگھار اور ساری آرائش اردو غزل کی الھّڑ دوشیزہ کے حسنِ سادہ کے آگے پھیکی پھیکی ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان نے اردو غزل کو معشوق سے بات کرنے کا نام دیا ہے۔ بہت سے اہلِ دل غزل گو اُسے تصوف اور خانقاہوں کی چہار دیواری میں مقید کر دینے کو آبروئے غزل کی بکارت کی حفاظت قرار دیتے ہیں۔

حالؔی نے اردو غزل کو قوم و نیچر سے جوڑ کر ایک نیا روپ انوپ دے دیا ہے، تو ایک آدھ سخت گیر، جلاد قسم کا نقاد اسے وحشیانہ صنف سخن قرار دے کر بے تکلف گردن مار دینے کا قائل ہے، غرضیکہ اردو غزل ایسی معشوقِ ہزار شیوہ رہی ہے کہ اس کے چاہنے والے بے شمار موجود رہے ہیں اور کبھی کبھی کوئی ننگی تلوار لے کر اس الھّڑ چھیل چھبیلی، دوشیزہ کی گردن کاٹنے والا جلاد بھی پیدا ہوتا رہا ہے، اور ان تمام قسم کے لوگوں کے درمیان سے اردو غزل اب تک زندہ و پائندہ ہے اور ایک نئی سج دھج کے ساتھ رواں دواں ہے۔

حالیؔ نے سب سے پہلے غزل کے مزاج کو بدلا، مولوی محمد حسین آزادؔ نے نیا تجربہ کیا، غرضیکہ سماجی اور سیاسی حالات میں غزل کے فارم، ہیئت میں تبدیلی کا عمل جاری رہا اور اس میں ہر موضوع کو سمویا جانے لگا، مقصد ہی غزل کا دور شروع ہوا، غزل میں وسعت پیدا ہوئی، یہ اس بات کا ثبوت اور دلیل ہے کہ اردو غزل ایک زندہ شاعری ہے جو کسی دور میں بھی جمود، خمود اور تعطل کا شکار نہیں ہوئی، ایک وہ بھی دور تھا، جب عمر رفتہ کو آواز دینے کیلئے غزل کہی جاتی تھی اور شاعر کہتا تھا ۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

یعنی عمر رفتہ کی شوخیوں اور مستانہ روی کے ساتھ غزل کا انسلاک تھا، اور غالب کو مجبوراً کہنا پڑا ۔

بقدر ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کیلئے

حالیؔ کے بعد غزل میں وسعت اور تازگی آئی اور اس میں تمام خیالات کا اظہار کیا جانے لگا۔ غمِ دوراں، غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ اردو غزل میں شامل ہوگیا۔

۱۹۳۶ء کے بعد جب اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک برپا کی گئی تو برائے چندے یہ مہتاب گہن میں آ گیا، نظم میں نئے تجربات، پروپیگنڈے کی شاعری کو فروغ ہوا۔ غزل پس منظر میں چلی گئی لیکن زندہ رہی، وہ طوفانی دور بھی گذر گیا، پھر غزل نئے انداز سے بن سنور کر سامنے آ گئی۔

لیکن یہ بیسیوں صدی کا نصف اختتامی زمانہ تھا۔ اس میں علوم کی فراوانی ہوئی اور اس طرح ادب اور زبان کا ٹوٹا ہوا رشتہ دوبارہ جڑ گیا۔ غزل میں بھی حسن کاری کو بنیادی اہمیت حاصل ہوگئی، مقصدیت دھند لکے میں کھوگئی اور نئی غزل کے خال وخط نمایاں ہونے شروع ہوگئے، یہ کوئی ۱۹۶۰ء کے قریب کا زمانہ ہے، ترقی پسند ادبی تحریک ''چل ساتھی کچھ کام کریں، ریل کا پہیہ جام کریں'' کا راگ الاپ کر خود بھی غزل کی عشووں، غمزوں میں لوٹ آئی۔ سردار جعفری جیسا شاعر، جس نے ''نئی دنیا کو سلام'' جیسی طویل نظم لکھی ہے، وہ غزل کی طرف مائل ہوئے اور کہنے لگے۔ ''شکایتیں تو بہت ہیں حکایتیں تو بہت، مزہ تو جب ہے کہ یاروں کے رُو برو کہئے'' اس کے باوجود نئی غزل بے سمتی کا شکار رہی اور عجیب کاواک شاعری ہونے لگے، مثال کے طور پر

سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیئے رات ہوگئی

☆

رہے کرسیوں پر ہمکتے بدن
مگر ٹیبلوں کا یہ حصہ نہ تھے

اور جب اس نئی غزل میں استواری آئی تو مظہر امام نے کہا ۔ سمندروں سے گہر کب کے ہوگئے ناپید

اپنی ابتداء کے دس پندرہ برسوں بعد نئی غزل میں بامعنیٰ اور مقصدی تبدیلیاں آنے لگیں، نامانوس زبان، ادق الفاظ اور گنجلک تراکیب متروک ہوگئیں اور ایک تازہ اور زیادہ نکھری غزل کا روپ سامنے آیا، جس نے تمام تکلفات اٹھا کر کنارے رکھ دیئے۔ یہاں تک کہ فارسی زبان کا قلادہ بھی بڑی حد تک اتار دیا۔ڈاکٹر وزیر آغا نے اس سلسلے میں بڑی صاف بات کہی ہے۔

’’نئی اردو غزل نے ان علامات کو ترک کر دیا ہے جو ایران اور اس کے معاشرتی ماحول سے مستعار تھیں اور جنہیں کلاسکی اردو غزل نے حرز جان بنائے رکھا تھا۔اب غزل گو شعراء نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھول کر اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی دھرتی کو بغور دیکھا ہے جہاں انہیں پیڑ، جنگل، برف، گھر، دھوپ، سورج، دھواں، آندھی، سانپ، منڈیر، کبوتر، دھول، چاندنی اور دوسرے درجنوں مظاہر اور اشیاء اپنے تازہ علامتی رنگوں میں نظر آتی ہیں۔‘‘ (سالنامہ اوراق لاہور)

یہی وجہ ہے کہ اپنے ایمان کے تقاضوں کے پیش نظر (حب الوطنی ایمان کا جزو ہے) ہندوستانی علمائے اسلام اور ہمارے اسلاف نے حریت وآزادی اور غیر ملکی استعمار سے گلوخلاصی کے لئے ان گنت قربانیاں دیں لیکن یہ ستم ظریفی حالات نہیں تو اور کیا ہے کہ وہی لوگ اور ان کے ورثاء الزامات کی زد پر ہیں، ان نسلوں کو طعنہ دیا جاتا ہے کہ وہ رہتے تو ہیں، ملک کی سرحدوں کے اس پار، مگر ان کی نگاہیں سرحدوں کے اس پار لگی ہوئی ہیں۔ان کی نسلیں اگر اپنا حق طلب کرتی ہیں اپنی ابتداء کے دس پندرہ برسوں بعد نئی غزل میں بامعنیٰ اور مقصدی تبدیلیاں آنے لگیں، نامانوس زبان، ادق الفاظ اور گنجلک تراکیب متروک ہوگئیں اور ایک تازہ اور زیادہ نکھری غزل کا روپ سامنے آیا، جس نے تمام تکلفات اٹھا کر کنارے رکھ دیئے۔ یہاں تک کہ فارسی زبان کا قلادہ بھی بڑی حد تک اتار دیا۔ڈاکٹر وزیر آغا نے اس سلسلے میں بڑی صاف بات کہی ہے۔

’’نئی اردو غزل نے ان علامات کو ترک کر دیا ہے جو ایران اور اس کے معاشرتی ماحول سے مستعار تھیں اور جنہیں کلاسکی اردو غزل نے حرز جان بنائے رکھا تھا۔اب غزل گو شعراء نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھول کر اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی دھرتی کو بغور دیکھا ہے جہاں انہیں پیڑ، جنگل، برف، گھر، دھوپ، سورج، دھواں، آندھی، سانپ، منڈیر، کبوتر، دھول، چاندنی اور دوسرے درجنوں مظاہر اور اشیاء اپنے تازہ علامتی رنگوں میں نظر آتی ہیں۔‘‘ (سالنامہ اوراق لاہور)

یہی وجہ ہے کہ اپنے ایمان کے تقاضوں کے پیش نظر (حب الوطنی ایمان کا جزو ہے) ہندوستانی علمائے اسلام اور ہمارے اسلاف نے حریت وآزادی اور غیر ملکی استعمار سے گلوخلاصی کے لئے ان گنت قربانیاں دیں لیکن یہ ستم ظریفی حالات نہیں تو اور کیا ہے کہ وہی لوگ اور ان کے ورثاء الزامات کی زد پر ہیں، ان نسلوں کو طعنہ دیا جاتا ہے کہ وہ رہتے تو ہیں، ملک کی سرحدوں کے اس پار، مگر ان کی نگاہیں سرحدوں کے اس پار لگی ہوئی ہیں۔ان کی نسلیں اگر اپنا حق طلب کرتی ہیں تو انہیں غیر ملکی کہہ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ یہ نسلیں، ہندوستان ہی کو اپنا وطنِ عزیز سمجھتی ہیں۔اس بات کو اردو غزل کے شعراء نے بڑی فنکاری سے بیان کیا ہے۔

دفن کتنی ہوگئیں، نسلیں یہاں
آج بھی یہ گلستاں میرا نہیں
ساحل احمد

کیوں ہم سے پوچھتے ہو کہ ساکن کہاں کے ہیں

ہندوستان میں رہتے ہیں ہندوستاں کے ہیں
محسن زیدی

ہندوستان کا سچا وفادار میں ہی ہوں
قبروں سے پوچھو اصل زمیں دار میں ہی ہوں
ڈاکٹر بشیر بدر

تم جن کے نیچے بیٹھ کے اوتار ہوگئے
ان برگدوں کا میں بھی پرندہ ہوں دوستو!
بشیر بدر

ان حالات میں اس نسل کی بے بسی دیکھئے۔زبان زد اشعار سے کس طرح اپنے جذبے کا اظہار کیا گیا ہے وہ دیکھتے چلیں۔

اس نے کس ناز سے بخشی ہے، مجھے جائے پناہ
یوں کہ دیوار سلامت ہو، مگر گھر نہ رہے
مظہر امام

اکھاڑے گئے سایوں سے کھیلنے والے
ہزاروں سال کا گاڑا ہوا دفینہ تھا
مظہر امام

خود اپنا خوف رہا دل میں یوں سمایا سا
کہ جیسے پاس کوئی سانپ سرسرایا سا

آزادی،موجودہ نسلوں کے ان بزرگوں کی دین اور متاعِ گراں بہا ہے جنھوں نے اپنے لہو سے مجس وزنداں کی تاریکیوں میں روشن کی تھی۔اپنے بچوں کے مستقبل کو زندان ودار کے حوالے کر دیا تھا مگر سیاست دانوں اور دھرم واد کے نام پر ان کی نسلوں کو اس کا کوئی بھی ثمرہ نہیں مل سکا بلکہ خود اپنے خون سے غسل کر کے وطن کی سرفرازی کا افتخار تلاش کرنا پڑا۔جمشید پور، بھاگلپور، مرادآباد، سورت، احمد آباد، بھیونڈی، مالیگاؤں اور بمبئی میں جو کچھ کھیل کھیلا گیا وہ اسی خون کے ساتھ کھیلا گیا،جن کے بزرگوں نے ان کے مستقبل کو داؤ پر لگا کر ملک کو آزاد کرایا تھا۔۶ دسمبر ۹۲ء کو تاریخ کا وہ بھیانک لمحہ بھی اس مظلوم نسل کے سر سے گذر چکا ہے،جس نے اس کو حساس، چاق و چوبند بنادیا ہے۔آج بھی اس کا سلسلہ جاری ہے۔یہاں تک کہ اب تو ہندوستان کا کوئی بھی خطہ اس سے محفوظ نہیں رہ گیا ہے۔ان حالات کے تناظر میں نئی غزل نے خود کو نہ صرف یہ کہ زندہ رکھا ہے، بلکہ اسمیں سوز و گداز، درد اور کسک کے ساتھ ساتھ عصری یا سیت کو بھی سمودیا ہے جو کہ آج کی نسل میں غیر محسوس اور لاشعوری طور پر پیدا ہوگئی ہے۔

ایسا ماحول، فسادوں کے سوا کیا دے گا
سرفروشی کا وفاؤں کا صلہ کیا دے گا
ڈاکٹر اختر نظمی

دور تک مکینوں کے نقش پا نہیں ملتے

کون سا کھنڈر دیکھوں کون سا مکاں دیکھوں

ہر ایک کام سلیقے سے بانٹ رکھا ہے
یہ لوگ آگ دکھائیں گے یہ ہوا دیں گے

عارفؔ یہ کیسے موڑ پہ آئی ہے زندگی
اپنے لہو کا ذائقہ اپنی زبان پر
سید عارفؔ

حالیؔ نے غزل میں اصلاح اور تبدیلی کی جس کوشش کا آغاز کیا تھا ایک صدی کے تعامل کے بعد آج اس غزل میں وہ وسعت پیدا ہوگئی ہے کہ دو مصرعوں میں انفس و آفاق کے حقائق بیان کئے جانے لگے ہیں۔ نظموں کا سلسلہ اگر چہ جاری ہے لیکن غزلیہ شاعری کے مقابلے میں اس کی رفتار ابھی مدھم ہے۔ تاہم غزل میں غزل مسلسل کی صنفِ سخن نے ایک طرف غزل کی تنگنائے کو اور زیادہ وسیع کر دیا تو دوسری طرف عصری تقاضوں کو بھی اس ذیل میں حسن کاری اور صنّاعی کے ذریعے پیش کر کے اردو غزل کو جادواں اور پیہم رواں کر دیا۔ نئی غزل میں ''تغزل'' کے طور پر کسی خیالی محبوبہ کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ شاعر عرش وفرش کے درمیان صنّاعی کے کرشمے نہیں دکھاتا، اس کے اپنے زمانے اور عہد و عصر میں جو کچھ ہورہا ہے، اور اس کے جو کچھ برے بھلے اثرات اس پر پڑ رہے ہیں اسے غزل کے دو مصرعوں میں پرو کر نقوش اجاگر کرتا چلا جاتا ہے۔ نئی شاعری تاریخ اور وقائع نگاری نہیں لیکن اگر غزلوں کو جمع کر کے وحدتِ تاثیر کی بنیاد پر پرکھا جائے گا تو اس دور کی کہانی شعری پیکر میں مجسم ہو کر سامنے آجائے گی۔

آج کا انسان غم زندگی سے نڈھال ہے، تو نئی غزل میں بڑی بے باکی سے اس کا اظہار کیا گیا ہے اور پوری جرأت کے ساتھ غم کا سامنا کرنے کا جذبہ اس میں اجاگر کیا گیا ہے۔ روایتی غزل کی طرح یاس وقنوط کے عالم میں افرار میں نجات کی تلاش نہیں کی جارہی ہے۔ آج شاعر عصری غم کو گلے لگانے کی بات کرنے لگا۔ یہ وہ شاعری ہے جس میں عظمت کے انداز تو ہیں۔ اس کی اداؤں میں ہر دور کو متاثر کرنے کی صلاحیت تو ہے۔ افرار نہیں۔ حالات سے متاثر ہو کر جو کچھ ہورہا ہے اس کو اسی انداز میں پیش بھی کر رہی ہے۔

پھر بسیں ٹولیوں میں جلا دی گئیں
دلہنیں ڈولیوں میں جلادی گئیں

فسادات نے وطن عزیز کی نیک نامی ہی کو مجروح نہیں کیا ہے۔ ترقیات کو بھی روک دیا ہے۔ جو اگر فسادات نہ ہوتے تو آج معلوم نہیں کس مقام اور بلندی تک پہنچ گئی ہوتی۔ فسادات نے نہ صرف افرادی قوت کم کی ہے بلکہ ترقیات کو تباہ و برباد بھی کیا ہے۔ صدیوں کے رشتوں کا قتل کیا ہے، صدیوں کی گئی تعمیرات کو بھی زمیں بوس کر کے رکھ دیا ہے، شہروں کو ویران اور تباہ حال کر کے رکھ دیا ہے۔ شہروں کی تعمیر، اس کی آبادی کوئی کھیل نہیں، صدیاں اس پر گذر جاتی ہیں جب ایک شہر اور بھرا پرا شہر آباد ہوتا ہے۔ اردو غزل نے اس کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔

بستی بسنا سہل نہیں ہے، بستے بستے بستی ہے لیکن نصف صدی میں اس ملک میں جو کچھ ہوا ہے اردو غزل نے اس کو بھی اپنے دائرے

میں سمیٹ لیا ہے۔فضیل جعفری کے لفظوں میں ۔

سر صحرائے دنیا پھول، یوں ہی تو نہیں کھلتے
دلوں کو جیتنا پڑتا ہے تحفوں میں نہیں ملتے

یہ کیا منظر ہے جیسے سو گئی ہوں سوچ کی لہریں
یہ کیسی شام تنہائی ہے پتے تک نہیں ہلتے

جو بھر بھی جائیں دل کے زخم، دل ویسا نہیں رہتا
کچھ ایسے چاک ہوتے ہیں جو جڑ کر بھی نہیں سلتے

اس عصری غزل اور حالات حاضرہ کا تعلق اب اس قدر قریبی ہو چکا ہے کہ ایک طرح سے اردو غزل کی شناخت ہی عصری حالات بن کر رہ گئے ہیں۔اختلاف ذہن وفکر اور نظریاتی کشمکش کے باوجود نئی اردو غزل، عصری حالات کے تقاضے کو اپنے اندر بدرجۂ آخر محفوظ رکھے ہوئے ہے۔

''جدید غزل کے فکری دھارے خواہ کتنے ہی مختلف النوع، بلکہ متضاد اور ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے ہی کیوں نہ ہوں، اس کے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہونا قطعی غیر ضروری ہے، کیونکہ غزل کے سدا بہار گلشن میں نہ کبھی خزاں آئی ہے، نہ آسکتی ہے اور اگر آئے گی بھی تو فصل بہار کا پیش خیمہ ہوگی۔(جدید غزل کی فکری اساس)

شاعری میں ذات کا کرب شامل ہو اور اسے آفاقی وسیلۂ اظہار میسر ہو تو اس کی فنی بلندی کا اندازہ لگانا مشکل ہے یہ وہ آفاقی وسیلۂ اظہار ہے جو ترسیل کے المیہ کا شکار نہیں ہے، نہ اس میں پروپیگنڈے، تبلیغ اور پرچار کے آثار ہی دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ندا فاضلی کا ایک شعر سنئے، ریاکاری، ظاہر داری اور مکاری حالاتِ حاضرہ کا وہ ملمع ہے جس نے اقدار کا مفہوم ہی مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔

میری غربت کو شرافت کا ابھی نام نہ دے
وقت بدلا تو تری رائے بدل جائے گی

غربت آج کی سب سے نمایاں اور پامال اصطلاح ہے، ایک ذاتی تجربہ جو عصری حسیت کے آئینہ خانے میں اقدار کی شکست و ریخت اور بکھراؤ کا پہلو اجاگر کر رہا ہے۔اردو کے مشہور ادیب اور نقاد سلیم شہزاد کے اس شعر کی طرف آیئے۔

جہاز ڈوب گئے، سندباد ڈوب گئے
جنونِ جستجوئے بحر و بر میں کوئی

تن آسانی کے حالات کی اس سے صحیح ترجمانی اور کیا ہو سکتی ہے۔جدید دور کی انسان کی سہل انگاری اور بے عملی کے لیے سلیم نے جن لفظوں کو لے کر شعر کا پیکر تراشا ہے۔

خطابت وہ فن ہے جو سننے والوں کے جذبات میں ایک ارتعاش پیدا کرتا ہے خطیب سامعین کے جذبات جوش و جذبہ میں میں شدت اور تیزی لانے کی کوشش کرتا ہے اس کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ کہے سامعین کے دل میں اس طرح اتر جائے کہ وہ بے ساختہ بول اٹھے ۔ دیکھنا تقریر کی لذت کی جو اس نے کہا میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

شاعر نے اسے تقریر کی لذت سے تعبیر کیا ہے اللہ کے مقدر کا کام سننے والوں کے جذبات کو برانگیختہ اور بھڑ کانا ہے خطیب زبان میں چاشنی اور لذت پیدا کرنے کے لیے حوالہ کے مصرع و اشعار کے علاوہ اپنے جسمانی حرکات وسکنات میں لوچ کہ آنکھوں میں مٹک تو ہاتھوں میں لٹک' گردن کی جھٹک اور اپنی ادا کاری سے زور بیان پیدا کرتا ہے اور ان تمام کے دوران وہ زبان زد اشعار کو بھی استعمال کرتا ہے اور اتنی بے ساختگی سے جیسے یہ مصرع اشعار جو ادا کرتا ہے وہ اس موقع کے لیے کہے گئے ہوں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کا ذہن وفکر بے طرح شکار شعر اور وہ معمول ہو جاتا ہے ویسے حالی لکھتے ہیں شعر کی بڑی خوبی یہی سمجھی جاتی تھی کہ ادھر قاری کے منہ سے نکلے اور ادھر سامع کے دل میں اتر جائے۔

دشمنی:- انسانی جذبوں میں ایک شدید ترین جذبہ دشمنی کا جذبہ ہوتا ہے۔ اس جذبے کے ہاتھوں اب تک اَن گنت پھلواریاں اُجڑی ہیں۔ نوشگفتہ غنچے بکھر گئے ہیں۔ آج کی دنیا میں فرد، سماج، محلّہ، شہر، مُلک اور ملکوں کے درمیان اس جذبے کی وجہ سے دھوکا دَھڑی اور لہو کا کاروبار جاری ہو گیا ہے۔ ملاحظہ ہو بہار کے غزل گو شاعر ڈاکٹر نیازؔ کہتے ہیں ۔

اس دَور میں ہم آئے، اے یار جیئے دیکھا
احباب کو ہاتھوں میں تلوار لئے دیکھا

یہ تلوار کوئی وجود اور پیکر نہیں رکھتی۔ مگر احباب کی شہ رگ، رگِ گلو کاٹنا اس کا کام ضرور ہے۔ اس کے باوجود آج کے انسان اور اس کے تعلقات میں جو دنیاداری آ گئی ہے، نئی غزل نے اس کا بھی احاطہ کیا ہے۔ دل ملے، ملے نہ ملے، مگر ریا کے ساتھ ہاتھ ملاتے رہنا، آج عام ہے۔

دشمنی لاکھ سہی، پھر بھی نبھاتے رہیے
دل ملے یا نہ ملے، ہاتھ ملاتے رہئے (بشیر بدرؔ)

عصری ادب میں انسان کی نمائندگی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے، آج کا شاعر کہیں یا آج کا انسان وہ جانتا ہے کہ دشمنی کوئی مستقل جذبہ نہیں، عارضی ہیجان ہے۔ جو ایک وقتِ خاص کے بعد تھم جاتا ہے اور تب انسان اپنے اس جذبے کے ہاتھوں تھک سا جاتا ہے۔

دشمنی کا سفر اک قدم دو قدم
تم بھی تھک جاؤ گے، ہم بھی تھک جائیں گے

دوست میں دشمن:۔

حفیظ میرٹھی نے کہا ہے۔

دیکھا جو تیر کھاکے کمیں گاہ کی طرف

اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

عدم نے کہا ۔

دل ابھی پوری طرح ٹوٹا نہیں
دوستوں کی مہربانی چاہئے

دوستوں سے وفا کی امید
کس زمانے کی بات کرتے ہو

آیئے ہم آپ کو حالات کے ساتھ ساتھ اشعار بھی پیش کرتے ہیں ۔

❁ عابدؔ کرہانی (-حیات)

تھا شور کہ دشمن پیئے یلغار نکل آئے
دیکھا تو ہمارے ہی کئی یار نکل آئے

☆

غیروں کو کیا پڑی ہے کہ سوا کریں ہمیں
ان سازشوں میں ہاتھ کسی آشنا کا ہے

❁ فکر بجنوری

قتل اپنا اپنے ہی احباب کے ہاتھوں ہوا
کام ہی اتنا بڑا تھا غیر کر پاتے بھی کیوں

غزل کا ایک مکمل شعر ہے۔ جو زندگی کی سچائی کا عکاس ہے۔ آج کی دنیا جس کا مشاہدہ چشم سر سے کر رہی ہے۔ نئی غزل بے سمتی، بے راہ روی اور لامقصدیت کی ڈگر کو چھوڑ چکی ہے اور اس نئی غزل میں اقدار کی چھوٹ اتنی شدّت سے پڑ رہی ہے کہ اندھے عقائد اور نظریات کے قبیح چہرے اس کی روشنی میں صاف دکھائی دیتے ہیں۔ اوپر جو اشعار پیش کئے گئے ہیں۔ ان میں سچ اور جھوٹ کی۔

خلوص اور مکاری:

نئی غزلیہ شاعری میں اقدار کی قوس قزح بکھری ہوئی ہے۔ نئے شاعروں نے اقدار کو شجر ممنوعہ نہ سمجھتے ہوئے غزلیہ شاعری کا موضوع بنا کر جو حسین تجربہ کیا ہے۔ اس نے اردو اور اردو کی غزلیہ شاعری کے لیے مزید صدی صدی زندہ رہنے کے قابل بنا دیا ہے ورنہ چیستاں غزلیہ شاعری نے اسے معاشرے اور سماج سے الگ کر کے اجنبی اور عجائب گھر کی چیز بنا دیا تھا۔

بعض مرتبہ حد سے زیادہ خلوص سے ملنا بھی شبہات کو جنم دینے کا سبب بن جاتا ہے اور تجربہ و مشاہدہ بھی یہی ہے کہ حد سے جو چیز

متجاوز ہوئی، وہ اشتباہ کے خانے میں چلی جاتی ہے اس کا تجربہ مولانا عامر عثمانی کو خوب ہے۔

سبق ملا ہے یہ اپنوں کا تجربہ کر کے
وہ لوگ پھر بھی غنیمت ہیں جو پرائے ہیں

ہم عام بول چال میں اس طرح کے شعر استعمال کرتے ہیں۔اس لئے اب دوستون سے بھی ملنے میں فاصلہ رکھنا بہت ضروری ہے۔ہماری کشتی کو ہمارا ناخدا ہی ڈبوتا ہے۔خزاں تو بدنام ہے چمن کو لوٹنے میں باغبان کا ہاتھ ہوتا ہے۔جو ہمیں ترقی پر لے جاتا ہے وقت آنے پر وہی ہمیں اوپر سے نیچے بھی گراتا ہے۔غیروں کو کیا پڑی ہے کہ رسوا کریں ہمیں۔ان شازشوں میں ہاتھ کسی آشنا کی ہے۔اور جب دشمنی حد سے زیادہ ہوجاتی ہے تو حالات ایسے ہوجاتے ہیں

اب کون بات رہ گئی یہ بات بھی گئے
یعنی کبھی کبھی کی ملاقات بھی گئی

داغ دنیا نے دئے زخم زمانے سے ملے
ان کو تحفے یہ تمہیں دوست بنانے سے ملے

دشمنوں نے جو دشمنی کی ہے
دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے

پھر یہ نوبت آجاتی ہے کہ دشمنون کا پتہ بھی نہیں چلتا ہے وہ کون کون ہیں۔

لاؤ تو قتل نامہ، ذرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

اظہار کی جدّت بعض موضوعات کے حسن میں چار چاند لگانے کا سبب بن جاتے ہیں۔ہم شب و روز مشاہدہ کرتے ہیں کہ بعض لوگ ہمیں اپنی عادات و اطوار اور بھلمنساہٹ کی وجہ سے اتنے پیارے ہوتے ہیں کہ ان سے بار بار ملنے کو جی چاہتا ہے۔کبھی کبھی ایک آدمی میں بیک وقت ایسے دس بیس آدمی ہوتے ہیں جن کی محبوبیت کی ادا اتنی دلبرانہ ہوتی ہے کہ ان سے ملنے کی خواہش اور تمنا ہوتی ہے۔

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا

ندا فاضلی کے ان دس بیس آدمیوں کو کئی بار دیکھنا ایک الگ مسئلہ ہے۔لیکن کئی بار بہت زیادہ اخلاص کی نمائش کرنے والا شک وشبہ کا مرکز بھی بن جاتا ہے۔یہ خلوص بار بار دیکھنے اور ملنے کی خواہش کے برعکس ''پسِ محراب'' دیکھنے کی طرف مائل کرتا ہے۔اسی بات کو ان کے ہمعصر افسر ماہ پوری نے اس طرح کہا تھا۔ پہچان آدمی کی نہیں سہل آج کل۔اک آدمی چھپا ہے ہوا ہر آدمی میں ہے۔جیسا موقع آتا ویسا زبان زد اشعار لوگ یستعمال کرتے ہیں.

غیروں کو بھلا سمجھے اور مجھ کو برا جانا
سمجھے بھی تو کیا سمجھے جانا بھی تو کیا جانا

اور یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ دانشور بہت تنگ نظر بن جاتا ہے۔

قبل آغاز ہی انجام کا ڈر ہوتا ہے
دور اندیش بڑا تنگ نظر ہوتا ہے

لیکن نئی غزل کا شاعر اب اتنا سادہ مزاج نہیں ہے۔ جدید سائنسی ایجادات و اکتشافات حاضرہ نے ''پسِ چلمن'' جھانکنے کا زمانہ ختم کر دیا ہے اور اب تو جو کچھ ''پسِ چلمن'' ہوتا ہے، وہ چلمن کے باہر سے ہی دکھائی دے جاتا ہے فکر میں شفافیت (Transparency) ہو نہ ہو، نئی ایجادات میں ضرور یہ قوت ہے کہ ہر ملفوف شئے کو بے لباس و برہنہ دکھا دیں۔ اسی طرح آج کا انسان بھی ہے۔ وہ آسانی سے کسی کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ریب و تشکیک کے عالم میں وہ یہ ضرور کہہ سکتا ہے۔

جفا کو ہم وفا سمجھے ستم کو ہم کرم سمجھے
ادھر کچھ دل میں تم سمجھے ادھر کچھ دل میں ہم سمجھے

یہی وجہ ہے کہ وہ پردے اور علامت میں بات کرنے سے صاف انکاری ہے۔ آج کا انسان چاہتا ہے، جو بھی کہا جائے، صاف صاف کہا جائے۔ خواہ مخواہ کے لیے الجھنیں نہ بڑھائی جائیں۔

الجھنیں مت بڑھاؤ اب اخترؔ
بات جو بھی ہے صاف صاف کرو

نوبت بہ اینجا رسید کہ آج کا انسان کسی پر بھروسہ کرنے کا روادار نہیں رہا ہے۔ نئی غزل نے اس جذبے کو بھی بڑی خوش اسلوبی سے دو مصرعوں کی کائنات میں سمو کر پیش کیا ہے۔ دوستی اور سوداگری کا کام ایک ہو گیا ہے۔ لوگ اب ہر بات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس منشا مبہم رہتا ہے۔ اسلئے شاعر کہتا ہے۔

زخم کو پھول حقیقت کو گماں کہتے ہیں
لوگ ہر بات سر بزم کہاں کہتے ہیں

ہر قدم پر نت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں روز
دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں روز

مشہور بات ہے۔ بے سبب کوئی کسی پر مہربان نہیں ہوتا۔ اخلاص کا قصہ تو ماضی کی داستان بن کر رہ گیا ہے۔ یوں بھی آج کے انسان کو زندگی اور اس کے علائق نے اس قابل بھی کب رکھا ہے کہ وہ تکلفات اور تمہید کی طوالت کے بعد مطلب کی بات سنئے۔ مشینی زندگی نے انسان کو فرصت دینے کی بجائے اتنا مصروف کر دیا ہے کہ وہ اسی کا حصہ اور جزو بن گیا ہے۔ ان حالات میں وہ لایعنی طوالت برداشت نہیں کر پاتا۔

سچ اور جھوٹ۔

سچ کے بارے میں کہا جاتا ہے اسے کبھی نہ چھوڑا جائے۔ یہ پیری میں عصا ہے اور جوانی میں تلوار ہے۔اور خود بخود یہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھینچے لگتے ہیں اے واعظ
حقیقت خو دکو منوا لیتی ہے منوائی نہیں جاتی

بات کو چاہے جتنا خوشنما بنا کر پیش کروان باتوں میں جب تک سچائی نہیں ہوگی زود اثر نہیں ہوگی۔ یہ سب باتیں برسوں سے بتائی جا رہی ہیں مگر سچ کو دنیا کم منہ لگاتی ہے۔ ہے تو میٹھا پھل مگر اس کو لوگوں نے اپنے عمل سے کڑوا کر دیا ہے۔ دن کو دن اور رات کو رات کہتے ہوئے ڈرتے ہیں۔امید فاضلی نے دنیا کو دیکھ کر یہ کہہ دیا ۔

آسمانوں سے فرشتے جو اتارے جائنگے
وہ بھی اس دور میں سچ بولیں تو مارے جائنگے

ملاحظہ فرمایئے ۔

میں جھوٹ بول کے دریا عبور کرجاتا
مجھے ڈبو دیا سچ بولنے کی عادت نے (ظفر گورکھپوری)

ظفؔر گورکھپوری جھوٹ کے منتر سے دریا پار کر جانے کی بات کرتے ہیں لیکن کہتے ہیں، سچ بولنے کی عادت نے انہیں ڈبو دیا۔شاعر نے اپنی دانست اور فکر میں چاہے جتنی مکمل اور بامعنیٰ بات کہی ہو اور نئی غزل کا سرتاج اور کوہِ نور ہیرا شعر کہا ہو،تشنہ تشنہ اور بین السطور میں بہت زیادہ وضاحت طلب بھی ہے دونوں مصرعوں میں معانی اور مفاہیم کا جو خلاء ہے وہ اس شعر کی سچائی کیلئے استفہامیہ نشان ہے؟

نئی غزل کے ایک اور شاعر احمد فرؔاز جن کی شاعری نے اردو غزل میں اضافہ کیا ہے۔ان کا درج ذیل شعر بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ کہتے ہیں ۔

میں چپ رہا تو سارا جہاں تھا مری طرف
حق بات کی تو کوئی کہاں تھا مری طرف (احمد فرؔاز)

جہاں تک حق بات بولنے کا تعلق ہے اس سے لوگوں کے ردِّعمل کا احساس وادراک تو کیا جا سکتا ہے لیکن خاموشی،کوئی ایسا عمل ہو کہ لوگ ساتھ ہو جائیں۔عقل و قیاس پر مبنی پہلو نہیں ہے۔شاعر کے چپ رہنے پر سارا جہاں اس کے ساتھ ہو،اسے ثابت نہیں کیا جا سکا ہے۔ اسی وجہ سے دوسرا مصرعہ ''حق بات کی تو کوئی کہاں تھا مری طرف'' کے لیے کوئی قرینہ نہیں ملتا۔اسے غزل میں صنّاعی اور کمال کہا جائے گا۔

نسائی آواز عورت جہاں دل بہلانے، وقت گذارنے اور تعیش کے کام کی چیز سمجھی جاتی رہی ہے، اس میں ایک عورت کا اس طرح نمودار ہونا، حیرت کی بات ضرور ہے۔ پروین شاکر اردو غزل اور شاعری کی اولین شاعرہ ہیں، جنہوں نے اردو غزل اور شاعری میں نسوانی جذبات واحساسات کو حقیقی رنگ میں بلا مبالغہ اور کسی اوپری خول اور مصنوعی کھال کے جرأت سے فنّی بلندی اور دروبست کے ساتھ پیش کیا

ہے۔ پروین شاکر نے مردوں کی بے وفائی اور ہرجائی پن کا ذکر جا بجا کیا ہے۔ ہمارے برادرِ نسبتی شبیر احمد کہتے ہیں: ''ان کی شاعری میں صنفِ نازک کی بے چارگی اور بے بسی کا ایسا درد بھرا ہوا ہے، جو اس ہرنی کے اندر بھرا ہوا ہوتا ہے، جو چاروں طرف سے شکاریوں میں گھر چکی ہو، اور بے چارگی اور بے بسی سے اپنے نتھنے کو رگڑ رہی ہو۔ چونکہ غزالہ کے معنیٰ ہرنی ہوتے ہیں، اور شاید یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں اس صنف سخن کو غزل کہا جانے لگا ہو۔''

پروین شاکر کی غزلوں میں نسوانیت کی وہ چیخ چھپی ہوئی ہے، جو ایک غیر مطمئن روح سے ابھری ہے، جو ایک طرف شاخِ گل ہے تو دوسری طرف تلوار بھی ہے۔ انسانی سماج کی ایک عام عورت جو رشتوں میں بندھی ہوئی ہے۔ ایک ایسی شاخِ گل ہے جس پر مرجھائے ہوئے باسی پھول ٹنگے ہوئے ہیں۔ ازدواجی زندگی کی ناخوشی اور عدم توازن کے سبب ان کی غزلوں میں نسوانی جذبات کی حقیقی عکاسی تو ملتی ہے، لیکن ایسی عکاسی جو ایک بااختیار، صاحب وسیلہ نسائیت کی عکاس ہو، اس میں اعلیٰ عہدے پر فائز ایک ایسی بااختیار تلوار کی جھنکار صاف سنائی دیتی ہے، جس میں رزمیے کی نہیں، مرثیے کی لے پائی جاتی ہے۔ جنس کی ناآسودہ تڑپ کا اظہار پایا جاتا ہے۔ ان کے اشعار کو عام بول چال میں استعمال کیا جاتا ہے۔ پروین شاکر کہتی ہیں۔

وہ تو خوشبو ہے ہواؤں میں بکھر جائے گا
مسئلہ پھول کا ہے ۔پھول کدھر جائے گا (ماہ تمام ص۱۸۸)

کمال ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اس کی دلہن سجاؤں گی (ماہ تمام ص۲۱۲)

بادباں کھلنے سے پہلے کا اشارہ دیکھنا
میں سمندر دیکھتی ہوں تم کنارہ دیکھنا (ماہ تمام ص۲۴۱)

جگنو کو دن کے وقت پر کھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہوگئے (ماہ تمام ص)

اردو شاعری میں پروین شاکر ایک پوری نسوانی شاعرہ کی حیثیت سے اپنے عہدہ کا اظہار ہیں۔ ان کی شاعری میں برائے بیت یا برائے غزل کوئی ایسا روایتی شعر دریافت کرنا محال ہے۔ جو مردوں کی شاعری اور غزل کا نشان بر ہو۔ وہ ایک ایسی لڑکی کی بے محابا شاعری ہے جسے زندگی کی ابتداء میں ہی اپنے لڑکی ہونے کا شعور تھا۔ مذکورہ اشعار زبان زد ہوگئے ہیں۔

اس کی شاعری میں ایک لڑکی کے جذبات واحساسات غزل، نظم اور مختلف اصناف سخن میں چیختے ہوئے ملتے ہیں۔ لیکن ان میں بدسلیقی، پھوہڑپن اور احساس کی ایسی شدت نہیں ملتی، جس سے اردو شاعری کا مزاج انکاری ہو، اور اسے قبول کرنے کا روادار نہ ہو۔ اردو شاعری نے اس لڑکی کے معصوم، بھولی، نارسیدہ تمناؤں کے ان پھولوں کو اپنی روایتوں میں شامل کرلیا، جو حجلۂ عروسی میں بھی مرجھاتے رہے اور جن پر کوئی ابر کا ٹکڑا نہ تو سایہ فگن ہوا، نہ برسا نہ قطرات استراحت کا چھڑکاؤ ممکن ہوسکا۔

اقبالؒ نے شاعری کو جزویست از پیغمبری کہہ کر جو فلسفیانہ حقیقت بیانی کا رُخ دیا ہے اس نے ان کی پوری شاعری کو غیر معمولی شاعری بنادیا ہے۔ فلسفہ کے ساتھ ساتھ فکر وفن کا ساتھ ہوجائے تو وہ عظیم شاعری جنم لیتی ہے جو زبان و مکان کی حدود و قیود سے آزاد، آفاقی، غیر فانی شاعری ہوجاتی ہے اور شاعر چاہے باقی نہ رہے مگر اس کی صداؤں کی بازگشت صدیوں پر محیط ہوتی ہے۔

پیشن گوئیاں :۔ علامہ اقبالؒ ایک عظیم فنکار اور ایک مسلمہ فلسفی تھے۔ ان کی شاعری میں اپنے عصر کی چیخ بھی موجود ہے۔ ماضی کا کرب بھی ہے اور مستقبل کی ایسی پیشن گوئیاں بھی ہیں، جو فکرِ اقبال کا منطقی نتیجہ ہیں۔ اقبال اپنے دور کی تاریخ، ادب اقتصادیات، سیاسیات، قانون اور فلسفہ کو اچھی طرح جانتے تھے وہ ان فنون میں خلاقانہ عبور رکھتے تھے عصری فلسفہ میں ان کا مقام و مرتبہ بہت ممتاز تھا اس کا اعتراف آج کے فلاسفر بھی کرتے ہیں۔ اقبالؒ نے اپنی فکر کی اساس فلسفۂ خودی پر رکھی ہے، اور فلسفۂ خودی ان کے یہاں عرفانِ نفس یا عرفانِ ذات کی حیثیت سے موجود ہے۔ انہوں نے فلسفہ کو صرف شاعرانہ تخیل نہیں بنایا ہے، بلکہ اس کے ذریعے ایک مستقل نظام فکر وعمل کی تشکیل کی ہے، اور اس معاشرے کی پیشن گوئی کی ہے جو فلسفۂ خودی کی صداقت پر استوار کیا جاسکتا ہے۔ ان تمام فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے جو صدیوں سے انسان کی خودی کو زنگ آلود کرتے چلے آئے ہیں یا اسے کچلتے اور روندتے رہے ہیں۔ اقبالؒ نے ان پر زبردست تنقید کرتے ہوئے واشگاف لفظوں میں کہا ہے ۔

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ امروز میں
آنے والے دور کی دھندلی سی ایک تصویر دیکھ

اقبالؒ ایک عبقری، نابغہ یا جینئس شاعر تھے، انہوں نے شاعری برائے شاعری نہیں کی بلکہ شاعری کو پیغمبری کے درجے تک پہنچا دیا۔ وہ دانائے راز تھے، مشرق ومغرب کے قدیم وعصری فلسفوں پر ان کو ناقدانہ عبور تھا۔ وہ مغرب کے فلسفوں پر تنقید ضرور کرتے تھے، لیکن ان کی تردید نہیں کرتے تھے، وہ مشرقی فلسفوں کے بارے میں نرم گوشہ ضرور رکھتے تھے لیکن ہمہ پہلو اس کو قبول بھی نہیں کرتے تھے۔ ان کی شاعری جہاں جذبات میں ارتعاش پیدا کرتی تھی تو وہیں حرکت وعمل پر آمادہ بھی کرتی تھی۔ ان کی شاعری میں تحریکیت تھی۔ حالات جو موجود ہیں اس کو بدل کر اس میں صحت مند انقلاب لانے کیلئے انہوں نے اپنی فارسی، اردو کی شاعری، اردو اور انگریزی کے خطبات میں جو کچھ لکھا ہے وہ غیر فانی سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا شمار دنیا کے بڑے فلاسفہ میں ہوتا ہے۔

انہوں نے جب مغرب اور مشرق کے فلسفوں کا تقابلی مطالعہ کیا اور ان کو اپنی فکرِ قرآنی کی اساس پر جانچا پرکھا تو ان کا یقین قرآن اور اس کے فلسفے پر اور گہرا ہوگیا۔ جہاں جہاں مغربی فلسفے اور قرآنی فلسفے میں بعُد اور دوری بلکہ مغائرت ملی انہوں نے کھل کر اس فلسفے پر تنقید کی اور مغربی تہذیب کو ''دوں نہاد'' تہذیب کا نام دیا اور اس کے بارے میں کھل کر پیشن گوئی کی ۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دوکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

حالات ومشاہدات اور اُن سے متفرع ہونے والے تجربات جتنے تلخ اور انسانیت سوز تھے کہ ان کو دیکھ کر علامہ نے مغربی افکار و نظریات پر وہ ضرب کلیمی لگائی کہ ان کو تقریباً پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ مغرب کے نظریات کے زہریلے نتائج کو دیکھ کر انہوں نے برملا کہا ۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

مغربی تہذیب وثقافت کی خونچکالی کے بارے میں علامہ اقبالؒ دانندۂ اسرار تھے۔انہوں نے بالِ جبرئیلؑ میں اس پر تنقید کر کے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ ۔

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اس کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

غالباً ۱۹۰۷ء میں کہے گئے ان اشعار میں انہوں نے مغرب کی بے خدا، بلکہ خدا بیزار تہذیب ومعاشرے کے بارے میں جو کچھ کہا تھا آج مغربی تہذیب ومعاشرت کی شکست وریخت ٹوٹ اور بکھراؤ سے وہ پیشن گوئی حرف بہ حرف راست سامنے آرہی ہے، وہ تہذیب جو خدا پرستی کی بجائے خدا سے بغاوت اور مادیت کی بنیاد پر استوار کی گئی تھی اس کا حشر آج دنیا چشمِ سر سے دیکھ رہی ہے۔ یہ کائنات، یہ آفاق کی کارگہہ شیشہ گری کسی ایسے فلسفے اور نظریئے کی بنیاد پر چلائی نہیں جاسکتی جس کے بارے میں شیشہ گر سے ہدایت نہ لی گئی ہو، خدا کی بستی تجارتی نہیں، نہ انبوہِ تاجراں ہے۔اسے تو اسی کے اصولوں پر چلایا جانا ممکن ہے جو اس کا خالق۔ مالک اور حکمراں ہے۔خدا کی یہ بستی خدا کے بتائے ہوئے اصولوں پر ٹھیک ٹھیک چلائی جاسکتی ہے۔ بے خدائی تہذیب کی ظاہری چمک دمک چاہے جتنی زیادہ نگاہوں کو خیرہ کرنے والی ہو لیکن اقبالؒ کی نظر میں اس کی حیثیت کیا ہے یہ ذیل کے اشعار میں دیکھئے ۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے، چمک تہذیب حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

مغرب کے فلسفے پر اس سے بہتر تنقید اور کیا ہوسکتی ہے کہ یہ ''جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے'' ان اشعار کے پس منظر میں اقبالؔ عالم انسانیت کو آگاہ کرتے ہیں کہ روحانیت اور خدائی بنیاد پر استوار تہذیبی محل کو چھوڑ کر مغرب کے مادہ پرستانہ اور بے خدا ایوانوں میں سرگرداں مت ہونا کیونکہ ۔

وہ فکر گستاخ، جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اُسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

''جس قوم کو اللہ نے دنیا کی رہبری کے لیئے بنایا تھا وہ کیا سے کیا ہو گئے ۔اس کے سینے میں توحید کی امانت ہے۔اس کو مٹانا بہے بہت مشکل ہے انکے رہنےسہنے کا طور طریقہ یہود ونصارا کی طرح ہو گئے ہیں۔سچ کہیں تو اب نہ مزکورہ قومیں بھی انہیں دیکھ کر شرماتے ہیں، اقبال کے زیادہ سے زیادہ اشعار اعام بول چال میں استعمال ہوتے ہیں۔

یہاں چند شعر ہی نمونے کے طور پر دے رہا ہوں۔مولوی حضرات بھی مسجدوں کے خطبے میں ایسے اشعار استعمال کرتے ہیں جسکی وجہ سے اور بھی مقبول ہوتے جارہے ہیں۔''

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدّن میں ہنود

یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

یوں تو سیّد بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو ، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

رہ گئی رسم ِ اذاں ، روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقین ِ غزالی نہ رہی

حرم ِ پاک بھی ، اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلماں بھی ایک

یہ اشعار تحریر اور تقریر میں شامل رہتے ہیں۔

یہ جدید مغربی افکار و نظریات ہی نہیں، تہذیب و معاشرت کے بارے میں ایک اور حکیمانہ پیشن گوئی ہے جو نا قابل تردید سچ بن کر سامنے آ گئی ہے۔

غالب کا اردو شاعری میں جو مرتبہ اور مقام ہے اس میں آج تک ان کا حریف اور مقابل پیدا نہیں ہو سکا۔ ان کی شاعری اتنی تہہ دار ہے کہ ہر بار جب ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو ایک نئے غالب سے آشنائی ہوتی ہے۔ ان کی شاعری اور شخصیت کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں اور پڑھنے والے انکشافاتِ نو بہ نو سے آشنا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بہت سے پہلو تو محققین اور ناقدین کی گرفت میں آ چکے ہیں لیکن بہت سارے پہلو ہنوز پس منظر میں ہیں۔

ابتداء میں تو مجھے غالب کی چند غزلیں ہی سمجھ میں آتی تھیں۔ رفتہ رفتہ غالبؔ کو پڑھتا گیا اور سمجھتا گیا۔ پھر مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ میں نے ان کے اشعار سے ان کی انانیت اور ریب و تشکیک کا پتہ لگایا۔ یہ ایک نفسیاتی تنقید تھی۔

اس مطالعے کے دوران مجھے یہ احساس ہوا کہ غالب کے یہاں حق گوئی اور بے باکی بھی ہے۔

غالب اپنے دوستوں شاگردوں کو خط میں بلا جھجھک اپنی کمیاں اور کمزوریاں کھل کے لکھتے تھے۔ اپنی تباہی، مالی کسمپرسی اور دشواری نے ان کو آزمائش میں ڈال رکھا تھا۔ امتدادِ زمانہ، زیادہ عمر نے ان کو کمزور اور لاغر کر دیا تھا۔ اسی طرح اپنی شاعری میں بھی انہوں نے جگہ جگہ اپنی ناکام، شکست خوردہ اور مایوس ذہن کا ذکر کیا ہے۔ پے در پے پڑنے والی حالات کی ان چوٹوں نے انھیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ محرومیوں اور ناکامیوں کے زخم کو چھپانے کے بجائے انہوں نے لوگوں کے سامنے رکھ دیا اور اس بات کی بالکل پرواہ نہیں کی کہ آنے والا وقت ان کی ان باتوں کو پڑھ کر انہیں حقیر سمجھے گا، ان سے فائدہ اٹھائے گا۔ راز داری کے تعلق سے بہت ساری باتیں عام ہیں۔ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے مگر حرفِ تمنا زبان پر لانا نہیں چاہئے۔ اپنا بھید کسی سے نہیں کہنا چاہئے۔ بات جو حلق سے نکلی وہ پرائی ہوگئی اور آدمی اپنا بھید دوسرے کو کہہ کر روتا ہے۔ یہ تمام باتیں غالب تو جانتے ہی تھے مگر پھر بھی انہوں نے اس کی پرواہ نہ کی اور اپنا راز کھلے عام لوگوں پر عیاں کر دیا۔ یہ دنیا سے بے زاری نہیں ہے یہ دیدہ دلیری ہے، یہ حق گوئی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ انھیں شہرت ان کے اشعار سے ملے نہ کہ ان کی سیرت سے۔

آج بھی ہر آدمی چاہے چھوٹا ہو یا بڑا ہو اپنے مقابل کو اپنی کوئی بات بتاتا ہے تو ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ اس کی زبان سے

کوئی ایسی بات یا راز فاش نہ ہو جائے جس سے لوگ ان کو کسی تکلیف یا پریشانی میں مبتلا کر دیں۔ مگر غالب کا معاملہ ہی دوسرا تھا۔ انہیں تو عام لوگوں سے بھی اس بات کی طرف زیادہ دھیان دینا چاہئے تھا۔ ان کے اشعار سے ان کی کسی محرومی یا نارسائی کے ذکر سے ان کا قد چھوٹا ہو جائے انہیں اس کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ اپنے قد کو خوب جانتے تھے۔ یہ ان کی حق گوئی اور بے باکی ہے۔ غالب خود کہتے ہیں اپنے ذاتی اور نجی حالات اور پریشانیوں نے جو اثرات ڈالے تھے، ان کی بنا پر حدیثِ دل زیادہ بیان کی ہے۔ حدیثِ دیگراں کی ان کے یہاں بہت کم گنجائش ہے۔ اگر ہے تو وہ طنز و تعریض اور چھیڑ چھاڑ سے تعلق رکھتا ہے اور بس، انہوں نے زندگی کبھی ایک جے جمائے نقطۂ نظر کے مطابق نہیں گذاری۔

بقول آلِ احمد سرور ''غالبؔ نے ایک منتشر زاویۂ نگاہ کے سائے میں منتشر زندگی بسر کی، اور ہمارے لیے ایسی شاعری چھوڑی جو روحانی ہم آہنگی سے قطعی معرا ہے۔''

یہ رائے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''یہ نو آبادیاتی دور کا سطحی تبصرہ ہے۔ زندگی کی کثرت میں وحدت کی تلاش اور زندگی کو کسی مخصوص زاویۂ فکر سے دیکھنے کی کوشش یا اس کی کوئی تعبیر یا تفسیر جیسی اقبالؔ نے کی ہے۔ یقیناً حق بجانب ہے لیکن زندگی کو آئینہ دکھانے، اس پہنائی، تنوع، تضادات پر نظر جمائے رکھنے اور چاہئے کی بجائے ''ہے'' پر زور دینے کا جیسا کہ شکسپیئر اور غالبؔ نے کیا ہے، یہ جواز بھی تسلیم کرنا چاہئے۔''

(غالبؔ کی شاعری کی خصوصیات اور عوام میں مقبولیت)

مجھے تو آل احمد سرور صاحب کی یہ رائے خود متضاد نظر آتی ہے۔ ایک طرف تو وہ اقبالؔ کی نظریاتی شاعری کو تسلیم کرتے ہیں لیکن دوسری طرف غالبؔ کی بے سمت شاعری کو بھی جواز کا مرتبہ دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دراصل غالبؔ کی شاعری میں وہ نظریاتی استحکام اور آہنگ نہیں ملتا جو انسان کو ہر حالت میں مستقل مزاج بنائے رکھتا ہے اور اس کا سبب ان کی یتیمی بھی ہے، غالبؔ کے والد کا انتقال ان کے بچپن میں ہو گیا ان کی پرورش ان کے چچا نے کی تھی جو غالبؔ کی ۱۲ برس کی عمر میں جنگ میں مارے گئے۔ چچا کے وظیفے پر گذر اوقات ہوتی رہی۔ مزاج شاہانہ تھا۔ شاعر تھے، شوقین مزاج تھے۔ وظیفہ اتنا نہیں ہوتا تھا کہ وہ فراغت سے زندگی گذار سکیں۔ ان کی زندگی بڑی کسمپرسی سے عبارت رہی۔ شعر گوئی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ بہت کم عمری میں ہی انہوں نے اچھے شعر کہنے شروع کر دیئے تھے۔ غالبؔ عصری علوم سے نابلد تھے۔ یہ وہ علوم تھے، مغربی ملکوں میں جن کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا، ان کی شاعری میں ان کے زمانے کے تمام علوم کا اثر نہیں ملتا۔

ان کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ ایک ہی بات کا کہیں اقرار کیا ہے تو کہیں اس کی نفی کی ہے، حالات کی شعلہ سامانی، مزاج کے تلوّن اور بے مہریٔ مقدر سے وہ اپنی بات پر اٹل نہیں دکھائی دیتے۔ حالانکہ شاعری کی اُس عمر کو وہ پار کر چکے تھے جس کے بعد انسان کے کلام اور کردار میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ اس کی اپنی ذاتی شناخت اور پہچان قائم ہوتی ہے، اس کا اپنا اسلوب، اپنی زبان، اپنا بیان اور اپنا لہجہ بن جاتا ہے۔ مایوسی کا یہ عالم ہے کہ کہتے ہیں۔

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

ان کی ساری زندگی مایوسی اور ناکامی کی داستان بن کر رہ گئی ہے۔ مایوسی ان کے کلام اور زندگی کی شناخت سی بن گئی ہے۔

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

حالت یہ ہے کہ وہ اپنی محرومی کا شکوہ بھی کسی سے کر نہیں سکتے۔ مرنے کی کوشش کر کے دیکھ چکے۔ وہ مر بھی نہ سکے۔

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

اس طرح غالبؔ کی شخصیت و کردار، مایوسی، دل شکنی اور تقدیر کی بے مہری کے باعث متضاد بن کر رہ گئے تھے۔ یہی نہیں دنیا کے جتنے اور بھی دُکھ تھے وہ بقول غالبؔ ان کے نام کے ساتھ مقدر ہو چکے تھے۔ وہ دُکھ جو کسی کو نہیں ملا، وہ فتنہ جو کہیں اور برپا نہیں ہوا وہ سب میرے نام پر نازل ہوئے، غالبؔ کا حصہ ہوئے۔ ہر روز کا دُکھ اور ہر روز کا فتنہ غالبؔ کے اشعار میں جا بجا مذکور ہے۔

نام کا میرے ہے وہ دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے، وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

غالبؔ کی شخصیت جن اجزاء سے عبارت تھی ان میں چڑ چڑے پن کو راہ مل گئی تھی۔ بدرجۂ آخر انہوں نے یہاں تک کہہ دیا۔

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

ایک ہی سانس میں وہ دو قسم کی باتیں کہتے ہیں، دو متضاد باتیں جن سے ان کی شخصیت کے ریب و تذبذب کا احساس ہوتا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

زندگی اپنی کچھ اس شکل سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

لیکن دوسری ہی سانس میں ان پر ایک اور جذبہ غالب ہو جاتا ہے اور وہ کہتے ہیں۔

سفینہ جب کہ کنارے سے آلگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناروا کہیے

محولہ بالا اشعار سے غالبؔ کی شخصیت کا جو پیکر اور زندگی کا جو روپ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ غالبؔ نے بڑی کسمپرسی کے عالم میں زندگی گذار دی۔ وہ زندگی سے بے زار تھے، محض اس لیے کہ وہ زندگی سے جو حاصل کرنا چاہتے تھے، وہ ان کی دسترس سے باہر تھی لیکن زندگی کے تماشائے روز و شب کو خوب جانتے تھے کہ یہ نگار خانہ کیوں آباد ہے۔ اردو کے ممتاز محقق اور نقاد عبدالرحمٰن بجنوری نے لکھا ہے کہ:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے آگے

اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے
☆
کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
☆
میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دئے ہوتے

عبادت و بندگی کے بارے میں وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ۔

بندگی میں بھی وہ آزاد و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھرآئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

اپنی خودداری کا ذکر وہ اتنے زورشور سے کرتے ہیں لیکن ساری زندگی وہ بہادر شاہ ظفرؔ کی غلامی کی چاہت میں بھی اپنی شان سمجھتے رہے۔استاذِ شہ خاقانی ہند ذوقؔ سے ان کے معرکے تاریخ اردو ادب کا سرمایہ بن گئے ہیں جن میں سے ایک میں انہوں نے بڑی لجاجت سے معذرت خواہانہ انداز میں کہا ہے۔

استاذِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب، یہ مجال، یہ جرأت نہیں مجھے

حالانکہ اس چھیڑ چھاڑ کی شروعات بھی غالبؔ نے ہی کی تھی۔شہزادہ جواں بخت کا سہرا لکھتے ہوئے مقطع میں انہوں نے ذوقؔ پر کھُلا طنز کیا تھا۔

ہم سخن فہم ہیں، غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

اور استاد ذوقؔ نے جواب میں نہایت مرصّع سہرا لکھ کر مقطع میں جواب دیا تھا۔

جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سنا دے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

اس کے بعد غالبؔ نے معذرت میں جو اشعار کہے وہ اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں لیکن یہاں بھی انہوں نے طنز کے تیر چلائے ہیں ۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آباء سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

یہ سب اشعار لوگوں میں پڑھے جا رہے ہیں اور استعمال کئے جا رہے ہیں۔ میں نے تفصیل سے کن کن حالات میں شعر پڑھے

جاتے ہیں وہ بتایا ہے۔

❁❁❁

اس کا گذشتہ باب میں میں نے اشارہ دیا تھا کہ مقررین مضمون نگار شاعر اور لیڈر حضرات زبان زد اشعار کو اپنی تحریر اور تقریر کے لئے استعمال کرتے ہیں اس سے تقریر کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور مقبول بھی ہوتی ہے میں نے کتابوں میں پڑھا ہے جوش اور کئی شعر اء اپنی بات میں اشعار کا استعمال کر کے اپنے مدِ مقابل کو زیر کرتے تھے اور اپنی اہمیت بتاتے تھے کہ ان کا شاعری سے ادب سے بہت لگاؤ ہے یہ تو ہوئے شعرا اور ادبا کی بات۔

عام زندگی میں بھی اس طرح کے اشعار استعمال کیے جاتے ہیں جن کا ادب سے لگاؤ ہوتا ہے صرف ایسے لوگ ہی نہیں دوسرے لوگ بھی موقع بہ موقع ایسے اشعار استعمال کرتے ہیں۔ اکثر موت کے وقت کچھ اشعار کہہ کر مرنے والوں کے رشتے داروں کو صبر کی تلقین کرتے ہیں کہ موت برحق ہے آج ان کی کل ہماری باری آئیگی۔ حیرت آبادی کا ایک شعر ہے۔ ؎

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں　　　سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

یہ شعر اکثر میں نے قبرستان کے گیٹ پر لکھا ہوا دیکھا ہے۔ سماج میں چند اشعار بہت زیادہ استعمال ہوتے ہیں جیسے نظیر اکبرآبادی کا یہ شعر خاص کر جب کوئی بڑا آدمی مرتا ہے تو اس کا استعمال ہوتا ہے۔ ؎ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

اسی طرح ہر وقت ایک شعر حیرت الہ آبادی کا پڑھتے ہیں۔ ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے　　　اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

اسی طرح داغ دہلوی کا ایک شعر جیسے کہ تکیہ کلام ہو گیا ہو۔ اسی طرح کا شعر داغ کے پاس بھی ہے

؎ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اردو کے تعلق سے بہت سے لوگوں کے اشعار عام بول چال میں استعمال ہوتے ہیں جن کا لگاؤ سماج سے رہتا ہے جیسے داغ کا یہ شعر ہے۔

؎ نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو　　　کہ آتی ہے اردو زبان آتے آتے

ایک اور شعر ہے۔

؎ اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ　　　سارے شہر میں دھوم ہماری زباں کی ہے

بہت سے لوگ انسانی معاشرے میں ایسے اشعار پڑھتے ہیں۔ ایک دوسر شعر بہت استعمال ہوتا ہے۔

؎ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ　　　کلیات داغ کے صفحہ نمبر 230 پر زور قلم کی جگہ حسن رقم ہے۔ جب کوئی شخص وعدہ فراموشی کرتا ہے تو اکثر ایسے موقع پر یہ مصرع پڑھتے ہیں۔

؎ غضب کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا　　اس کا دوسرا مصرع ہے　　تمام رات قیامت کا انتظار کیا

لیکن داغ کے دیوان میں کم عمر ہے اس طرح کسی استاد زبان میں مصرعوں کو بدل دیا ہے اور وہی مشہور ہو گیا ہے مگر دیوان میں تھوڑا سا فرق ہے کوئی بیمار ہے اور اسے دیکھنے کے لئے کوئی آتا ہے تو مریض کے سامنے ایک مصرع پڑھتا ہے۔

ے جان ہے تو جہان ہے پیارے

ہوش و ہواس تاب وتواں جا چکے ہیں داغؔ موت کے آخری لمحے میں مریض کہتا ہے۔

کئی اشعار سماج میں بہت پڑھے جاتے ہیں۔اردو اسلام کا اثر زیادہ ہے۔اور اس کے اوپر لیبل بھی اسلامی مذہب کا لگا ہوا ہے۔ میں نے جب مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ علامہ اقبال کے غالب سے بھی زیادہ اشعار عوام میں استعمال ہوتے ہیں۔انگریزی تعلیم کی مخالفت کرنے والوں میں ایک ہی دور میں دو شاعر پیدا ہوئے اقبال دوسرا اکبرالہ آبادی علامہ اقبال نے کہا تھا۔''لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی''

ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ

علامہ کے بہت سے اشعار مشہور ہیں ان میں سے ایک شعر

ے خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ایک شعر کو تو ترقی پسندوں نے خوب استعمال کیا تھا۔اس کا چرچا تھا۔

ے جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

علامہ اقبال کا یہ شعر اسکول کالج میں اور آج تک استعمال ہو رہا ہے اور ہندوستان کا ترانہ بن گیا ہے۔

ے سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

یوں تو پوری نظم پڑھی جاتی ہے لیکن طوالت کے خوف سے میں چند باتیں کر پاؤں گا دوسرے باب کے لکھنے کے وقت زیادہ سے زیادہ معلومات دونگا۔اس طرح کے اشعار عام بول چال میں استعمال ہو چکے ہیں یا ہوتے ہیں لیکن ایسے ہی اشعار کا انتخاب کروں گا جو اشعار لوگ بہت استعمال کرتے ہیں شعر کو اچھے پڑھے لکھے لوگ زیادہ استعمال کرتے ہیں لیکن عام لوگ عام موقع پر جب لڑائی اور جھگڑا ہوا تو اس پر لوگ کہتے ہیں۔ ے گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

اس کا پہلا مصرعہ ہے کہ ے کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب

لیکن ثانی مصرع مشہور ہے تقریباً ایک تو بہت کمال ہوتا ہے۔ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں تو کہتے ہیں۔

ے تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے دن ہوں پچاس ہزار

لوگوں نے اس کو مشہور کر دیا تو کر دیا آج بھی یہ مشہور ہے۔

ایسی باتیں بھی پڑھ لیں۔ ے آہ کو چاہیے ایک عمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

غالب کے اشعار سہل ممتنع کی طرح ہیں۔ ے موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

؎ بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

؎ ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

؎ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

مایوسی کے تو غالبؔ کے کئی اشعار ہیں جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا۔

؎ زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہیں کوئی نہ ہو

کبھی کبھی تو وہ جب غم کا زیادہ ذکر کرتے ہیں تو ؎ میری قسمت میں غم گر اتنا تھا دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

اور اس طرح کے شعر جو لوگ اکثر استعمال کرتے ہیں۔

؎ بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

لوگ ایسے اشعار کا استعمال کر کے اپنی بات کا لوگوں پر اثر ڈالتے ہیں۔ 2008 میں ایک راکٹ چاند پر بھیجا گیا تھا تو اس وقت کے کیپٹن ایئر مارشل راکیش شرما جب خلا میں پہنچے تو وزیرِ اعظم اندرا گاندھی نے راکیش شرما سے پوچھا تھا'' وہاں اپنا ہندوستان کا کیسا لگ رہا تھا تب شرما نے اپنی خوشی کا اظہار اس شعر سے کیا تھا۔ ؎ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

میرے خیال میں ہندوستان کی کسی زبان میں وطن کی محبت کے اظہار کے لئے اس سے بہتر کوئی مصرع عوام میں نہیں ہے فلموں میں بھی بہت سارے اشعار استعمال ہوئے ہیں اور وہ پھر عوام میں مقبول ہو گئے ہیں۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

یہ شعر جنگ آزادی کے زمانے میں میں بڑے چھوٹوں کی زبان پر تھا اور آج بھی یہ مشہور ہے ان میں یہ شعر رام پرساد بسملؔ کے نام سے پردے پر آنے کی وجہ سے عوام نے یہ سمجھا کہ یہ شعر ان کا ہی ہے مگر تحقیق سے پتہ چلا کہ یہ شعر بسملؔ عظیم آبادی کا ہے۔ تحریری وضاحت کے ساتھ ثبوت دینے سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ فلموں کے ڈائیلاگ میں بھی اس طرح کے استعمال ہوئے ہیں جیسے فلم دشمن میں ہیرو راجیش کہتا ہے

؎ سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے

یہ شعر بہت استعمال ہوتا ہے۔ اُردو داں اسے علامہ اقبال کے نام سے پڑھا کرتے ہیں۔ پہلے اردو کے فلموں کے شاعروں نے زبان زد اشعار لوگوں نے خوب استعمال کئے ہیں۔ ایک فلم میں شاعر نے ایک شعر استعمال کیا تھا وہ ان کا ہی نہیں تھا مجید لاہوری کا تھا جب ساحرؔ صاحب نے استعمال کر لیا تو لوگوں نے ان کا شعر سمجھا۔ آج بھی اسی طرح استعمال ہوتے ہیں اور عوام میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا　　رہنے کو گھر نہیں ہے سارا جہاں ہمارا

یہ علامہ اقبال کے شعر کی پیروڈی ہے جس کو مجید لاہوری نے لکھی تھی۔ جس نے ہماری گائے بنائی

بگڑتی ہے جس وقت ظالم کی نیت　　نہیں کام آتی دلیل اور حجت

کبھی بھول کر کسی نے سے نہ کرو سلوک ایسا　　اللہ کے جو تم سے کوئی کرتا تو میں ناگوار ہوتا

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا　　کیسی زمیں بنائی کیا آسماں بنایا

سرخرو ہوتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد　　رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ گھس جانے کے بعد

حقیقت چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے　　کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے

کچھ ایسے اشعار ہیں اس کے علاوہ بھی جو حوصلہ بڑھانے کے لئے استعمال ہوتے ہیں

جلانے والے جلاتے ہیں ہوا میں چراغ　　سفیدی کے ہیں دوست ہم کو آئینہ دکھانا ہے

اشوک ساحل صاحب کا شعر ہے

بلندیوں پہ پہنچنا کوئی کمال نہیں　　بلندیوں پہ ٹھہرنا کمال ہوتا ہے

سعید شہیدی کا شعر ہے

نشیمن پر نشیمن اس طرح تعمیر کرتا جا　　کہ بجلی گرتے گرتے آپ ہی بیزار ہو جائے

سرشار سیلانی صاحب کا شعر ہے۔

چمن میں اختلاطِ رنگ و بو سے بات بنتی ہے

ہم ہی ہم ہیں تو کیا ہم ہیں تم ہی تم ہو تو کیا تم ہو

آدمی بلبلہ ہے پانی کا　　کیا بھروسہ ہے زندگانی کا

حوصلہ بڑھانے کے لیے ایک شعر اس طرح استعمال ہوتا ہے جب آدمی کے حوصلے ٹوٹ جاتے ہیں

شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثل برق

وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

مولانا قاسم نانوتوی ہے

درِ فیض محمد ہے جس کا جی چاہے وہ آئے　　آتش دوزخ میں جائے جس کا جی چاہے

اسلام کی مقبولیت کے تعلق سے بے شمار شعر استعمال ہوتے ہیں جس میں علامہ اقبال اقبال کا شعر زیادہ مشہور ہے لیکن کچھ اشعار ایسے ہیں اس کے شاعر کا پتہ نہیں چلتا ہے　لیکن میں نے پتہ لگایا ہے وہ بھی بڑے مشہور ہیں

نورِ حق شمع الٰہی کو بجھا سکتا ہے کون جس کا حامی ہو خدا اس کو مٹا سکتا ہے کون

یہ مولانا اسلم جیراجپوری کا شعر ہے ایک دوسرا شعر مولانا ظفر علی خان کا ہے جو بڑا مشہور ہے

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے

مولانا محمد علی جوہر کا شعر محرم کے موقع پڑھا جاتا ہے مسلمانوں کے ساتھ قتل عام ہوتا ہے تو اسلام کے تعلق سے یہ شعر بہت مشہور ہے۔

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

دیوا کر راہی کا ایک شعر عوام میں بڑا مشہور ہے۔

وقار خونِ شہیدانِ کربلا کی قسم
یزید مورچہ جیتا ہے جنگ ہر آئے

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
آساں نہیں مٹانا قومی نشاں ہمارا

دشت تو دشت ہے دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اور مسلمانوں کی حکومت کے تعلق سے یہ شعر

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے ادھر ڈوبے اِدھر نکلے

مفتی اکرام محمد لطف بدایونی ؎

رخِ مصطفٰی ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ نہ ہماری بزم خیال میں نہ دکان آئینہ ساز میں

اے خاصان خاصان رسل وقت دعا ہے امت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے ہے خالی

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے　　اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے
صفی لکھنوی

اسلام کے دامن میں بس اس کے سوا کیا ہے
ایک ضرب ید الٰہی ایک سجدۂ شبیری　　وقار انبالوی

اب آ گے مختلف علاقوں میں استعمال ہونے والے زبان زد اشعار کی ایک فہرست دے رہا ہوں کہ جو زندگی کے تعلق سے مشورہ ہے مختلف شعراء نے اپنے اپنے انداز سے اشعار کہے ہیں۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ہمیں ہے علم کے ہم ہیں چراغ آخر شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے

پہچان آدمی کی نہیں سہل
آج کل ایک آدمی چھپاہے ساتھ

غیروں کو کیا پڑی ہے کہ رسوا کریں ہمیں
ان سازشوں میں ہاتھ کسی آشنا کا ہے

جیتے جی قدر بشر کی نہیں ہوتی پیارے
یاد آئے گی تجھے میری وفا میرے بعد　　مرزا محمد تقی ہوسؔ

آسمانوں سے فرشتے جو اتارے جائیں گے
وہ بھی اس دور میں سچ بولیں تو مارے جائیں گے　　امید فاضلی

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا　　احمد ندیم قاسمی

آسان نہیں انصاف کی زنجیر ہلادینا
دنیا کو جہانگیر کا دربار نہ سمجھو اختر

ہم کو شاہوں کی عدالت کی توقع تو نہیں
آپ کہتے ہیں تو زنجیر ہلا دیتے ہیں
احمد ندیم قاسمی

وہ دیس سے آنے والے بتا
کس حا ل میں ہیں یارانِ وطن
اختر شیرانی

اس شہر میں اب ایک بھی انسان نہیں ہیں
یا پھر مجھے انسان کی پہچان نہیں ہے
افضال شاہد

سورج ہوں زندگی کی رمق چھوڑ جاؤں گا
بجھ گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا
اقبال صادق ساجد

دشمنوں نے جو دشمنی کی ہے
دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے

ہم روح سفر ہیں ہمیں ناموں سے نہ پہچان
کل اور کسی نام سے آجائیں گے ہم لوگ
رضی اختر شوق

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں اور
بارہ بنکی

دشمنوں نے تو دشمنی کی ہے
دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے
بےنوائے شکوہ ارشاد

آپ کی دوستی پہ طنز نہیں
میں زمانے کی بات کرتا ہوں
شمیم کریانی

سبق ملا ہے ہے یہ اپنوں کا تجربہ کر کے
وہ لوگ پھر بھی غنیمت ہے جو برائے

وہ کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا
ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا
علامہ محمد احمدیں

تنگدستی اگر نہ ہو سالک
تندرستی ہزار نعمت ہے
قربان علی سالک

خبر سن کر میرے مرنے کی وہ بولے رقیبوں سے
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں بھی
داغ دہلوی

جس نے کچھ احسان کیا ایک بوجھ ہم پر رکھ دیا
سر سے تنکا تھا کیا اٹھایا سر پر چھت پر رکھ دیا یا
جلال لکھنوی

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

حالی کرو مہربانی تم اہل زمین پر
خدا مہربان ہو گا عرش بریں پر پر

جینے کے زمانے میں تو سب جیتے ہیں
ہیں جو مر کے جیئے جہاں میں نام اس کا ہے
شاد عظیم آبادی

اب کچھ انگریزی کے تراجمے کی وجہ سے دوسری زبانوں کے چاہنے والوں نے بھی جانا۔

لوگ کہتے ہیں بدلتا ہے زمانہ سب کو
زندہ ہیں وہ جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

People say the times change. Everyone is alive. Those who change the times

سرخرو ہوتا ہے انسان ٹھوکریں کھانے کے بعد
رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ گھس جانے کے بعد
مست کلکتوی

Redness occurs after a person stumbles. Hina brings color after penetrating the rock

اب یہ حنا کی مثال انگریزی اور ہندوستان سے باہر کہاں ملے گی۔

جانے والے کبھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے
سکندر علی وجد

Those who go never come, those who go are missed

یاد میری سنبھال کر رکھنا
میرا کیا میں رہا رہا نہ رہا
نشاط شاہدوی

keep me in yor heart if I die

خدا دشمنوں کو نہ وہ کچھ دکھا دے
مجھے جو کچھ دوست اپنے سے ہم دیکھتے ہیں

May God not show to the enemies what we see from our friends

کیسی ہی مصیبت ہو بڑے شوق سے آئے
کم ظرف کے احسان سے اللہ بچائے
حفیظ میرٹھی

no matter how much trouble came with great enthusiasm. May Allah protect miser

❁❁❁

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

walked alone towards the destination but people came along and the caravan was formed

بھانپ ہی لیں گے اشارہ سرِ محفل جو کیا
تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

of those who are watching the HourThey will only notice the signalsof behavier

کہہ رہا ہے شورِ دریا سے سمندر کا سکوت
جس میں جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

He is as silent as the container Saying the silence of the sea from the noise of the river

The eyes also turned to tears

True, there are no acquaintances in Bexie

آنکھیں بھی ہائے نزع میں اپنی بدل گئیں
سچ ہے کہ بیکسی میں کوئی آشنا نہیں

These hiccups are not without reason for No wonder he forgot

آنا یہ ہچکیوں کا مجھے بے سبب نہیں
بھولے سے اُسنے یاد کیا ہو عجب نہیں

What is said where and howIf this is the case then everything is heard

کون سی بات کہاں کیسی کہی جاتی ہے
یہ سلیقہ ہو تو ہر بات سنی جاتی ہے

ہم یہ دعوی کے ساتھ کھ سکتے ہیں کہ اردوزبان کی اس طرح کی شاعری کیسی دوسری زبان میں نھیں ہیں۔اتنا شعر ہم کسی دوسری اشعار میں استعمال نہیں کرتے ہیں۔وقت بدلا اورزبانوں کا ترجمہ ہونے لگا تو اردو کے یہ اشعاردوسری زبانون میں بھی استعمال ہونے لگیں گے۔

❁❁❁

باب۔۴

تحریروں اور فلموں

میں

استعمال ہونے والے اشعار

باب ۔۴۔ تحریر و اور فلموں میں استعمال ہونے والے اشعار

ہم جب رسالوں اور اخباروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اکثر دیکھتے ہیں کہ مصنف اپنی بات کے بیچ بیچ میں اشعار کو استعمال کرتے ہیں۔ہم اپنی مضمون نگاری میں بھی شعر کا استعمال کرتے رہتے ہیں،ایک تنقیدی مضامین کا مجموعہ آخری گھڑے کا پانی ہے،اس میں سے کچھ مثالیں آپ کو پیش کرر ہا ہوں۔ ظفر گورکھپوری کے تعلق سے عک مضمون ہےاس راقم لکھتا ہے

ظفر گورکھپوری کی شاعری اور اس کا عہد وہی ہے جب ترقی پسند شاعر نامانوس اجنبی اور ٹمٹا تا دیا ہونے لگی تھی۔اور مجاز و جذبی مجروح و فیض کے ساتھ ساتھ سردار جعفری کی غزلیں سامنے آنے لگیں۔

حکایتیں تو بہت ہیں شکایتیں بھی بہت مزہ تو جب ہے کہ یاروں کے روبرو کہئے

اور زبان میر میں صاحب کبھو کبھو کہئے جا یسے مصرعے سردار جعفری کی نظم نگاری کے رجحان کو غزل کی سمت موڑ رہے تھے۔ان دو اشعار کی مثال دے کر پورے عہد کی شاعری کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے۔نئی غزل میں زیندگی کے حقائق میں زبان زد اشعار لوکس طرح پیش کیا کیا گیا ہے وہ بھی دیکھتے چلیں۔

کبھی کبھی ایک آدمی بیک وقت ایسے دس بیس آدمی ہوتے ہیں جن کی محبوبیت کی ادا اتنی دلبرانہ ہوتیہے کہ ان سے ملنے کی خواہش اور تمنا ہوتی ہے،

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جسکو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا

ندا فاضلی کے ان دس بیس آدمیوں کو کئی بار دیکھنا ایک الگ مسئلہ ہے" انسان جتنا الجھا ہوا ہے اور ہر لمحہ اس کے لئے نئے مسائل کو جنم دیتا ہے......"

اتنا ہونے کے باوجود یہ حال ہے کہ ایک ریس ہے ایک دوڑ ہے جو زندگی کے لئے جاری ہے۔راستہ تقریباً معلق ہو چکا ہے۔ان حلات مینا یک دوسریکو گرار ہے ہیں لیکن اس کے بعد خود ان کا گرنا بلکہ سنبھلے رہنا خود ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔

یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا
مجھے گرا کے اگر تم سنبھل سکو تو چلو

اس طرح اس مضمون میں جگہ جگہ پر جہاں عام اشعار دئے گئے ہیں وہاں زبانزد اشعار بھی حوالے میں دئے گئے ہیں،آگے دیکھتے ہیں۔

حالؔی نے سب سے پہلے غزل کے مزاج کو بدلا،مولوی محمد حسین آزادؔ نے نیا تجربہ کیا،غرضیکہ سماجی اور سیاسی حالات میں غزل کے فارم،ہیئت میں تبدیلی کا عمل جاری رہا اور اس میں ہر موضوع کو سمویا جانے لگا،مقصدی غزل کا دور شروع ہوا،غزل میں وسعت پیدا ہوئی،

یہ اس بات کا ثبوت اور دلیل ہے کہ اردو غزل ایک زندہ شاعری ہے جو کسی دور میں بھی جمود، خمود اور تعطل کا شکار نہیں ہوئی، ایک وہ بھی دور تھا، جب عمر رفتہ کو آواز دینے کیلئے غزل کہی جاتی تھی اور شاعر کہتا تھا۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

یعنی عمر رفتہ کی شوخیوں اور مستانہ روی کے ساتھ غزل کا انسلاک تھا، اور غالب کو مجبوراً کہنا پڑا۔

بقدر ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کیلئے

آج کی اردو جدید غزل نے عصری مسائل و موضوعات کو جس اسلوب، زبان اور علامتوں کا پیراہن دیا ہے وہ آج کے اس دور کی عین ضرورت اور تقاضہ ہے۔ آج سب اپنے اپنے میں مگن ہیں، نہ کوئی پرایا دکھ اپنا تا ہے، یہی نہیں ہر کوئی ہر کسی کو روند کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔ جدید غزل نے اس موضوع کو اس طرح چھیڑا ہے۔

یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا
مجھے گرا کے اگر تم سنبھل سکو تو چلو

ندا فاضلی

اعتماد و یقین متزلزل ہو چکے ہیں۔ آج کا ترقی یافتہ انسان سائنس پرست ہو کر الہام کی سرمستیوں سے محروم ہو چکا ہے اور سکون اور اطمینان کو ترسنے لگا ہے۔ وہ بڑی بڑی فلک بوس عمارتوں میں رہنے لگا ہے اور آرام و آسائش کے سارے سامان فراہم کر چکا ہے مگر اپنی ذات کی صنم تراشی میں مگن ہو کر آہستہ آہستہ خود بھی پتھر بنتا چلا جا رہا ہے۔ غالباً اس کا خیال ہے۔

آدمی بننے سے بہتر ہے کہ پتھر ہی بنو
جب تراشے جاؤ گے تو دیوتا کہلاؤ گے

انجم جبلپوری

لندن کے انور شیخ کے مضمون کا جواب دیتے ہوئے یہ کہا"

اگر ان کے اس پورے مضمون کا علمی جائزہ لیا جائے اور پوسٹ مارٹم کیا جائے تو پورا مضمون فاسد اور بدبودار مواد سے بھرا ہوا ہے۔ اس مضمون میں انور شیخ کی کچلی ہوئی انا کی چیخ تو مل سکتی ہے لیکن حقائق کی تلاش، عبث اور بے سود ہے۔ اقبال تصورِ پاکستان کے خالق تھے نہ قومیت اور وطن پرستی کے وکیل تھے۔ ان کی نظر میں یہ سب ایک طرح کے شرک کے مترادف ہیں جن سے انسانیت کی تذلیل ہوتی ہے۔ وہ صرف اس کے ایک سجدے کے قائل تھے جو انسانوں کو در در کی جبہ سائی اور سجدہ ریزی کے لیے مجبور کر دیتے ہیں۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

آخر میں لکھتے ہیں کہ

انور شیخ بلا سوچے سمجھے صرف قلم گھسیٹنے کو ضروری سمجھتے ہیں فرماتے ہیں: ''اس سرزمین کو امن و آشتی کی انتہائی ضرورت ہے۔اس کے بغیر یہ ممالک تمدنی اور معاشی طور پر انحطاط پذیر ہی رہیں گے۔'' سوال یہ ہے کہ تمدنی اور معاشی انحطاط سے بچنے کیلئے دنیا کے کس ملک کو جدال وقتال کی ضرورت پیش آئی ہے۔انہوں نے اپنے ہی لفظوں کا ایسا چیستاں بنایا ہے جسے وہ خود ہی سمجھ نہیں سکیں گے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کچھ بڑے بڑے الفاظ نہاں خانۂ دماغ میں جمع کر رکھے ہیں۔مضمون سے انہی کی ''قئے'' اور جگالی کی عفونت آتی ہے۔ ''انا'' کی اصطلاح انہوں نے کسی نفسیات (سائیکولوجی) کے رسالے سے نکالی ہوگی اور اسے اقبال کے سر پر اندھے کی لٹھ کی طرح استعمال کر رہے ہیں۔سوال یہ ہے کہ ہندوستانی قومیت، آبائی حسب نسب کو بھول کر تاریخی تشخص پیدا کرنے میں آخر کیا ربط ہے؟ چیستاں ۔

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی؟

شیخ صاحب، خود ہی سوال کرتے ہیں۔''کیا اسلام، قومیت اور وطنیت کے خلاف ہے؟'' اور پھر خود ہی جواب دیتے ہیں ''اسلام صحت مند قومیت کا داعی ہے۔'' (کیا اسلام غیر صحت مند قومیت کا داعی ہوتا، جب ان کا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا؟) اور یہ صحت مند قومیت ہے کیا؟ شیخ صاحب اس بکواس تحریر سے آخر کہنا کیا چاہتے ہیں؟

ایک دوسرا مضمون پروین شاکر کی شاعری میں میں نے کس طرح مضمون باندھا ہے دیکھیں

اردو غزل تاریخی شواہد کے پس منظر میں زمینداری اور جاگیرداری دور کی پیداوار ہے، جبکہ اردو زبان تمدنی ضرورت کے تحت پیدا ہوئی ہے۔اس زمانے میں جب فراغت تھی۔فرصت میسر تھی۔جب ''بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے۔'' کے بغیر وقت کاٹنا محال ہوتا تھا۔اس وقت اربابِ نشاط سے ''غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا'' اور عمر رفتہ کو آواز دینے کے لیے فراغت یاب زمیندار اور رنگین مزاج جاگیردار طبقہ اسی الھڑ، چھیل چھبیلی صفِ سخن ''غزل'' کے پیروں میں گھنگھرو باندھ کر خوش وقت اور خوش کام ہوا کرتا تھا۔لیکن بہت جلد غالبؔ، حالیؔ اور سرسید تک آتے آتے، اردو غزل درباداری کے چونچلوں سے بغاوت کر کے علمی اور ادبی سطح پر نمایاں ہوگئی۔پہلی بار حالیؔ نے کہا۔

حالیؔ اب آؤ پیرویٔ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفیؔ و میر ہوچکی

مصحفیؔ و میرؔ اسی غزل کے ناخدائے سخن تھے، جو عورتوں سے بات کرتی تھی، جو زمینداری اور جاگیرداری دور کے دلچسپ وقت گذاری کے شغل اور اربابِ نشاط کی جنّت کو اپنی چنچل اور خوبصورت غزلوں سے سجا رہے تھے۔حالیؔ اور سرسیدؒ کے بعد اردو غزل اور شاعری میں حقائق کی گہر افشانی، گہرائی، فکر اور بدلتی تہذیب وثقافت کے جلوے سمٹنے لگے اور آہستہ آہستہ اردو غزل اور اردو شاعر دنیا کی عظیم شاعری

کے زمرے میں شامل ہوگئی۔ایک دوسری کیتا شعرائیمہاراشتر کے پیش لفظ میں اپنے مذہبی پس منظر، فارسی ،عربی ،ترکی اور بنگالی وغیرہ زبانوں کے اثر اور رنگ برنگے الفاظ کے وافر ذخیرے،اس زبان کی قوت آ خذہ،اس کے من موہک لب و لہجے اور گذشتہ دہلی ،لکھنو،حیدرآباد ،بھوپال،رام پور پنجاب کے منفرد کلچرل آمیزش نے اردو کو سبھی زبانوں پر فوقیت دے دی ہے۔حدتو یہ ہے کہ جو بے وقوف، جاہل، بدتمیز اور اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کہنے والے متعصب و بے انصاف لوگ ہیں وہ بھی اسی اردو زبان میں اس کی مخالفت کرتے ہیں۔مشاعرہ اردو کا ایسا اچوک ہتھیار ہے جس کے سامنے بڑے سے بڑے رستم زماں زمین چاٹنے لگتے ہیں۔شاید ایسے ہی بدمذاقوں کے لئے خدائے سخن میر تقی میر نے کہا تھا۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں سب اسیر ہوئے

شاید بہت سے حضرات کو یہ معلوم ہو کہ جب حکومت کی باگ ڈور انگریزوں کے ہاتھ سے نکل کر ہمارے ہاتھ میں آئی تھی تو پارلیمنٹ ہاؤس میں سب سے پہلے تمام لوگوں نے کھڑے ہوکر علامہ اقبال کا ترانہ گایا تھا۔

سارے جہاں سے اچھا ٗہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی ،یہ گلستاں ہمارا

تو جناب: جس دن مہاراشٹر کا جنم ہوا اس دن بھی ممبئی کے منترالیہ میں پہلے مراٹھی کی ایک نظم گائی گئی۔پھر اقبال کا قومی ترانہ اور آخر میں راشٹریہ گیت جن من گن۔

شاہد صدیقی کا شمار بڑے شاعروں میں ہوتا ہے مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں,وہ نثر بھی لکھتے تھے۔اخباروں کے کالم بھی لکھا کرتے تھے۔ان کی ایک کتاب شیشہ و تیشہ بہت پڑھی جاتی ہے۔ان میں سے کچھ باتیں ہم اپ کو اپنی تحقیق کے ذریعہ بتانا چاہتے ہیں۔دیکھے کس طرح عام بول چال کے اشعار کو استعمال کر کے تنز کے تیر چلاتے ہیں۔

یہ مقطع شاید آپ نے سنا ہوگا،
اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اور حالات اور واقعات پر گہری نظر ڈالی جائے تو پتہ چلے گا کہ ہندوستان میں اس زبان کی دھوم آج تک باقی ہے فرق صرف یہ ہے کہ داغ مرحوم کے زمانے میں سارا دھوم دھڑا کا اردو کے لیے ہوتا تھا اور آج اسکی مخالفت کے نقارے بجائے جارہے ہیں جنانچہ آپ کو یاد ہی ہوگا کہ کچھ دن پہلے شمالی ہند کے ان اخباروں نے اردو کو برا بھلا کہا جو خود اردو میں شائع ہوئے تھے۔آگے چل کر شاہد نے اپنی اردو سے محبت کو دکھائی ہے جو قابل تعریف ہے۔

اب دکن کا علاقہ اور مہاراشٹر ہی اردو کا مرکز ہوگیا ہے۔جہاں تک اردو کا معاملہ ہے،مہاراشٹر بڑا زرخیز علاقہ ہے۔اس حقیقت

سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اردو زبان کی ترقی میں مہاراشٹر کا جو رول ہے وہ دلی، یوپی اور بہار سے کچھ کم نہیں ہے۔اس کی زرخیزی میں دلی اور یوپی سے آئے ہوئے لوگوں کا بھی ہاتھ ہے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ اپنی مادری زبان اردو کو ساتھ لے کر آئے تھے۔ہم اس پر ان علاقوں کے شاعروں کا ذکر تفصیل سے بتائیں گے۔اب دلی اور لکھنؤ کا زمانہ گزر گیا جہاں اردو کا بول بالا تھا۔آج بھی مہاراشٹر میں ان علاقوں کی بہ نسبت اردو کے کافی شعراء اور ادباء موجود ہیں جو اپنے خونِ جگر سے اردو کی آبیاری کرر رہے ہیں۔اب دلی اور لکھنؤ کی مرکزیت ختم ہوگئی ہے۔ان مراکز کی حالت ملک گیر سطح پر اردو کا جائزہ لیا جائے تو بہت ناگفتہ بہ ہے۔ان شہروں سے مشاعرے کی رونق، جلسوں کا چلن اکھڑ کر ممبئی، بھوپال، مالیگاؤں، اورنگ آباد، ناگپور وغیرہ میں آکر گڑ گیا۔ ہندوستان کے سید مسعود حسن رضوی کا یہ مشورہ قابل قبول ہونا چاہیے جس میں انہوں نے کہا تھا ''جب تک مختلف چھوٹے چھوٹے مرکزوں کی خدمات کو منظر عام پر نہیں لایا جائے گا اس وقت تک اردو ادب کی تاریخ کو مکمل نہیں کہا جاسکتا ہے۔'' اسی لیے مہاراشٹر کے لوگوں نے جس طرح بڑھ چڑھ کر اردو کی ترقی کے لیے قربانیاں دی ہیں اس کا ذکر کیا جانا چاہیے۔مہاراشٹر میں اردو کا چلن دیکھ کر پدرم سلطان بود پر یقین رکھنے والے موجودہ دور کے اس ریاست کو بھی دیکھیں۔ایک سروے کے مطابق چار ہزار سے زیادہ اردو اور عربی کے دینی مدارس ہیں۔اردو کے ۱۷۵ ار پرائمری، ۹۲۳ ہائی اسکول اور ۱۱۲ جونیئر کالج موجود ہیں۔ یہاں جگہ جگہ پر کے۔جی سے لے کر پی۔جی کی تعلیم اردو میڈیم سے دی جاتی ہے۔میں نے اپنے مضمون میں جگہ جگہ زبان زد اشعار کا استعمال کیا ہے۔آپ اسے بھی پڑھتے چلیں۔

اُردو کے صحافیوں نے اس وقت بے جگری اور بے باکی سے مضبوط پنجہ گڑوئے ہوئے، سخت گیر ظالم برٹش حکومت پر اپنے شعلہ بار قلم سے انگارے برسانے شروع کئے۔دار وگیر، جائیداد واملاک کی ضبطیاں ہوئیں، سولیوں پر لٹکائے مگر۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

کے مطابق نامساعد حالات اور غیر یقینی آزادی کو مساعد اور یقینی بنادیا۔اردو زبان پر تحریک مجاہدین کے اثرات تھے جو سرزمینِ بہار سے اٹھی اور بالاکوٹ کے میدان میں جس نے شہادت کی تاریخ بنائی۔سید احمد شہیدؒ۔سید اسمٰعیل شہیدؒ جس کے قائد تھے۔اس کے بعد سر سید احمد خاںؒ کی علی گڑھ تحریک، مولینا قاسم نانوتویؒ کی دیوبند تحریک اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کی اسلامی تحریک نے اس زبان کی مزاج سازی کی۔یوں اردو زبان میں اوّل روز سے مجادلت اور مقادمت دونوں کے جذبات موجود رہے ہیں۔آج اس مشکل دور میں بھی اُردو صحافت زندہ ہے، بلکہ اس میں عصری تبدیلیوں کے انداز بھی آگئے ہیں۔طباعتی پہلو سے لے کر کمپیوٹرائز، کیلی گرافی، ملٹی کلر پُرکشش پرنٹنگ کے باعث اُردو اخبارات آج کے بڑے اخبارات سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔اور ان کے تمام لکھنے والوں کا مزاج آج بھی آزاد اور جرات مند ہے۔ملکی، لسّانی، اور قومی مسائل پر اخبارات بڑی جرأت اور بے باکی سے لکھتے ہیں۔لیکن ایسے اردو جرائد اور ڈائجسٹ آج بھی بکثرت نکل رہے ہیں، جن سے اُردو کا نام ہندوستان میں زندہ تابندہ اور روشن ہے۔

اسی طرح ماضی سے اردو کا وہ تعلق اور رابطہ ٹوٹا نہیں ہے بلکہ بدرجۂ احسن قائم اور روز افزوں ہے جو آزادیٔ ہند سے قبل قائم تھا۔ اس وقت ملک میں بہت سارے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، اکیڈیمیاں قائم تھیں۔ جو اُردو کتابوں کی اشاعت کا کام کیا کرتی تھیں۔ان میں سے کچھ آج تک موجود ہیں۔بعض نئی قائم ہوئی ہیں۔الہ آباد کی ہندوستانی اکیڈیمی نے ایک زمانے میں اُردو کی زبردست خدمت کی تھی۔ اگر چہ وہ اب ہندی اکیڈیمی بنادی گئی ہے۔حیدرآباد کی سلیم اکیڈیمی جس کے سربراہ چودھری اقبال سلیم گاہندری تھے۔آزادی سے قبل اس اکیڈیمی نے اُردو کی بیش بہا کتابیں شائع کی تھیں،اب موجود نہیں ہیں۔دائرۃ المعارف حیدرآباد کی خدمات کبھی بھلائی نہیں جاسکتیں۔مگر سقوطِ حیدرآباد کے بعد اس کی سرگرمیاں بھی سرد سرد ہیں۔جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، اُردو یونیورسٹی سے تیلگو یونیورسٹی بنادی گئی ہے۔اس کے باوجود خدا نے اُردو اور اُردو والوں کو جو انداز عطا فرمائے ہیں کہ ۔

ہم اہلِ دل ، جہاں میں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے۔ اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

آج بھی یہ انداز اُردو میں موجود ہے، بہت سارے طباعتی واشاعتی ادارے نہ صرف قائم ہیں بلکہ ان کی ادبی خدمات کی حدیں بھی پھیلی ہیں۔ نئے طباعتی واشاعتی ادارے بھی قائم ہوئے ہیں۔اُردو اکاڈیمیاں حکومت کی سرپرستی میں کام کرنے لگی ہیں۔یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ یہ سب مطلوبہ معیار کے مطابق کام کررہی ہیں۔مگر اس سے اُردو کی زندگی اور رفتار کا پتہ ضرور لگتا ہے۔دارالمصنفین (اعظم گڑھ) آج بھی قائم ہے، اور اس کی علمی وادبی جریدہ معارف اب بھی اپنے نئے سابقہ معیار کو سنبھالے ہوئے نکل رہا ہے۔اگر چہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور شاہ معین الدین ندوی انتقال فرما چکے ہیں۔لیکن شبلی اسکول کے ان اُردو کے اکابر نے معارف کے لئے جو رستہ بنایا تھا۔ وہ آج بھی اس پر رواں دواں ہے۔حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ اور حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادیؒ وفات پاچکے ہیں لیکن دہلی کا ندوۃ المصنفین باقی ہے۔یہ ادارہ حالات کے سخت اور موت آسا تھپیڑوں کی زد پر ہے لیکن اب بھی اپنی زندگی کے لئے جدوجہد کررہا ہے۔اُردو کے یہ وہ عظیم الشان ادارے ہیں جن کے دم قدم سے اُردو زبان میں ان گنت علمی وتحقیقی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔اس کے علاوہ بہار کا ایک اہم ادارہ خدا بخش ارنیٹیل لائبریری پٹنہ ہے۔جو آج پوری طرح حکومتِ بہار کی زیرنگرانی چل رہا ہے۔اس کے ڈائریکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی وجہ سے یہ لائبریری ریسرچ کا مرکز بن گئی ہے۔

شاہد نے ایک دوسری جگہ موسیقی اور مصوری کی بے راہ روی پر طنز کرتے ہوئے یہ شعر لکھتے ہیں۔

یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔

اس طرح کے بے شمار اشعار کو جگہ جگہ شاہد نے استعمال کرکے چاشنی پیدا کی ہے۔جو اردو کے زبان زد اشعار کا کمال ہے، کسی دوسری زبان کے شعر میں یہ خوبی نہیں ہے۔

اب انہوں نے چھوٹی چھوٹی خبروں پر نوٹس لکھے ہیں۔

لندن میں خواتین کے لئے کاغذ کے لباس تیار کئے جانے والے ہیں وہ ایک بار پہننے کے بعد پھینک دئے جائنگے۔
اب پتا چلا کہ غالب نے یہ مصرع کس وقت کے لئے کہا تھا۔

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

ہم جیسے مصنف بھی اپنی تحریروں اور تقریروں میں اکثر برمحل اشعار کا استعمال کرتے ہیں۔ میں نے مشہور افسانہ نگار ایم۔ مبین کے ابتدائی دور میں اس کی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ٹوٹی چھت کے مکان کے بیک فلیپ پر لکھا ہے۔
ٹوٹی چھت کا مکان افسانوں کا مجموعہ اردو ادب کی نئی فکر سمت اور صحت معلوم کرنے والا ٹھرما میٹر ہے مگر ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ۔ایم مبین کی یہ آخری منزل نہیں ہے انہیں ادب کے کئی مرحلہء شوق طے کرنے ہیں مندرجہ بالا جائزہ میں میں نے علامہ اقبال کے دو زبان زد اشعار کا استعمال کر کے اپنی نثر کی خوبی بڑھائی ہے۔ نثر گلابی ہوگئی ہے۔

ہر لحظ نیا طور نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

اور

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی وشق کے امتہاں اور بھی ہیں

''آخری گھڑے کا پانی'' کتاب میں ایک جگہ صفحہ ۸۱ پر شبیر احمد راہی پر مقالے میں............ہم مقالے کی ابتدا میں لکھ آئے ہیں کہ وہ فکر بصیرت کے اعتبار سے ہی نہیں اپنے کردار عمل کے لحاظ سے بھی عبقری اور جینئس فرد تھے ایسے لوگ صدیوں میں نمایاں ہوتے ہیں۔

مت سہل ہمیں جانوں پھرتا ہے فلک برسوں
کب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

علماء ادب غزل کو محبوب سے بات کرنے والا فن قرار دیتے ہیں اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو مرزا مظہر جان جاناں کے اس شعر کو کیا کہا جائے۔

بنا کر ند خوش رسمے بخاک و خوں غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

مرزا مظر جاناں نے یہ شعر جب کہا تھا۔ دلی کے بازار چتلی قبر میں ان پر گولی چلائی گئی اور وہ خون میں لت پت ہو گئے اور ان کے لب سے یہ شعر فی الفور نکلا۔

بنا کر دند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

اس کا ترجمہ یہ ہے کہ خاک اورخون میں لوٹنے کی اچھی شروعات کردی ہے خدا ان پاک طینت عاشقوں پر رحمت نازل کرے، دیکھئے مرزا مظہر جان جانان نے اپنے خون کو معاف کر کے اردو شاعروں کا نام روشن کر دیا کہ شاعر تنگ دل نہیں ہوتا ہے بڑا دل والا اور نیک بھی ہوتا ہے۔ ویسے آپ کو بتاتا چلوں کہ مرزا کا شمار اس وقت کے عالموں اور بزرگ ہستیوں میں بھی ہوتا تھا۔ اسلام سے تعلق رکھنے والی ان کی کئی کتابیں تھیں، یہ قتل بھی مسلکی فرق کی بنا پر ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ کسی اہل تشیع کے کسی شخص نے ان کو مار دیا۔ مرزا سے جس اردو شاعری اورغزل کی شروعات ہوتی ہے وہاں سے لے کر آج مجروح سلطان پوری کے اس شعر تک۔

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کا چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

اردوغزل نے صرف حسن وعشق کی ہی بات نہیں کی ہے آس پاس رونما ہونے والے حالات اور واقیات کو بھی اندر سمویا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق خود کو ڈھالا ہے اور شاعری یہاںتک پہونچ گئی ہے۔

ہر آدمی میں ہوتے دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا ہو کئے بار دیکھنا

بڑے لوگوں سے ملنے میں ہمیشہ فاصلہ رکھنا
جہاں دریا سمندر سے ملا دریا نہیں رہتا

گفتگو کسی سے ہو دھیان تیرا رہتا ہے
ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ تکلم کا ا
حسن کو حسن بنانے میں مرا ہاتھ بھی ہے
آپ مجھ کو نظر انداز نہیں کر سکتے

اونچی مسہریوں کے دھلے بستروں پہ لوگ
خوابوں کے انتظار میں تھے اور مرگئے

یہ وہ زبان زد اشعار ہیں جو عام بول چال میں استعمال ہونے لگے، اردوغزل کی ترقی کی یہ پہچان ہے۔ اب یہ شاعری درباداری کے چونچلوں سے بغاوت کر کے علمی اور ادبی سطح پر نمایاں ہوگئی ہے۔ جذبات محسوسات اور واردات کا نام غزل ہے اور یہ غزل محسوسات جس عالم میں کہی گئی ہوگی لامحالہ اس کی بازگشت شعر میں ضرور پائی جائے گی۔ اس میں سماجی کاروبار کا ذکر تو ہونا لازمی ہے۔ شاعری کا لگاؤ دلوں سے بھی ہے اس لئے شاعر جو کچھ محسوس کرتا اسکا تو دخل ہونا ضروری ہے۔ ہر فنکار اپنی غیر معمولی فنی شخصیت رکھتا ہے لیکن اس سے پہلے وہ ایک

انسان ہے اسی کائنات کا متحرک کل پرزہ مگر اس کے اندر جذبات واحساسات دل اور دل کے معاملات کا گوشہ بھی موجود رہتا ہے جو اسی معاشرتی، معاشی، اور اخلاقی نظام میں پروان چڑھتا ہے، زندگی کے کڑوے کسیلے تجربات کے انہیں ادوار سے وہ بھی گذرتا جس سے ایک عالم انسان کو واسطہ رہتا ہے، اس کی فنی شخصیت اور اس کے آرٹ پر غیر محسوس طور پر حالات کی یہی چھاپ ہوتی ہے۔

رشید احمد صدیقی نے دہلی یونیورسیٹی کے پلاٹینم جبلی کے موقع پر ایک مقالہ پڑھا۔ دیکھیے کس طرح انہوں نے برمحل شعر کا استعمال کر کے نثر میں جان ڈال دی ہے

۔۔۔۔۔عملی زندگی میں مذہب کی جانب غالب کا اجتہادی نقطہ ءنظر اتنا بھی نہ تھا جتنا مومن کا۔لیکن خیال کی دنیا میں پہونچ کر ملتوں کو مٹا کر اجزائے ایماں بنا دیتے ہیں۔۔۔سادگی کے ساتھ پرکاری غالب کے آخری دور شاعری تک قائم رہی اس نے مرزا غالب کو انداز بیاں اور کا مرتبہ بخشا ہے۔۔۔۔

اتنی سی نثر میں غالب کے دو برمحل اشعار استعمال کئے ہیں،

میں نے خود اپنی کتاب میں اپنی نثر میں جان پیدا کرنے کے لیئے جگہ جگہ پر زبان زد اشعار کا استعمال کیا ہیاور آج بھی ایسے اشعار کو شامل کئے بغیر نہیں رہتا ہوں۔

۔۔۔۔اس زمانے میں جب فراغت تھی فرصت تھی جب بیٹھے رہے تصورِ جاناں کئے ہوئے کے بغیر وقت کاٹنا محال ہوتا تھا اس وقت ارباب نشاط غزل اس نے چھیڑی مجھے ساتھ دینا اور عمر رفتہ کو آواز دینے کے لئے فراغ یاب زمیندار اور رنگین مزاج نواب اور بادشاہ اسی غزل کے پیروں میں گھنگروں باندھ کر خوش وقت اور خوش مزاج ہوا کرتا تھا۔اب ان جملوں میں میں نے ایک خوبصورت زبان زد شعر کا استعمال کر کے نثر میں جان ڈال دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔اب اس زمانے میں تو اس طرح کی نثر اپنی ضرورتوں کے مطابق شامل کرتے ہیں۔ ہر زمانے میں یہ ہوتا آیا ہے۔ ماضی کی کچھ مثالیں اور دیتا چلوں تا کہ مضمون کا مزہ دوبالا ہو جائے۔ہم آپ جانتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد صرف لیڈر ہی نہیں ایک اچھے مصنف بھی تھے۔ میں ان کی صرف ایک کتاب غبار خاطر کے بارے میں بات کروں گا اور بتاؤں گا کہ دوسرے مصنفوں کی طرح انہوں نے بھی اپنی نثر میں جگہ جگہ زبان زد اشعار کا استعمال کیا ہے۔ ہر لکھنے والا اپنی صلاحیت کے مطابق ہیں اپنی نثر میں اشعار کا استعمال کرتا ہے۔مولانا بہت بڑے عالم تھے انکو کافی اشعار یاد تھے اپنی باتوں کو خوبصورت بنانے کے لیئے اس طرح کے اشعار سے انہوں نے نثر میں ایک نیا رنگ بھر دیا ہے۔ ہم اپنے موضوع کے مطابق ہی ہیں اشعار کا ذکر کریں گے جو زبان زد ہیں۔ان کے دگر فارسی اور عربی کے اشعار کا ہم ذکر نہیں کریں گے پھر انہوں نے جو بھاری بھرکم اشعار سے جو نثر لکھی ہے ان کا بھی ذکر نہیں کریں گے۔ایک بات اور بتا تا چلوں کہ انکی نثر کی خوبی کو دیکھ کر ہی حسرت موہانی نے کہا تھا کہ

جب سے دیکھی ہے ابو الکلام کی نثر
نظم حسرت میں وہ مزہ نہ رہا

اب آیئے ان کے سیکڑوں اشعار میں سے کچھ کا ذکر دیکھ لیں۔۔۔۔اس بزم سود وزیاں میں کامرانی کا جام کوتاہ دستی کے لیئے نہیں بھرا ہے وہ ہمیشہ انہیں کے حصے میں آیا ہے جو خود بڑھ کر جام اٹھا لینے کی جرات رکھتے ہیں۔

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

یہاں آپ نے دیکھا کہ مولانا نے کس خوبصورتی سے اس شعر کو اپنی نثر میں شامل کر لیا۔اس کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے۔ایک دوسری جگہ صفحہ ۲۸ پر۔۔۔غور کیجیئے تو زندگی ،زندگی کی تمام ساعتوں کا یہ حال ہے خود زندگی اور موت کا فاصلہ بھی ایک قدم سے زیادہ نہیں ہوتا ہے۔

ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ
دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں ہے

یہ شعر سودا کا ہے۔طوالت کے خوف سے بچنے کے لیئے ہم ان تمام اشعار کا ذکر نہیں کریں گے۔صرف دو اشعار پر ہی اکتفا کریں گے تا کہ دوسرے فنکاروں کی نثر کا مزہ مل سکے۔

ہندوستان میں فلموں کی شروعات ۱۹۱۳ء میں ہوئی۔ ۱۹۳۰ء تک خاموش فلمیں دکھائی گئیں۔ ۱۹۳۱ء سے بولتی فلموں کی شروعات ہوئی۔اسی سال ہندوستان کی پہلی بولتی فلم ’’عالم آراء‘‘ بنی۔وہ زمانہ فارسی کے بعد کا زمانہ تھا۔مجبوراً اردو کو فلم کی زبان بنانی پڑی،جو اس وقت ہندوستانیوں کے ذہین عوام کی زبان تھی۔لہٰذا ہندوستان کے کونے کونے سے اردو جاننے والے شاعر،ادیب اور کلاکار نے ممبئی کی فلم انڈسٹری کا رخ کیا۔ان میں سے کچھ کامیاب ہوئے اور انہوں نے فلموں کو بہترین نغمے،اچھی کہانیاں،برجستہ اردو مکالمے سے اُسے عوام سے قریب کیا۔

ہم اردو کی مقبولیت کا وہ نظارہ ابھی تک نہیں بھولے ہیں جب محبوب پروڈکشن کا لوگو فلم شروع کرنے سے پہلے دکھایا جاتا ہے اور بیک گراؤنڈ سے آواز آتی ہے....

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

ایک گرجدار آواز کے ساتھ جب یہ شعر سنایا جاتا ہے تو ناظرین اپنی سیٹ چھوڑ کر بے ساختہ اچھل پڑتے ہیں۔کچھ اپنی خوشی کا اظہار تالیوں سے کرتے ہیں۔اس وقت تک کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ شعر کس کا ہے؟ حال ہی مَیں نے ایسے سیکڑوں اشعار کی تحقیق کے دوران پتہ لگایا کہ یہ شعر اردو کے ایک گمنام شاعر محمد رضا برق لکھنوی کا ہے۔مصرعہ اولیٰ میں تھوڑا تصرف کر دیا گیا ہے۔ممکن ہے یہ تصرف فلم والوں میں سے کسی نے شعر کو عام فہم بنانے کے لیے کیا ہو اور یہی شعر عوام میں مقبول بھی ہو گیا۔محمد رضا برق صاحبِ دیوان شاعر تھے۔وہ واجد علی شاہ کے

مصاحب میں سے تھے۔ سچ تو یہ ہے ایسے اشعار کو عوام میں آسانی سے پہنچانا فلموں کا ہی کارنامہ ہے۔ چند ذہین شاعروں کے ذہنی الماریوں میں سجے سجائے اشعار کو شہر شہر، گلیوں گلیوں میں فلموں کے ذریعہ عام کرنے اور مقبول کرنے کا کام فلموں نے ہی کیا ہے، ورنہ ان شاعروں اور ادیبوں کے ذہن میں ہی دفن ہو کر رہ جاتا۔ آج ہم ایسے مصرعوں کا ہی ذکر کریں گے۔ فلموں، رسالوں، ریڈیو، عام بول چال کی تحریر، تقریر میں اردو کے علاوہ شاید ہی کسی دوسری زبان کے اشعار استعمال ہوئے ہوں گے۔ فلموں کے ناظرین میں ایسے بھی ہیں جو اردو نہیں جانتے۔ پھر بھی وہ اردو شعر سن کر اور انہیں اپنی بات چیت میں استعمال کر کے اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ آپ تو یہ جانتے ہیں کہ یہ فلمیں ہندوستان کے کونے کونے میں دیکھی جاتی ہیں۔ چاہے وہ جنوب ہو یا شمال، یہی بمبئی والی فلمیں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ آج بھی ایسے فلموں کے ناظرین موجود ہیں جن کی زبان اردو نہیں ہے مگر وہ اردو کے ڈائیلاگ سن کر بے تحاشہ خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور اُسے ایک دوسرے کو سناتے ہیں۔

اردو کی ایک مقبول فلم ''مغل اعظم'' سے کون واقف نہیں ہے۔ یہ فلم انڈسٹری کی سب سے مہنگی تاریخی فلم تھی۔ اس فلم کا وہ گانا کیا لوگوں نے بھلا دیا ہے... ''پیار کیا تو ڈرنا کیا''۔ شکیل کا لکھا ہوا یہ گیت اس قدر مقبول ہوا کہ سیکڑوں لڑکے لڑکیوں نے اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف اپنے گھروں سے نکل کر شادی کر لی۔ لڑکیوں کے جذبات کو بھڑکانے میں اس فلم کا بڑا ہاتھ ہے۔ پھر اس فلم کا مقبول ڈائیلاگ ہر خاص و عام کی زبان پر آنے لگا۔ ''سلیم تجھے مرنے نہیں دے گا اور میں تجھے جینے نہیں دوں گا'' اس فلم کی نعت جو گیت کی طرح فلمائی گئی اور اس کا مکھڑا زبان زدِ خاص و عام ہو گیا۔

بے کس پہ کرم کیجیے سرکارِ مدینہ

ہم مذکورہ ڈائیلاگ کو آج تک نہیں بھلا پائے ہیں۔ اس سے اچھا ڈائیلاگ کوئی نہیں دے سکا۔ یہ اردو کے ادیب کا کمال ہے۔ عام بول چال، تحریر اور تقریر میں برجستہ اشعار لکھے جاتے ہیں اور ایسے اشعار زبان سے نکلتے ہی فوراً مدمقابل کے دماغ تک پہنچتے ہیں۔ یہ شعر جادو کا اثر رکھتا ہے۔ اس ایک شعر یا مصرعے سے بڑے سے بڑے مجمع کے رخ کو بدلا جا سکتا ہے جو ہزار جملے سے بھی ممکن نہیں ہے۔ ایسے اشعار کی مدد سے فلموں کے پروڈیوسر نے بھی وہی کام لیا ہے۔ مردہ جسم میں روح پھونکنے کا کام بھی ایسے اشعار سے لیا جاتا ہے۔ ایسے اشعار سے لوگوں کے پژمردہ خیالات کو حوصلہ دے کر ان کی رگوں میں خون دوڑایا جا سکتا ہے۔ ایسے اشعار کا نعم البدل نہیں ہے۔ یہ وہ اشعار ہیں جو اپنی سادگی و پرکاری میں اپنی مثال آپ ہیں۔ ایک شعر یا ایک مصرعے سے پوری داستان سنائی جا سکتی ہے۔ کسی طول طویل کہانی کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ اردو کا شاعر ہو یا ادیب یا کوئی قلم کار اپنی تخلیق میں ایسا برمحل شعر ضرور استعمال کرتا ہے۔ فلموں کے ڈائیلاگ، کہانی بھی اس سے مبرا نہیں۔ فلم کے رائٹر اور فلمی شاعر نے برمحل اشعار کا استعمال کر کے فلم کی دلچسپیوں میں چار چاند لگا دیے ہیں۔

مادرِ وطن کی محبت کی سرشاری کے لیے اردو کے دو مقبول اشعار ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا''......اور.......
''سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے''....سے بہتر ہندوستان کی کسی زبان میں برمحل شعر نہیں ہو سکتا۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے ان دونوں اشعار نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ برسوں تک ہندوستانیوں کی زبان پر یہ اشعار محفوظ رہے ہیں۔ سکھی جیون، بھائی بہن۔ دھرم پتر

فلموں میں سارے جہاں سے اچھا.....استعمال کرنے کی وجہ سے ملک کے کونے کونے کے نوجوانوں کی زبان پر یہ شعر برمحل ہوتا گیا۔اسکول اور کالج میں ترانے کے طور پر ستعمال ہونے کی وجہ سے بھی یہ ہرکس و ناکس کی زبان پر بیٹھ گیا۔ جولوگ آزادی کی تحریک میں شمولیت کرنے سے قاصر تھے انہوں نے اپنی زبان سے ہی شعر پر اپنا نام ثواب حاصل کرنے والوں میں شامل کرلیا۔ ہاں فلموں میں سرفروشی کی تمنا......رام پرشاد بسمل کی زبان سے سن کر ناظرین نے یہ سمجھا کہ یہ غزل رام پرشاد بسمل کی ہے مگر یہ غزل اس زمانے کے گمنام شاعر بسمل عظیم آبادی کی ہے۔اسی طرح........

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

فلم لال قلعہ میں بہادر شاہ ظفر کے کردار کی زبان سے سن کر لوگوں نے سمجھا کہ یہ غزل بہادر شاہ ظفر کی ہے حالانکہ یہ شعر مضطر خیرآبادی کا ہے۔ جن کا دیوان جاوید اختر مضطر کے ایک پوتے کے پاس ہے۔ میں اکثر کسی نا کسی فلم میں اس طرح کے اشعار کا استعمال دیکھتا ہوں۔فلم ''چودھویں کا چاند'' میں رحمان جانی واکر کے ساتھ اپنی محبوبہ کا انتظار بے صبری سے کرتا ہے اور یہ شعر پڑھتا ہے......

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

اسی فلم میں رحمان وحیدہ رحمٰن کے سامنے اپنا دل پکڑ کر زمین پر گر جاتا ہے اور فوراً ہی اپنی اصلی حالت میں آجاتا ہے۔ وحیدہ رحمٰن سکتے میں آجاتی ہے اور کہتی ہے.....''کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری'' ....یہ نسیم امروہوی کا شعر ہے جو اس طرح ہے.......

یہ انتظار نہ ٹھہرا کوئی بلا ٹھہری
کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

فلم دشمن میں راجیش کھنہ قوالی سنانے سے قبل ایک شعر سناتا ہے......

سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے
کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے

یہ مست کلکتوی کا شعر ہے۔

فلم ''آس کا پنچھی'' میں وجینتی مالا کے اسکوٹر سے ایکسی ڈنٹ ہو جاتا ہے تو راجندر کمار ان کے درمیان آنے والے مولوی کو بیوقوف بنا کر یہ شعر پڑھتا ہے.......... ''ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں''

کیا ہمارے ناظرین اردو کے شاعر کے گیت بھلا پائے ہیں۔فلم ''دو آنکھیں بارہ ہاتھ کا یہ گیت نما بھجن.....

اے مالک ترے بندے ہم
نیکی پر چلیں اور بدی سے بچیں

تا کہ ہنستے ہوئے نکلے دم

وطنیت سے تعلق رکھنے والے کچھ مصرعے بڑے مشہور ہوئے ہیں.........

؎ وطن کی آبرو خطرے میں ہے ہشیار ہو جاؤ

؎ اپنی آزادی کو ہم ہرگز مٹا سکتے نہیں

ساحرؔ کے گیت کا یہ شعر برمحل ہو گیا........

عورت نے جنم دیا مردوں کو
مردوں نے اسے بازار دیا

اور جگرؔ کا یہ شعر تو جیسے راجکمار کے لئے ہی کہا گیا ہے.......

؎
ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے زمانے سے ہم نہیں

فلم میں ڈائیلاگ کی طرح استعمال کرنے والے راجکمار تو اسی اردو کے لہجے کا ڈائیلاگ بول بول کر عوام میں اردو والے ہو گئے۔ وہ اگر فلموں میں رام کمار پنڈت کا بھی رول کرتے تھے تو انہیں اردو الفاظ سے بھرے ڈائیلاگ چاہیے تھے۔ وہ اپنے ڈائیلاگ خود تیار کرواتے تھے۔ اس پر راجکمار خوب محنت کرتے تھے۔

نخشب جارچوی، ڈاکٹر صفدر آہ، مجروح، شکیل، ساحر جیسے قد آور اردو کے شاعروں نے بے شمار فلمی گیت لکھ کر فلم کو مالا مال کر دیا۔ جب تک دنیا میں لوگ رہیں گے، ان کے گانے سنے جائیں گے۔ اردو کے شاعروں نے بھی فلموں میں کبھی اپنی غزل کبھی اردو کے بڑے شعراء کے اشعار کا استعمال کر کے فلم کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ غالبؔ کا ایک شعر ہے..........

؎
وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

مجروحؔ نے اس شعر کے بعد اپنا گیت شروع کیا ہے۔ لتا کی آواز میں یہ گیت فلم ''چھوٹے نواب'' کے لئے فلمایا گیا تھا۔ فلم 'آندولن' میں بھوپندر نے ایک گیت گایا ہے۔ گیت کی شروعات میں واجد علی شاہ رفتہ کے اس شعر سے کی ہے اور یہ شعر بار بار دہرایا جاتا ہے

؎
در و دیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

تعجب کی بات ہے کہ اس کے شاعر کا نام بسمل لکھا ہے۔ فلم 'شہید اعظم بھگت سنگھ' میں رام پرساد بسمل کے نام سے ایک گیت محمد رفیع کی آواز میں ہے۔ اس میں علامہ اقبال کا یہ شعر شامل کیا گیا ہے ؎

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روٹی

اس کھیت کے ہر گوشۂ گندم کوجلادو

پریم دھون کے گیتوں میں بھی اسی طرح برمحل شعر کو جذب کیا گیا ہے۔فلم 'بھارت کے شہید' میں مہندر کپور اور ساتھی نے ایک گیت گایا ہے جس میں یہ شعر شامل ہے۔یہ اقبال کا شعر ہے ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والوں
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

فلم ''دستک'' میں ان کی غزل..

؎

ہم ہیں متاعِ کوچہ وبازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نظرجو خریدار کی طرح

مجروح نے فلم ''تم میرے ہو'' میں حفیظ میرٹھی کا مصرع.......

؎ شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے دل ٹوٹے آواز نہ آئے

کو بدل کر اس طرح استعمال کیا.....

؎

شیشہ چاہے ٹوٹ بھی جائے
دل نہ کسی کا ٹوٹنے پائے

فلم ''تونہیں اور سہی'' میں داغ کے شعر کو استعمال کیا ہے......

؎

تو جو ہرجائی ہے ،اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی،اور نہیں اور سہی

ساحر اور شکیل نے اپنی اپنی فلم کے لئے شعر کہے جو موقع محل استعمال ہونے لگا۔

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق ساحر

غالب جسے کہتے ہیں اردو کا ہی شاعر تھا

اردو پہ ستم ڈھاکر غالب پہ کرم کیوں ہے
ساحر

ساحر نے اپنی فلم میں اقبال اور میر کا یہ مطلع استعمال کیا۔لوگوں نے سمجھا یہ ساحر کا مطلع ہے.......

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے

جہاں ہے تیرے لئے،تو نہیں جہاں کے لئے — اقبالؔ

پتہ پتہ ، بو ٹا بوٹا، حال ہماراجانے ہے
جانے نہ جانے دل ہی نہ جانے ، باغ تو سارا جانے ہے — میرؔ

مصحفی کے اس شعر کوشہریار نے بدل کر امراؤ جان فلم میں شامل کیا ہے.......

کیا چیز دل ہے، چاہئے تو جان لیجئے
پر بات کوئی ہے جو کہوں مان لیجئے

دل چیز کیا ہے آپ مری جان لیجئے — مصحفی
بس ایک بار میرا کہا مان لیجئے — شہریار

مندرجہ ذیل چند اشعار میں حمایت علی، پاکستان کے فلمی شاعر کے حوالے سے لکھ رہا ہوں جو فلموں میں استعمال ہوئے ہیں.........

نگری مری کب تک یونہی برباد رہے گی
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

دوسرا مصرعہ یگانہ چنگیزی کا ہے لیکن جوش نے فلم ''من کی جیت'' میں استعمال کیا ہے...........

آپ آئے تو خیالِ دلِ ناشاد آیا
آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا

یہ ریاض خیر آبادی کا مطلع ہے لیکن پہلے مصرعے کو ساحر نے فلم ''گمراہ'' اور دوسرے مصرعے کو مجروح سلطانپوری نے فلم ''آرتی'' میں اپنے مصرعوں کے ساتھ بطور مکھڑوں کے استعمال کیا ہے۔اس کے علاوہ ساحر کے یہ مکھڑے دیکھئے، فلم داستان اور بھائی بہن میں......

۱) نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے

۲) سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

''پھر صبح ہوگی'' میں مجید لاہوری کی پیروڈی کا یہ مطلع استعمال کیا ہے.....

چین وعرب ہمارا، ہندوستان ہمارا
رہنے کو گھر نہیں ہے، سارا جہاں ہمارا

نخشب نے نہ صرف نظام رامپوری کی غزل تضمین کے طور پر اپنی فلم میں شامل کر لی ہے بلکہ خواجہ میر دردؔ کی غزل کا نام رکھ کر پورا مطلع ہی مکھڑے کے طور پر استعمال کر لیا ہے۔داغؔ کا شعر ہے..............

لیجئے سنئے اب افسانہ فرقت مجھ سے
آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا

نظام رامپوری کا شعر.........

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیا مسکرا کے ہاتھ

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مرچلے

شکیل بدایونی نے میرابائی کے اکثر دوہوں کو مکھڑا بنا کر گیت لکھے ہیں اور بیدؔم اور داؔغ کے اشعار سے اپنے نغمات مرتب کئے ہیں۔

جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتا ہے
جہاں بجتی ہے شہنائی وہیں ماتم بھی ہوتا ہے

ہم کو تو گردشِ حالات پہ رونا آیا
رونے والے تجھے کس بات پہ رونا آیا

بات نکلی تو ہر اک بات پہ رونا آیا
زیست مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی

تو جو ہرجائی ہے ،اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی،اور نہیں اور سہی

ساؔحر اور شکیل نے اپنی اپنی فلم کے لئے شعر کہے جو موقع محل استعمال ہونے لگا۔

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق — ساؔحر

غالبؔ جسے کہتے ہیں اردو کا ہی شاعر تھا
اردو پہ ستم ڈھا کر غالب یہ کرم کیوں ہے — ساؔحر

ساحر نے اپنی فلم میں اقباؔل اور میؔر کا یہ مطلع استعمال کیا۔لوگوں نے سمجھا یہ ساحر کا مطلع ہے.......

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے،تو نہیں جہاں کے لئے — اقباؔل

پتہ پتہ ، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے دل ہی نہ جانے،باغ تو سارا جانے ہے — میؔر

مصحفی کے اس شعر کو شہریار نے بدل کر امراؤ جان فلم میں شامل کیا ہے.......

کیا چیز دل ہے،چاہئے تو جان لیجئے

پر بات کوئی ہے جو کہوں مان لیجئے
مصحفی

دل چیز کیا ہے آپ مری جان لیجئے
بس ایک بار میرا کہا مان لیجئے
شہریار

مندرجہ ذیل چند اشعار میں حمایت علی، پاکستان کے فلمی شاعر کے حوالے سے لکھ رہا ہوں جو فلموں میں استعمال ہوئے ہیں.........

نگری مری کب تک یونہی برباد رہے گی
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

دوسرا مصرعہ یگانہ چنگیزی کا ہے لیکن جوش نے فلم ''من کی جیت'' میں استعمال کیا ہے...........

آپ آئے تو خیالِ دلِ ناشاد آیا
آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا

یہ ریاض خیر آبادی کا مطلع ہے لیکن پہلے مصرعے کو ساحر نے فلم ''گمراہ'' اور دوسرے مصرعے کو مجروح سلطانپوری نے فلم ''آرتی'' میں اپنے مصرعوں کے ساتھ بطور مکھڑوں کے استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ ساحر کے یہ مکھڑے دیکھئے، فلم داستان اور بھائی بہن میں......

۱) نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے

۲) سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

''پھر صبح ہوگی'' میں مجید لاہوری کی پیروڈی کا یہ مطلع استعمال کیا ہے.....

چین و عرب ہمارا، ہندوستان ہمارا رہنے کو گھر نہیں ہے، سارا جہاں ہمارا

نخشب نے نہ صرف نظام رامپوری کی غزل تضمین کے طور پر اپنی فلم میں شامل کر لی ہے بلکہ خواجہ میر درؔد کی غزل کا نام رکھ کر پورا مطلع ہی مکھڑے کے طور پر استعمال کر لیا ہے۔ داغؔ کا شعر ہے.............

لیجئے سنئے اب افسانہ فرقت مجھ سے آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا

نظام رامپوری کا شعر.........

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیا مسکرا کے ہاتھ

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

شکیل بدایونی نے میرا بائی کے اکثر دوہوں کو مکھڑا بنا کر گیت لکھے ہیں اور بیدؔم اور داغؔ کے اشعار سے اپنے نغمات مرتب کئے ہیں۔

جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتا ہے
جہاں بجتی ہے شہنائی وہیں ماتم بھی ہوتا ہے

ہم کو تو گردشِ حالات پہ رونا آیا
رونے والے تجھے کس بات پہ رونا آیا — سیف

بات نکلی تو ہر اک بات پہ رونا آیا
زیست مانگی تھی، خدائی تو نہیں مانگی تھی — ساحر

پیار مانگا تھا جدائی تو نہیں مانگی تھی
لپٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے

الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے — محمود رامپوری

ڈر کے بجلی سے یکایک وہ لپٹنا اس کا
اور پھر شرم سے بل کھاکے سمٹنا اس کا — ساحر

اس طرح کے اور بھی مصرعے اور اشعار جو تحریر میں استعمال ہوتے ہیں ۔تفصیل میں نہ جاتے ہوئے صرف چند شعر درج کررہاہوں۔......

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے — شہیر

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی
یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے — مضطرب

اک آگ کا دریا ہے اور دوب کے جانا — جگر
دنیا کے جو مزے ہیں ہرگز وہ کم نہ ہوں گے

چرچے یونہی رہیں گے،افسوس ہم نہ ہوں گے — ترقی
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب — غالب
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — اقبال
کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو — تراب
بیکس پہ کرم کیجئے سرکارِ مدینہ — شکیل

سینے میں جلن ،آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے — شہریار

یہ اور اس طرح کے کئی اشعار فلموں میں استعمال ہوئے ہیں اور عوام میں بے حد مقبول بھی ہیں۔

فلم کی تیاری میں بہت سے لوگ پردے کے پیچھے ہوتے ہیں جن کے کاموں کو بھی دیکھ کر فلم کو اچھا برا کہا جاتا تھا۔ ان سب میں فلم کے نغمہ نگاروں کا رول بڑا اہم ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ ان نغموں کی وجہ سے بھی فلم کو دیکھنے جاتے تھے۔ اگر کسی فلم کا نغمہ بھی ہٹ ہو جاتا تھا تو وہ فلم ہٹ ہو جاتی تھی۔ عام لوگوں تک اپنی بات فن کو پہنچانے کا اس سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں تھا۔ اس بات کو جانتے ہوئے سیکڑوں شاعر اور ادیب فلم سے جڑے اور اپنی خوبیوں کی وجہ سے لوگوں میں مشہور ہوئے، ان میں زیادہ تر شعرا اور ادبا تھے جو مشاعروں، رسالوں میں اپنا اپنا ایک مقام بنائے ہوئے تھے یا بنانے میں لگے تھے۔ یہاں آ کر انہوں نے ادب کی بھی آبیاری کی۔ فلموں میں کام ملنے کی وجہ سے اردو ادب میں بھی اپنا ایک مقام بنایا۔ فلم میں شامل نغمہ نگاروں کا کام اتنا مشہور ہوا کرتا تھا کہ بڑے بڑے شاعر کے دل میں یہ بات ضرور ہوتی تھی کہ اسکی کم از کم ایک غزل بھی کسی فلم میں شامل ہو جائے۔ ان میں سے چند شعرا نے تو فلم میں آ کر ادب کو ہی بھلا دیا۔ کچھ نے چند دنوں فلم کے میدان میں نام کیا۔ دو تین بڑے شاعر دو چار فلموں میں ہی نغمیں لکھ پائے۔

فلم کی ابتدا میں تو ایسے نغمیں آئے جو تجربے کے طور پر تھے اس لیے ان کے شاعروں کو عوام کی پسند اور ناپسند کے درمیان رہ کر دیکھنے میں ان کا وقت نکل گیا۔ میری ناقص رائے یہ ہے کہ جب شاعروں نے اردو غزل کو فلموں کے ذریعہ عام کیا تو پھر وہ مشہور ہوئے۔ مجروح سلطان پوری ساحر لدھیانوی اور شکیل تک آتے آتے اردو غزل نے فلموں میں سکّہ جما لیا۔ ان حضرات نے جو نغمیں لکھے وہ عوام میں پسند کیے جانے لگے۔ شاعروں نے تجربے شروع کیے۔ انہوں نے سوچنا شروع کیا کہ اپنے نغموں کو خوب سے خوب تر کیسے بنایا جائے۔ انسان میں جب یہ جنون آ جاتا ہے تو وہ پرائے مال کو بھی اپنا بنا کر پیش کرنے سے بھی نہیں چوکتا ہے۔ فلمی شاعری میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اپنے نغموں کی شروعات اچھے اچھے برمحل اشعار مکھڑوں (شروع کا ایک شعر) کے طور پر استعمال کئے جو اپنے زمانے میں اور بعد کے زمانے میں بہت مشہور تھے۔ ایسے اشعار جو عام بول چال، تحریر اور تقریر میں استعمال ہوتے ہیں وہ بہت مشہور ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے فلمی شعراء ایسے اشعار سے بخوبی واقف تھے ہاں یہ بات ضرور ہے کہ انہیں شاعر کا نام نہیں معلوم رہا ہوگا۔ انہوں نے نغموں کو اوکے کرانے کے لئے بھی ایسے اشعار سے نغموں کی شروعات کی ہوگی جنہیں سن کر میوزک ڈائریکٹر اور پروڈیوسر وغیرہ خوش ہو جایا کرتے تھے۔ انھوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ مکھڑے اسی شاعر کے ہی ہونگے۔ ناظرین بھی اس وقت اس تعلق سے باشعور نہیں تھے اور زیادہ تر ادیب اور محقق فلمی شاعری کو ایک الگ شاعری مانتے تھے۔ ایسے لوگوں میں بھی کئی نے تو برمحل اشعار کو ساحر اور مجروح کا ہی سمجھا تھا، آج بھی سمجھتے ہیں۔ میری تحقیق کا یہ ایک حصّہ ہے اس لئے اس موضوع پر ایک اشارہ دینا چاہتا ہوں۔

مجروح

فلم میں سب سے زیادہ سرقہ مجروح سلطان پوری نے کیا ہے۔

فلم تو نہیں اور سہی کا ایک نغمہ جس کے بول (مکھڑا) ہیں

تو ہے ہرجائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

یہ شعر ایک گمنام شاعر مرزا ابلال کا ہے مگر لوگ داغ دہلوی کے نام سے پڑھتے ہیں۔ مجروع سلطان پوری نے اس شعر کو ٹیپ کا مصرع بنا کر جو نغمہ لکھا ہے اس کا ایک بندلا جواب ہے۔

دعوئ الفت کا کیا خود ہی منہ موڑ لیا
بے وفا آپ ہوئے مفت میں بدنام کیا

ہم ہیں بدنام تو پھر طور سے بے طور سہی
تو نہیں او رسہی او رنہیں اور سہی

فلم چراغ (انیس سوانہتر) لتا منگیشکر کا گایا ہوا۔

''تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے''

یہ اٹھیں صبح چلے یہ جھکیں شام ڈھلے

مصرع اولیٰ فیض احمد فیض کی نظم کا ہے۔ عرصہ تک اسے مجروع کا مصرع سمجھا جاتا رہا۔ فلم کالی ٹوپی لال رومال، محمد رفیع کی آواز میں اس نغمے کا مکھڑا

دیوانہ آدمی کو بناتی ہیں روٹیاں
خود ناچتی ہے سب کو نچاتی ہے روٹیاں

نظیر اکبرآبادی کی مشہور نظم کے شعر کا چربہ ہے جس کو مجروح نے ٹیپ کا شعر بنایا ہے۔ فلم چھوٹے نواب میں لتا کا گایا ہوا نغمہ جلیل مانک پوری اور غالب کے شعر کا چربہ ہے۔

چرا کے دل بن رہے ہیں بھولے
جیسے کچھ جانتے نہیں

کوئی بتاؤ کہ ہم کیا کریں
وہ ہم کو پہچانتے نہیں

ان اشعار کو پڑھیں اور جلیل اور غالب کا شعر یاد کریں۔

یہ جو سر نیچے کئے بیٹھے ہیں
جان کتنوں کی لئے بیٹھے ہیں — جلیل مانک پوری

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا — غالب

فلم چھوٹے نواب۔ غالب کا شعر ہے۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

فلم دروازہ ۱۹۵۴ میں ایک نغمے کی شروعات مضطر خیر آبادی کی غزل کے اس شعر سے ہوتی ہے۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں ؎

اس غزل کو مندرجہ ذیل فلموں میں استعمال کر کے اس کے گیت کار واں نے داد حاصل کی۔

آواز، ممتاز بیگم ۱۹۳۴ وہ کون ۱۹۳۵ سرلا ۱۹۳۶ ٹوٹے تارے ۱۹۴۹ بانو ۱۹۴۰ لال قلعہ ۱۹۶۰ نور الٰہی ۱۹۷۶، بھولے بھولے ۱۹۳۹ وغیرہ فلموں میں مذکور غزل کا استعمال کیا گیا تھا۔ فلم نوکر ۱۹۴۰ میں ایک نغمہ لگتا نہیں ہے دل مرا اجڑے دیار میں بہادر شاہ ظفر کا سمجھ کر استعمال کیا گیا ہے مگر اس کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ دیگر فلموں میں بھی یہ غزل بہادر شاہ ظفر کے نام سے سنائی گئی ہے۔ یہ غزل بہادر شاہ ظفر کے نام سے مشہور ہو گئی تھی لیکن اب مضطر خیر آبادی کا کلیات شائع ہو گیا ہے۔ اس میں یہ غزل موجود ہے اور بخطِ شاعر ہے۔ اس فلم کے ایک دوسرے نغمے میں یہ مشہور شعر

نگاہ نیچی کیے سر کو جھکایے بیٹھے ہیں
یہی تو ہیں جو میرا دل چرائے بیٹھے ہیں

یا پھر

کھنچے کھنچے سے نظر چرائے بیٹھے ہیں
انہیں سلام جو سر جھکائے بیٹھے ہیں

اور جلیل مانک پوری کے اس شعر کو بھی پڑھیں

یہ جو سر نیچے کیے بیٹھے ہیں
جان کتنوں کی لئے بیٹھے ہیں

میں شادی کرنے چلا (۱۹۶۲) یہ شعر

جذبہ دل جو سلامت ہے تو انشاء اللہ
کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے

یہ شعر کس کا ہے ابھی تک نہیں ملا ہے لوگوں نے اسے انشا کا شعر کہا ہے مگر ان کے دیوان میں نہیں ہے۔

بہاروں کے سپنے (انیس سو سرسٹھ)

لتا کی آواز میں گائے ہوئے نغمے کی شروعات اس شعر سے ہوتی ہے

زمانے نے مارے جواں کیسے کیسے

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

امیر مینائی کے شعر کا چربہ ہے۔اس طرح کے دس سے زیادہ شعر اردو شاعری میں کہے گئے ہیں۔

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

گیارہ ہزار لڑکیاں (انیس سو باسٹھ)

سب لوگ جدھر وہ ہیں ادھر دیکھ رہے ہیں
ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

یہ شعر داغ کا ہے اور مہتاب داغ کے صفحہ نمبر ۹۲ پر ہے۔ فلم ممتا ۱۹۶۶

یہ مشہور شعر آوارہ گرد اشعار قاضی عبدالودود کے مطابق وحید الہٰ آبادی کا ہے اور اسی طرح ہے۔حالانکہ میری تحقیق کے مطابق یہ شعر مضطر خیر آبادی کا ہے۔

میں نے اس کے سامنے پہلے تو خنجر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا دل رکھ دیا سر رکھ دیا

یہ شعر داغ کے دیوان میں بھی ہے اور ایک مشہور واقعہ بھی اس سے منسلک ہے۔کسی نے اس شعر کو سن کر کہا تھا کہ یہ شاعری ہے یا قصائی کی دکان؟ قائم چاند پوری کا ایک شعر بہت مشہور ہے

ٹوٹا جو کعبہ کون سی یہ جائے غم ہے شیخ
کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

اولیٰ مصرع اس طرح مشہور ہے۔ ؎ کعبہ اگر چہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ

مندرجہ ذیل شعر کا عکس فلم ''تم میرے ہو'' ۱۹۹۰ کے مکھڑے میں دیکھا جا سکتا ہے۔

شیشہ چاہے ٹوٹ بھی جائے
دل نہ کسی کا ٹوٹنے پائے

فلم کیا کہنا ۲۰۰۰ میں

ان کے قدموں کے نیچے شاید یہ میرا دل ہے
دیکھو تو کیا ایسی ہی بات ہے

یہ مصرع ٹیپ کا مصرع بنایا گیا ہے جو سراج لکھنوی کے شعر کا چربہ ہے اور پیروڈی بن گیا ہے۔شعر اس طرح ہے۔

آپ کے پاؤ ں کے نیچے دل ہے
اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

ون ٹو کا فور میں

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو
کیسے تیرا نداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

یہ وزیر لکھنوی کا شعر ہے۔فلم انداز ۱۹۵۴ کا ایک اور مکھڑا

نگاہیں بھی ملا کرتی ہیں اور دل دل سے ملتا ہے
مگر اک چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے

اولیٰ مصرع تو عام ہے بہت سے شاعروں کے یہاں ملے گا، دوسرا داغ کا ہے۔مری جاں چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے

فلم آرتی میں ریاض خیر آبادی کے شعر کا دوسرا مصرع استعمال کیا گیا ہے۔

آپ آئے تو خیالِ دلِ ناشاد آیا
آپ نے یاد دلا یا تو مجھے یاد آیا

اس کے علاوہ علاقائی طور پر کئی لوک گیتوں کو دھڑلے سے فلمی شاعروں نے مکھڑے بنائے ہیں یا انترے کے طور پر استعمال کیے ہیں۔اسی لئے تو معروف فلمی صحافی رشید انجم گیتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''فلم صنعت ایک ایسی فیکٹری ہے کہ جس کے خام میں ملاوٹ کی بڑی گنجائش ہے اور جب وہ مال پالش ہو کر مارکیٹ میں آجاتا ہے تو خریدار صرف اس کی چمک سے ہی مرعوب ہو کر مہنگے داموں میں خریدنے پر اتاروں ہو جاتا ہے۔'' لوگ گیتوں کے چربے پر لکھنا ایک الگ موضوع ہے۔اب پھر میں اپنے موضوع پر آگیا ہوں۔سرقہ کرنے والوں میں تقریباً ہر فلمی شاعر شامل ہے۔

نخشب۔ نخشب جارچوی نے ایک فلم طوفان ۱۹۵۸ میں بنائی تھی اس کے پانچ نغموں میں سے دو نغموں کا مکھڑا

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا مجھے تو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ

نظام رام پوری کی غزل کا مشہور شعر ہے جو ادا بندی کے نمونے کے طور پر استعمال ہوتا ہے آشا بھوسلے اور خان مستانہ نے گایا تھا

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

یہ درد دہلوی کا شعر ہے۔

نخرے والی (انیس سو ساٹھ) میں شکیلہ بانو بھوپالی نے ایک قوالی گائی تھی جس کی شروعات امیر مینائی کے شعر سے ہوئی ہے۔

تیر پر تیر لگاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے
سینہ کس کا ہے مری جان جگر کس کا ہے

ساحر لدھیانوی

بی آر چوپڑا کی فلم داستان ۱۹۷۲ کی غزل بہت مشہور ہوئی جو ساحر نے لکھی تھی۔جس کا مطلع (مکھڑا) تھا

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے

ترا وجود ہے اب صرف داستاں کے لئے

یہ شعر علامہ اقبال کے مشہور شعر کا چربہ ہے

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لئے

فلم داغ کی یہ غزل بھی بہت مقبول ہوئی تھی۔

جب بھی جی چاہے اک نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ
ایک چہرے پر کئی چہرے لگا لیتے ہیں لوگ

قتیل شفائی کی غزل میں ساحر نے تھوڑا تصرف کیا ہے۔

جب بھی چاہیں یک نئی دنیا بنا لیتے ہیں لوگ

ساحر نے کہاوتوں کو فلموں کا مکھڑا بنایا۔

فنٹوش (۱۹۵٦ء) ''دینے والے جب بھی دیتا پورا چھپر بھاڑ کے دیتا''

بڑے سرکار (۱۹۵۷) ''جب ہم تم دونوں راضی تو کیا کرے گا قاضی''

سچے موتی (۱۹٦۲ء) ''سچے کا بول بالا سنورے بھائی جھوٹے کا منہ کالا''

نیا دور (۱۹۵۷ء) ''بھگوان کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں ہے''

ایک شعر یاد آیا بشیر بدر نے ساحر کا یہ مصرع لے کر اپنا شعر مکمل کیا ہے۔

جورو کا غلام (۱۹۵٦ء)

صبح کا انتظار کون کرے
تری زلفوں سے پیار کون کرے

بشیر بدر

صبح کا انتظار کون کرے
آج کل دن میں کیا نہیں ہوتا

مگر بشیر بدر نے جدید رنگ بھر کر شعر کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے، قابل ذکر ہے۔

سادھنا (۱۹۵۸ء)

سنبھل اے دل تڑپنے اور تڑپانے سے کیا ہوگا

اس مصرع سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ''تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے''

گمراہ (۱۹٦۳ء)

آپ آئے تو خیالِ دلِ ناشاد آیا
کتنے بھولے ہوئے زخموں کا پتا یاد آیا

مصرع اولیٰ ریاض خیر آبادی کا ہے

لیلا مجنوں (۱۹۷۵ء)

حسن حاضر ہے محبت کی سزا پانے کو
کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو

دوسرا مصرع گمنام شاعر شیخ تراب علی قلندر کا ہے۔

شہر میں اپنے یہ لیلا نے منادی کردی
کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو

ساحر نے پھر صبح ہوگی میں مجید لاہوری کا یہ پیروڈی استعمال کیا ہے۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
رہنے کو گھر نہیں ہے سارا جہاں ہمارا

آج تک سارے لوگ اسے ساحر کا شعر سمجھتے ہیں۔ سیف الدین سیف کا ایک شعر

ہم کو تو گردشِ حالات پہ رونا آیا
رونے والے تجھے کس بات پہ رونا آیا

ساحر کا استفادہ ہے۔

بات نکلی تو ہر ایک بات پہ رونا آیا
فلم میرے محبوب کے ایک نغمہ میں

پاس رہتے ہوئے بھی تجھ سے بہت دور ہیں ہم
قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم

مصرعہ ثانی علامہ اقبال کا ہے۔

شکیل بدایونی۔ مرزا محمد تقی ترقی کے مشہور شعر دنیا کے جو مزے ہیں ہرگز وہ کم نہ ہونگے

❁❁❁

باب۔۵

وہ اشعار جن

کا

ایک ہی مصرع مشہور ہے

باب ۔۵ وہ اشعار جن کا ایک ہی مصرع مشہور ہے

عام بول چال کے اشعار میں صرف ایک ہی مصرع مشہور ہے۔اس ایک مصرع کو اتنا استعمال کیا گیا ہے کہ دوسرا مصرع کیا ہے لوگوں کو معلوم نہیں ہے صرف ایک ہی مصرع استعمال کر کے لوگ اپنی بات مکمل کر لیتے ہیں۔مثال کے طور پر ایک شخص بیمار ہوتا ہے اور وہ ہو سپٹل میں داخل ہو کر ٹھیک ہو جاتا ہے مگر اس کے لئے کافی پیسہ خرچ ہونے کی وجہ سے اپنے دوستوں کے سامنے افسوس ظاہر کرتا ہے تو ایسے موقع پر دوستوں میں کوئی کہتا ہے جانے دو یار.........."جان ہے تو جہان ہے پیارے"

یہ میر کا شعر ہے اور اس کا دوسرا مصرع ہے۔میر عمداً بھی کوئی مرتا ہے۔اب اس مصرع کو بہت خاص لوگ جن کو شعر و ادب کی زیادہ معلومال ہوتی ہے وہ جان سکتا ہے ورنہ لوگ تو ایک ہی مصرع سے اپنا کام چلا لیتے ہیں۔اور یہ جان اللہ کی امانت ہے اس کو اس کی عبادت میں لگا دو۔فرشتے تو اللہ کی عبادت کے لئے تو ہیں مگر تم بھی اس کا شکر ادا کرو جس نے تمہیں بنایا ہے۔دوسروں کے کام آؤ جس کے لئے دنیا میں آئے ہو۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں
ایسا جینا چاہئے کہ خنجر کسی اور پہ لگے اور اس کا درد سینے میں ہو یعنی
سارے جہاں کا درد تمہارے جگر میں ہو

آیا ہے دنیا میں تو کچھ کام کئے جا اور دنیا کے سفر میں اگر تم چاہو تو
ہزار ہا شجر سایہ دار میں ہے

جس طرح پتھر پہ پسنے کے بعد حنا کا رنگ چوکھا ہو جاتا ہے اسی طرح تکلیف کے بعد ہی تمہاری زندگی میں آرام آئیگا۔

کیوں کہ سرخرو ہوتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد

زندگی زندہ دلی کا ہے نام

اب یہ زندگی تو تمہاری یہ تمہارے ہاتھ میں ہے اسے رو کر گزارو یا ہنس کر گزار۔ایسا نہ ہو کہ وقت گزر جائے اور اپنا کام تم نہ کر سکو اور تمہیں یہ کہنا پڑے۔ ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

عشق کی شروعات کو دیکھ کر ایک تجربہ کار شخص عاشق کو کہتا ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

اس ایک شعر سے عشق کی تمام تکلیفات کا اشارہ ملتا ہے جو عاشق کو جھیلنا ہے۔جب عاشق کو ہمیشہ مغموم دیکھتا ہے تو اکثر لوگ کہتے ہیں۔

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے

ان دنوں کچھ اس طرح کا حال ہے۔ دیکھتا کچھ ہوں دھیان میں کچھ ہے۔

وہ کہتا ہے کہ آپ کیا جانیں گے پیار کرنے والوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے اور اس کا دل جب کسی کے پاس چلا جاتا ہے تو اسکے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ ؎ رویا کریں گے آپ بھی پہروں میری طرح

یا پھر کوئی کہتا ہے۔ عاشق ایسی بے خودی میں ہے کہ اس کو اپنا ہی ہوش نہیں ہے پہلے آگ تھے اب خاک ہو گئے۔ روتے روتے اس کا برا حال ہو جاتا ہے۔ لوگ دلاسا دیتے ہیں تو وہ کہتا ہے میرا حال ایسا ہی رہے گا۔ تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

دل اس طرح تڑپتا کہ ہے عاشق بے زار ہو کر دعوی کرتا ہے۔ ؎ مجوں مجنوں لوگ کہے ہیں مجنوں کوئی ہم سا ہوگا

دیکھو اس دل کے بیمار کو دوا کام نہیں کر رہی ہے کیونکہ یہ بیماری لاعلاج ہے، یہ عشق ہے۔ میر کے لہجے میں

دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
جو گزرے ہے مجھ پر خدا جانتا ہے

اور ایک دن اس میں سے اکثر عاشق کو کہتے سنا ہے کہ۔

مر جایئے کسی سے پر الفت نہ کیجئے
خدا کسی کو گرفتار زلف کا نہ کرے

کچھ غرض کفر سے رکھتے ہیں نہ اسلام سے ہم

عشق نے اس کو کسی کام کا نہیں رکھا ہے۔ کبھی کہتا پھرتا ہے۔

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

لیکن معشوق اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ کیوں کہ بے وفائی اس کا شیوہ ہے۔ عاشق وفا کرتا ہے تو سامنے سے اس کے اوپر جفا کیا جاتا ہے۔ اور یہ زندگی جہنم بن جاتی ہے۔ اب ایسی حالت میں وہ بھی اسے بے ننگ و نام کہتا ہے۔ اس کو کچھ نہیں گردانتا نہیں ہے۔ اور اپنی پوری زندگی اسی میں صرف کر دیتا ہے۔ ؎ شب فراق کٹی روز انتظار آیا

اور ایک دن اپنی جان گنواں بیٹھتا اور جنازہ کو جاتے ہوئے دیکھ کر لوگ یہ کہتے ہیں۔ عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اور پھر لوگ کہتے ہیں کہ ؎ جنگل مجنوں سے آباد ہوا کرتا ہے مجنوں جو مر گیا تو جنگل اداس ہے

اس طرح کے حالات اور واقعات پر زبان زد اشعار کئی اور لکھے جاتے ہیں۔ طوالت کے خوف سے اب زیادہ معلومات نہیں دے پاؤں گا۔ اب میں صرف ایک مصرع جو اس طرح آئے دن استعمال ہوتے ہیں وہ لکھ رہا ہوں۔

آذر	بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی
اکبر میرٹھی	یا نبی سلام علیک، یا رسول سلا م علیک
آشنا	تمہاری جاؤں جاؤں نے ہمارا دم نکالا ہے
احسان کاکوروی	میں چپ رہوں بھی تو تصویر بول اٹھتی ہے
اثر صہبائی	ہر ایک دل کو غمِ جاوداں نہیں ملتا
اختر شیرانی	محبت کریں خوش رہیں مسکرادیں
اقبال سہیل	ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے
انجم جبل پوری	جب تراشے جاؤ گے تو دیوتا کہلاؤ گے
سردار پنچھا	سر پر گرا پہاڑ تو فریاد کیا کر دو دن خزاں کے ہوتے ہیں دو دن بہار کے
قیس دیوانہ ہوا، لیلیٰ کی شہرت ہوگئی۔ بےنظیر	جو چھلک گئی تو چھلک گئی جو بھری رہی تو بھری رہی کس کام کا وہ گل ہے کہ جس گل میں بو نہ ہو
جوہر	نہ کوئی رہا ، نہ کوئی رہیگا
	شہباز ہے حرام، کبوتر حلال ہے آدمی کو ربِ اعلیٰ پر توکل چاہیے
جمال قریشی	جو ایک برگ نہ دے گلاب کیا دے گا
حفیظ بنارسی	جب زلف سنواری ہے اک آئینہ ٹوٹا ہے
خالد	یہ سب تمہارا کرم ہے آقا کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے
خاطر	بندے بھی ہو گئے ہیں خدا تیرے شہر میں
خلیل بڑولوی	خیال رزق ہے رزاق کا خیال نہیں
مولوی ذاکر	کترا کے نکل جاتے ہو کیوں راہ میں ہم سے

راسخ — کھاتا تا ہے سوکھے ٹکڑے بھگو کر شراب میں

مولانا احمد رضا — مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام

شاعر — دیکھتے ہی دیکھتے کیتنے بدل جاتے ہیں لوگ

سحاب قزلباش — دل جلاؤ کہ روشنی کم ہے

ساغر — ذرا نقاب اٹھاؤ بڑا اندھیرا ہے

ساغر نظامی — یہاں شراب سے انساں بنائے جاتے ہیں

ساجد — میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا

سحر — صرف مسلم کا محمدؐ پہ اجارا تو نہیں

سوز — جو گہنہ کیجئے ثواب ہے آج

لوگ پتھر کو خدا مان لیا کرتے تھے
جو میکدے میں چھلکتے رہے سبو کی طرح
اک چراغ بجھتا ہے سو چراغ جلتے ہیں

شیدا — اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

شعری بھوپالی — جو غیر چاہتے تھے وہی بات ہوگئی

یہ ایک ابر کا ٹکڑا کہاں کہاں برسے
تمام دشت ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے — شکیب جلالی

تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر
جو جلاتا ہے کسی کو خود بھی جل جاتا ہے وہ

شہاب جعفری — تو ادھر ادھر کی نہ بات کر یہ بتا کہ قافلے کیوں لٹا
مجھے رہزنوں سے گلہ نہیں تیری رہبری کا سوال ہے

شہریار — اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے

مضطرب	مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی
جگر	اک آگ کا دریا ہے اور دوب کے جانا ہے
شہیر	وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے
تراب	کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے
شکیل	بیکس پہ کرم کیجئے سرکارِ مدینہ
واجد علی شاہ	خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں
ظریف لکھنوی	کچھ حقیقت ہی نہیں کھلتی ہے سیتا رام کی

آغاز تو اچھا ہے انجام خدا جانے
راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا

ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

پاسبان مل گیا کعبہ کو صنم خانے سے
تم سلامت رہو ہزار برس
اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

یگانہ
یکساں کبھی کسی نہ گذری زمانے میں

ظہیر کاشمیری	ہمارے بعد اندھیرا نہیں جالا ہے
ظہیر کاشمیری	سیرت نہ ہو تو عارض و رخسار سب غلط
بہزاد	اب کچھ بھی نہیں مجھ کو مدینے کے سوا یاد
یگانہ	چت بھی اپنی ہے، پٹ بھی اپنی ہے
شاد عظیم آبادی	کھلونے دے کے بہلا یا گیا ہوں
سودا	موسیٰ نہیں کہ سیر کروں کوہِ طور کا

معجز	سکندر جب چلا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے
نخشب جارچوی	نگاہیں ملیں اور قدم ڈگمگائے
غا لب	آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
	نفرت نہیں کرتے ہم انگور کے دانے سے
جو ہر	اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد
	کیا تم نے محبت کی ہر رسم اٹھا ڈالی
سیماب اکبرآبادی	ہر چیز پر بہار، ہر ایک شئے پہ حسن تھا

داغ

تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

زبان زد اشعار میں قرآنی تلمیحات

❁❁❁

باب۔۶

ایسے
اشعار میں قرآنی تلمیحات

باب ۔٦۔ ایسے اشعار میں قرآنی تلمیحات

غزل کے موضوعات پر جب ہم بات کرتیں ہیں تو ہمیں چند نقادوں کی باتیں یاد آتی ہیں، بھلے ان میں اختلافات ہوں انمیں سچائی ضرور ہے۔ان باتوں کو ذہن مے رکھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہونچ جاتے ہیں کہ غزل میں شائد ہی کوئے ایسا موضوع ہوگا جسے نہ باندھا گیا ہو،

غنائیہ، وصفیہ، ادئے بیانیہ، ڈرامائی، رزمیہ، تدریسی، وطنی، اسلامی، رثائی، مدحیہ سب کے سب اس میں موجود ہیں لیکن ہمارے دانشوروں نے اپنے اپنے ازم کے مطابق شعر کا مفہوم سمجھا ہے۔اس لئیا س میں اختلاف کی گنجائش پیدا ہوگئی ہے، کبھی کبھی تو ایک دوسرے سے الگ بھی لگنے ہیں، اس کی وجہ ان کی تعلیم، دین کا معاشرہ اوران کا نظریہ بھی ہوتا ہے اور ایک خاص بات ہر غیر معمولی فن کار جس ادبی ماحول میں پیدا ہوتا ہے۔اس کے اطراف میں پھیلی ہوئی روائتیں اسے متاثر کرتی ہیں۔اور وہ ان روایتوں کی انگلی تھام کر چلتا ہے۔اس کے آس پاس کے ماحول کا بھی اس پر اثر ہونا لازمی ہے۔حالات جب اپنی کینچلی اتارتے ہیں، نئے علوم، اکتشافاتِ نو بہ نو سے جب امکانات کے دائرے پھیلنے اور سکڑنے لگتے ہیں اس وقت انسانی فکر میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔فکر و نظر کے زاویے بدل جاتے ہیں اور جگر کے لفظوں میں ’’ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی سے انسان روشناس ہوتا ہے اور لازماً ادب میں بھی اس کے مظاہرے سامنے آجاتے ہیں اور شعر و ادب اپنے لیے نئی راہ بنانے میں لگ جاتے ہیں۔

غزل اردو ادب کی سب سے قدیم اور سب سے الھڑ، صنف سخن ہے۔غزل کا ذکر آتے ہی تصور بھی سامنے آجاتا ہے جیسے ایک الھڑ شوخ اور چنچل نار اٹکھیلیاں کرتی نگاہوں کے سامنے گذر گئی ہو۔بقول غالبؔ

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
عشوہ و غمزہ و ادا کیا ہے

غزل کی تعریفیں بہت مختلف نوعیت کی نہیں ہیں۔قدیم زمانے سے غزل کی شاعری میں تغزل کو شرطِ لازم قرار دیا گیا ہے۔بہت سے لوگ لفظی دروبست پر زور دیتے ہیں اور بہت سے لوگ جدّتِ تخّیل سے کام لینے کو بنیادی شرط مانتے ہیں۔اصل میں یہی وہ لوگ ہیں جو حالات کے بدلتے موسموں کے مطابق غزل میں نئی فکری تخم ریزی کرتے ہیں۔اردو غزل کو عصری ضرورتوں کے عنوان سے سنوارتے اور ڈھالتے ہیں، اس میں تسلسل، بوقلمونی، تنوع اور امکان کا حسین روپ اجالتے ہیں۔اردو غزل کا سارا سانچہ یہاں تک کہ اصطلاحات، الفاظ، علائم، استعارے اور بڑی حد تک تشبیہات و تعلیقات تک فارسی سے مستعار ہیں۔مگر اردو ادب میں انسان کے کائناتی تصورات اور عصری میلانات کا جتنا گہرا عکس ملتا ہے وہ فارسی کیا برصغیر کی دوسری زبانوں میں بھی نظر نہیں آتا۔اردو غزل کے سامنے دوسری زبانوں کی غزل ایک ایسی دوشیزہ کے روپ میں سامنے آتی ہے جس کا سارا روپ، بناؤ سنگھار اور ساری آرائش اردو غزل کی الھڑ دوشیزہ کے حسنِ سادہ کے آگے پھیکی پھیکی ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان نے اردو غزل کو معشوق سے بات کرنے کا نام دیا ہے۔ بہت سے اہلِ دل غزل گو اُسے تصوف اور خانقاہوں کی چہاردیواری میں مقید کردینے کو آبروئے غزل کی بکارت کی حفاظت قرار دیتے ہیں۔

حالؔی نے اردو غزل کو قوم و نیچر سے جوڑ کر ایک نیا روپ انوپ دے دیا ہے اور اقبال نے اسلامی شاعری کے پردے میں دین اور دنیا

دونوں کو ساتھ لے کر چلنے کی شاعری کی ہے، اقبالؒ نے شاعری کو جز ویست از پیغمبری کہہ کر جو فلسفیانہ حقیقت بیانی کا رُخ دیا ہے اس نے ان کی پوری شاعری کو غیر معمولی شاعری بنادیا ہے۔ فلسفہ کے ساتھ ساتھ فکر وفن کا ساتھ ہو جائے تو وہ عظیم شاعری جنم لیتی ہے جو زبان و مکان کی حدود و قیود سے آزاد، آفاقی، غیر فانی شاعری ہو جاتی ہے اور شاعر چاہے باقی نہ رہے مگر اس کی صداؤں کی بازگشت صدیوں پر محیط ہوتی ہے۔

علامہ اقبالؒ ایک عظیم فنکار اور ایک مسلمہ فلسفی تھے۔ ان کی شاعری میں اپنے عصر کی چیخ بھی موجود ہے۔ ماضی کا کرب بھی ہے اور مستقبل کی ایسی پیشن گوئیاں بھی ہیں، جو فکرِ اقبال کا منطقی نتیجہ ہیں۔ اقبال اپنے دور کی تاریخ، ادب اقتصادیات، سیاسیات، قانون اور فلسفہ کو اچھی طرح جانتے تھے وہ ان فنون میں خلاقانہ عبور رکھتے تھے عصری فلسفہ میں ان کا مقام و مرتبہ بہت ممتاز تھا اس کا اعتراف آج کے فلاسفر بھی کرتے ہیں۔ اقبالؒ نے اپنی فکر کی اساس فلسفۂ خودی پر رکھی ہے، اور فلسفۂ خودی ان کے یہاں عرفانِ نفس یا عرفانِ ذات کی حیثیت سے موجود ہے۔ انہوں نے فلسفہ کو صرف شاعرانہ تخیل نہیں بنایا ہے، بلکہ اس کے ذریعے ایک مستقل نظامِ فکر و عمل کی تشکیل کی ہے، اور اس معاشرے کی پیشن گوئی کی ہے جو فلسفۂ خودی کی صداقت پر استوار کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے جو صدیوں سے انسان کی خودی کو زنگ آلود کرتے چلے آئے ہیں یا اسے کچلتے اور روندتے رہے ہیں۔ اقبالؒ نے ان پر زبردست تنقید کرتے ہوئے واشگاف لفظوں میں کہا ہے۔

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ امروز میں
آنے والے دور کی دھندلی سی ایک تصویر دیکھ

اقبالؒ ایک عبقری، نابغہ یا جینئس شاعر تھے، انہوں نے شاعری برائے شاعری نہیں کی بلکہ شاعری کو پیغمبری کے درجے تک پہنچا دیا۔ وہ دانائے راز تھے، مشرق ومغرب کے قدیم وعصری فلسفوں پر ان کو ناقدانہ عبور تھا۔ وہ مغرب کے فلسفوں پر تنقید ضرور کرتے تھے، لیکن ان کی تردید نہیں کرتے تھے، وہ مشرقی فلسفوں کے بارے میں نرم گوشہ ضرور رکھتے تھے لیکن ہمہ پہلو اس کو قبول بھی نہیں کرتے تھے۔ ان کی شاعری جہاں جذبات میں ارتعاش پیدا کرتی تھی تو وہیں حرکت وعمل پر آمادہ بھی کرتی تھی۔ ان کی شاعری میں تحریکیت تھی۔ حالات جو موجود ہیں اس کو بدل کر اس میں صحت مند انقلاب لانے کیلئے انہوں نے اپنی فارسی، اردو کی شاعری، اردو اور انگریزی کے خطبات میں جو کچھ لکھا ہے وہ غیر فانی سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا شمار دنیا کے بڑے فلاسفہ میں ہوتا ہے۔

انہوں نے جب مغرب اور مشرق کے فلسفوں کا تقابلی مطالعہ کیا اور ان کو اپنی فکرِ قرآنی کی اساس پر جانچا پرکھا تو ان کا یقین قرآن اور اس کے فلسفے پر اور گہرا ہو گیا۔ جہاں جہاں مغربی فلسفے اور قرآنی فلسفے میں بعُد اور دوری بلکہ مغائرت ملی انہوں نے کھل کر اس فلسفے پر تنقید کی اور مغربی تہذیب کو ''دوں نہاد'' تہذیب کا نام دیا اور اس کے بارے میں کھل کر پیشن گوئی کی۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دوکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

حالات ومشاہدات اور اُن سے متفرع ہونے والے تجربات جتنے تلخ اور انسانیت سوز تھے کہ ان کو دیکھ کر علامہ نے مغربی افکار و نظریات پر وہ ضرب کلیمی لگائی کہ ان کو تقریباً پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ مغرب کے نظریات کے زہریلے نتائج کو دیکھ کر انہوں نے برملا کہا۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

مغربی تہذیب وثقافت کی خونچکالی کے بارے میں علامہ اقبالؒ دانندۂ اسرار تھے۔انہوں نے بالِ جبرئیلؑ میں اس پر تنقید کر کے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ۔

شفق نہیں مغربی اُفق پر یہ جوئے خوں ہے، یہ جوئے خوں ہے
طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہیں فسانہ

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اس کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

غالباً ۱۹۰۷ء میں کہے گئے ان اشعار میں انہوں نے مغرب کی بے خدا، بلکہ خدا بیزار تہذیب ومعاشرے کے بارے میں جو کچھ کہا تھا آج مغربی تہذیب ومعاشرت کی شکست وریخت ٹوٹ اور بکھراؤ سے وہ پیشن گوئی حرف بہ حرف راست سامنے آ رہی ہے، وہ تہذیب جو خدا پرستی کی بجائے خدا سے بغاوت اور مادیت کی بنیاد پر استوار کی گئی تھی اس کا حشر آج دنیا چشمِ سر سے دیکھ رہی ہے۔ یہ کائنات، یہ آفاق کی کارگہہ شیشہ گری کسی ایسے فلسفے اور نظریئے کی بنیاد پر چلائی نہیں جاسکتی جس کے بارے میں شیشہ گر سے ہدایت نہ لی گئی ہو، خدا کی بستی تجارتی نہیں، نہ انبوہِ تاجراں ہے۔اسے تو اسی کے اصولوں پر چلایا جانا ممکن ہے جو اس کا خالق۔ مالک اور حکمراں ہے۔خدا کی یہ بستی خدا کے بتائے ہوئے اصولوں پر ٹھیک ٹھیک چلائی جاسکتی ہے۔ بے خدائی تہذیب کی ظاہری چمک دمک چاہے جتنی زیادہ نگاہوں کو خیرہ کرنے والی ہو لیکن اقبالؒ کی نظر میں اس کی حیثیت کیا ہے یہ ذیل کے اشعار میں دیکھئے۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے، چمک تہذیب حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

مغرب کے فلسفے پر اس سے بہتر تنقید اور کیا ہوسکتی ہے کہ یہ ''جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے'' ان اشعار کے پس منظر میں اقبالؔ عالم انسانیت کو آگاہ کرتے ہیں کہ روحانیت اور خدائی بنیاد پر استوار تہذیبی محل کو چھوڑ کر مغرب کے مادہ پرستانہ اور بے خدا ایوانوں میں سرگرداں مت ہونا کیونکہ۔

وہ فکر گستاخ، جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اُسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

یہ جدید مغربی افکار ونظریات ہی نہیں، تہذیب ومعاشرت کے بارے میں ایک اور حکیمانہ پیشن گوئی ہے جو ناقابل تردید سچ بن کر سامنے آ گئی ہے۔اس طرح کی شاعری شاعروں نے پہلے بھی کی ہے مگر پورا کا پورا دیوان ایک ھی نظرئے کی پابند شاعری پر اپنی ساری طاقت جھوک دی ہو ایسی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی ہے۔تصوف ان کا خاص وصف تھا۔حضرت محمد ذوقی فرماتے ہیں۔

۔۔۔تصوف چونکہ دینی روحانی، قرآنی، اور سیرۃ مطہرہ کی تقلید وسنت کی پیروی، بزرگان دین کے احوال۔اطوار مشاہدات مکاشفات پر مبنی ہے اور یہ علوم علم سینہ ہے اس لئے اس کے رموز ونکات اشارات کے ذریعے واضح کئے گئے۔

چونکہ دینی روحانی اور تلمیحات کے سہارے بڑی سے بڑی بات لوگوں کو بتا کر اپنے فن کو سرخ رو کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ الگ الگ قرآنی واقعیات کو اشارے سے اپنی شاعری میں پیش کرنے کو تلمیحات کہتے ہیں۔ اس کے اصل معنی رمز اور اشارے کے ہیں۔ اس سے شعر کی فصاحت اور بلاغت میں چار چاند لگ جاتے ہیں لمبی چوڑی بات کو صرف ایک تلمیح سے کر کے اپنی بات کو اثر انداز بنایا جا سکتا ہے۔ پہلے ہی یہ موضوع زبان زد اشعار کا اس پر تلمیح دونوں اگر ایک شعر میں استعمال کیا جائے تو سونے پر سہاگہ کا کام کر جائے گا۔ کیونکہ زبان زد اشعار کا بھی یہی کام ہے۔ جیسا میں نے لکھا ہے کہ اس کے استعمال سے بلاغت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یعنی شعر فصیح اور بلیغ کے زمرے میں آ جاتا ہے۔ پہلے میں چند اشعار آپ کی نذر کر دوں پھر اس کے بعد اس پر تفصیلی بات کروں گا۔ قرآن میں جگہ جگہ پر تلمیحات ملیں گے جن کو قاری اپنے مطالعہ میں پہلے سے جانتا اور سمجھتا ہے۔ آدم علیہ السلام کا قصہ قرآن میں درج ہے۔ آدم کی پیدائش کعبہ کی مٹی سے ہوئی۔ اس کو قائم چاند پوری نے اپنے شعر میں اس طرح باندھا ہے۔

آدم کا جسم جن کے عناصر سے مل بنا
کچھ آگ بچ گئے تھی تو عاشق کا دل بنا

اللہ نے شیطان سے چند سوالات پوچھے جیسے تم نے انکار کیوں کیا تو فرشتے نے جواب دیا...... میں اس سے یعنی آدم سے بہتر ہوں آپ نے مجھے آگ سے بنایا ہے۔ اور اسے مٹی سے...... جب شیطان نے اس کا جواب بغض اور حسد سے دیا تو اللہ نے اسے غرور تکبر حجت اور نافرمانی کی وجہ سے اپنی رحمت سے دور اور اپنی بارگاہ سے خارج کر دیا۔ سورہ الاعراف آیت نمبر ۱۳/پ ۸/اس طرح ہے اللہ نے کہا نکل جا یہاں سے تیری یہ ہستی نہیں تھی کہ یہاں رہ کر سرکشی کر سکے۔ اور دور ہو جا یقیناً ذلیل وخوار لوگوں میں تو شامل ہو گیا ہے۔ اسی رو سے ذوق دہلوی نے شعر کہا۔

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

آدم کو بنانے کے بعد اللہ نے ان کو سجدہ کرنے کے لئے کہا لیکن اس (ابلیس) نے سجدے سے انکار کیا اور وہ لعنت کے لائق ہوا۔ ابلیس بھی فرشتہ تھا مگر ایک نافرمانی کی وجہ سے وہ شیطان بن گیا۔

غالب نے اس واقعہ سے ایک شعر اس طرح کہا ہے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

اقبال ابلیس سے کہتے ہیں کہتے

کھو دئے انکار سے تو نے مقامات بلند
چشم یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو

یا پھر ذکی مہدی کہتے ہیں۔

جو ہر تھے مجھ میں سب ملکوتی خصال کے

انساں بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی

جہاں دارشاہ نے ایک شعر کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان کو مٹی سے بنایا گیا ہے اور مٹی میں ہی ملایا جائے گا یعنی جہاں کا خمیر تھا وہیں پہونچ گیا۔

آخر گل اپنی صرف میکدہ ہوئے
پہونچی وہاں ہی خاک جہاں کا خمیر ہو

یا پھر علامہ اقبال نے یہ شعر تراشا

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

لیکن اقبال نے اس پہلو سے بھی ایک نئی بات نکالی ہے

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصہ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو

موسی کا واقعہ سورہ طٰآیت ۱۰ رپ ۱۶ رمیں اس طرح ہے۔

۔پھر موسی نے بیوی سے کہا تم ٹہرو میں نے آگ دیکھی ہے شاید کوئی انگارہ تمہارے لئے لے آؤں وہاں الاؤ پر کوئی رہبر مل جائے......اور موسی پہاڑ کی طرف نکل پڑے۔دیکھا کے آگ سرسبز درخت سے چھنتی ہوئی آرہی ہے۔موسی اس کے تعاقب میں آگے کی طرف بڑھتے گئے۔اور وہاں ایک آواز آئی اس کو سورہ قصص پارہ ۲۰ رمیں اس طرح بیان کیا گیا ہے......اے موسی میں ہوں، میں سارے دنیا کا پروردگار......

نواب امیؔن الدولہ لکھنوی نواب امین الدولہ امین نے اردو کا عک زبردست شعر کہہ کر اردو شاعری کو مالا مال کردیا۔

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

اردو کے (ضرب المثل ۱۹۲)

اسی تلمیح کے سہارے اقبال اپنے شعر میں کہتے ہیں۔

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے موسی ہی نہیں

غالبؔ کہتے ہیں کہ

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

سوؔدا اس بات کا اعتراف کرتے ہیں

موسی نہیں کہ سیر کروں کوہ طور کا

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا

اقبالؔ کہتے ہیں

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

موسیٰ نے اللہ سے کوہ طور پر باتیں کی ہیں، دیکھئے ایک انسان کا رتبہ بڑھ گیا۔اللہ کو تجلی دکھانی تھی تو موسیٰ کو طور پر ایک بہانے سے بلایا۔موسیٰ کو کہاں معلوم تھا کہ

کوئی معشوق ہے اس پردہء زنگاری میں

حضرت ابراہیمؑ کے واقعات سے بھی کئی شعر بنے ہیں۔نمرود خود کو خدا کہتا تھا اور جب اسکے اور حضرت ابراہیمؑ کے بیچ مناظرہ ہوا تو آخری سوال تھا۔سورج کس کے حکم سے ڈوبتا ہے اور اگتا ہے۔تم اپنے بت سے کہو کہ وہ سورج کو مغرب سے نکال دے تو وہ لا جواب ہو گیا۔کون جلاتا ہے اور کون مارتا ہے اس کے جواب میں اس نے کہا میں بھی جلاتا ہوں اور میں بھی مارتا ہوں۔یہ بات سورہ ء بقرہ آیت نمبر ۲۵۸ پ۳ پر درج ہے۔جب ابراہیم کی قوم پر اس کا ظلم بڑھتا گیا یہاں تک کہ نمرود نے حضرت ابراہیم کو لکڑیوں کے ایک انبار کو جلا کر اسمیں ڈال دیا۔لیکن اللہ نے پہاڑ نما آگ کی تاثیر ختم کر دی۔اس کو باغ بن جانے کا حکم دیا۔

سورۃ انبیا آیت نمبر ۶۹ پ۱۷ دیکھئے۔ہم نے حکم دیا کہ آگ ابراہیم کے لئے امن سلامتی کے ساتھ ٹھنڈی ہو جا اردو شاعری میں اس ضمن میں خوب اشعار کہے گئے۔اقبال نے کہا

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ہے

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

آگ ہے اولاد ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

غالبؔ نے کہا'' ے

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی مرا بھلا نہ ہوا

یعنی آگ بھی خلیل کو نہیں چھو سکے گی، جب تک اللہ نہیں چاہے گا۔حضرت یوسف کو ان کے بھائیوں نے بیچ دیا کیونکہ وہ بہت

خوبصورت تھے انہوں نے خواب میں اللہ کی بشارت دیکھی تھی اور اس کا ذکر اپنے والد سے کیا تھا۔ اس تعلق سے بھی کئی زبان زد اشعار کہے گئے ہیں۔ کوئی تنبیہ کر رہا ہے۔

اسی خاطر تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر

حالیؔ

آرہی ہے چاہ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

سوزؔ

بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی
بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر ہوئے

آگے چل کر وزیر لکھنوی کہتے ہیں

جو خاص بندے ہیں وہ بندہء عوام نہیں
ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں

سلام کے معجزات میں حضرت عیسیٰؑ کو شفایاب کرنے کا اللہ نے خوبی دی تھی، یہ کسی معجزے سے کم نہیں تھا، سورہ مائدہ آیت ۱۰ پ ۶ میں اللہ کہتا ہے۔ ''......اور تم مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کر دیتے ہو۔ روایت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کسی اندھے یا برص کے کسی مریض پر ہاتھ پھیر دیتے تھے تو وہ ٹھیک ہو جاتا تھا۔ اسی معجزہ کو مسیحائی کہا گیا ہے اس تلمیح کا استعمال کرتے ہوئے غالب نے طنزاً دو شعر کہے ہیں۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

سودا کہتے ہیں ۔

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

یہی ناامیدی مضطر خیر آبادی کو بھی ہے۔

علاج درد دل تم سے مسیحا ہو نہیں سکتا
تم اچھا کر نہیں سکتے میں اچھا ہو نہیں سکتا

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ شوخ
یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

خضر بھولے بھٹکے کو راستہ بتانے کے بہت مشہور تھے۔ زبان زد اشعار میں کچھ اشعار ہیں۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

دوسرے ہی لمحے غالب کہتے ہیں

کیا کیا خضر سے سکندر نے
اب کسے رہنما کرے کوئی

وزیر علی صبا

کوچہء عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے
خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

سلیمان اور خضر کے لئے شاعر کھل کر کہتے ہیں

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

اس مسیحا کی مسیحائی میں کیا اعجاز
ہاتھ دل پر رکھ دیا بیمار اچھا ہو گیا

حضرت ایوب کا صبر اور حضرت یعقوب کا رونا بہت مشہور ہے۔ ان باتوں کو شاعر جانتا ہے اور اپنے شعر میں اس طرح ذکر کرتا ہے۔

ہمنے کیا کیا نہ ترے غم میں اے محبوب کیا
صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا

دیگر تلمیحات بغیر کسی تمہید کے پیش کر رہا ہوں۔ مگر یہ بات نوٹ کرتے چلیں کہ اس میں تلمیحات سے ہی استفادہ بھی کیا گیا ہے کہیں اس میں عکس ہے۔

رہے د و دو فرشتے ساتھ اب انصاف کیا ہوگا
کسی نے کچھ لکھا ہوگا کسی نے کچھ لکھا ہوگا

غافل تجھے کرتا ہے یہ گھڑیال منادی
گردون گھڑی عمر کی ایک اور گھٹادی

موت سے کس کی رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

سب ٹھاتھ پڑا رہ جائیگا جب لاد چلے گا بنجارا

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلین گے دم لے کر

نکلنا خلد سے اادم کا سنتے آ ئے تھے لیکن
بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتاہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہان چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

اگر شہر میں کئی مسجد بنادی
تو فردوس میں نیو اپنی جمادی

دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

طور تک پہونچا کوئی، کوئی عرشِ بریں تک پہونچا
جس کی پرواز جہاں تک تھی وہاں تک پہونچا

معجزہ[1] شق القمر کا ہے مدینے سے عیاں
مہہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

ہم نے کیا کیا نہ ترے غم میں اے محبوب کیا
صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا

ایک ہی خاک سے انسان ہوئے ہیں پیدا
ایک ہی خون ہے، پھر خون بہاتے کیوں ہو

❁❁❁

ا۔ کے واسطے

باب ۔ ۷

زبان زد اشعار

میں

استفادہ' سرقہ اور توارد

۷۔زبان زد شعار امیں استفادہ سرقہ اور توارد

یہ بات بھی درست ہے کہ ایک ہی طرح کے مضامین پر طبع آزمائی کے طریقے بھی ایک ہی جیسے ہوں تو ایسے اشعار کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے۔ایسا کرنے سے شاعری کا دفتر ایک ہی جگہ سمٹ کر رہ جائے گا۔قول اور قلم کے شاعر بھی سرقہ کے گنہگاروں میں ہیں۔یا پھر زبان کو آسان کرنے کے لئے مصرعے بدلتے ہیں۔غرضیکہ ہم جب اشعار پڑھتے ہیں تو ایسے شعر کی آواز بیک گراونڈ آواز کی طرح ہمارے ذہن میں گونجتی ہیں،ایک شعر ہے۔

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

اس شعر کے خالق کا نام جب میں نے پتہ لگایا تو پتہ چلا کہ اصل شعر محمد رضا برقؔ کا ہے مگر اسمیں کسی فلم اسٹار شاعر نے تبدیلی کی ہے محبوب کی فلموں کی شروعات میں مراد کی آواز میں سنائی جاتی تھی۔

اے صنم وصل کی تدبیروں سے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جومنظور خدا ہوتا ہے

اسی طرح آئے دن ہمارے مطالعے میں ایسے شعر آتے رہے جن کو آپ کے سامنے رکھ کر آپ کو بھی اس پر سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔اس تحقیق کا مقصد کسی شاعر کو نیچا دکھانا نہیں ہے کیونکہ ہر شاعر اپنے ہی دائرے میں رہ کر شعر کہتا ہے۔شعر کے اظہار میں طریقہ ان کا اپنا ہوتا ہے۔کبھی کبھی ایک ہی مفہوم کو شعر میں باندھنے میں یہ توارد ہوسکتا ہے۔پھر اگر شاعر سلیقہ مند ہوتا ہے۔تو اس پرانے مفہوم کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ شعر کو کہاں سے کہاں پہونچا دیتا ہے۔ایسے اشعار کو ہم لوگ پڑھ کر سر دھنتے ہیں۔شاعر اپنی سلاست اور فصاحت سے اقلیم سخن میں فتوحات حاصل کرتا ہے۔نئی زبان، نئے حالات کے مطابق مضمون آفرینی کرنے میں شعر خوب سے خوب تر کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔

ناسخؔ ایک مصلح زبان ہے،لیکن اس کا مرتبہ شاعری میں ویسا بلند نہیں ہے۔جیسا آتشؔ کا ہے نیازؔ فتح پوری نے ناسخؔ کو شعر کا شاعر کہا ہے۔ناسخؔ کے اشعار میں کافی ادق الفاظ ہیں۔اسمیں فارسی اور عربی کے الفاظ سموئے گئے ہیں۔انہوں نے مشکل زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔آتشؔ نے مترنم بحروں کا استعمال زیادہ کیا ہے۔اس سے قارئین کی دلچسپی بڑھ گئی ہے۔اس کے قارئین زیادہ ہیں۔کوئی شعر سلاست اور روانی میں جواب نہیں رکھتا ہے۔کسی کا انداز بیاں نکھرا اور بالکل واضح ہوتا ہے۔تو کہیں گنجلک، پر پیچ الجھا ہو یعنی ثقیل ہے،اپنے اپنے طور سے شعراء نے کوشش کی ہے۔جس سے اردو شاعری نکھری، پھولی پھلی اور صدا بہار ہوئی ہے۔آج ہماری شاعری اسی مقام پر ہے جہاں دوسری زبان کی شاعری کا پہونچنا ناممکن ہے۔یہ ہمارے شعراء متقدمیں اور شعرائے متاخرین کا ہی کمال ہے جن کے بتائے راستے پر

چل کر بعد کے شاعر نے گل بوٹے کھلا ئے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے کلام کو اولیت حاصل ہے۔ سچ کہا جائے تو اردو شاعری کے یہ نیو ہیں اسی لئے نریش کمار شاد بھی لکھتے ہیں۔ ''اس امر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کہ شاعروں کا ایک دوسرے متاثر ہونا عین فطری ہے۔ اور ارتقائی تقاضہ ہے۔ یہ ایک نا قابل تردید حقیقت ہے۔ کہ ہر دور میں ہر شاعر اپنے پیش رو اور ہم عصر شاعروں سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ یہ اثر خورہ اس نے شعوری طور پر کیا ہو یا غیر ارادی طور پر اس کی شاعری میں درآتے ہوں۔۔۔۔'' سرقہ اور توارد صفحہ نمبر ۴۴ پھر بھی اگر کہیں سرقہ (چوری) ہے تو اسے ہم نے ظاہر کر دیا ہے۔ اب اگر چوری کا مال برآمد ہوتا ہے۔ تو آپ جیسے سپاہی پتہ لگائیں یا شاعر خود ہے۔ مگر شاعر تو کہہ نہیں سکتا ہم آپ ہی سمجھائے گے کہ یہ سرقہ ہے یا توارد ہے۔ اب ایک شعر کا معاملہ تو ہے نہیں کہ اس کی کھوج کی جائے ہزاروں شعر ہیں جو اس زمرے میں آتے ہیں۔ میں نے اشارہ کر دیا ہے۔ اگر کوئی آنے والی

ابتدا ہی سے شعراء حضرات ان سے قبل کے اور ہمعصر شعراء کے کلام سے استفادہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ میؔر و غالبؔ اور اقبال نے فارسی شعراء کے اشعار سے استفادہ کیا ہے کہیں کہیں تو شعراء نے ہو بہو ترجمہ کر دیا۔ غالبؔ نے نظیؔر سے حسرتؔ نے داغؔ، غالبؔ اور مومنؔ سے ریاضؔ نے داغؔ سے اور داغؔ نے نظامؔ سے استفادہ ہے، کہیں توارد بھی ہوا۔ کہیں شعراء نے ہو بہو شعر کہہ کر سرقہ کیا ہے۔ شعر کی یکسانیت کے بارے میں ڈاکٹر عصمتؔ ملیح آبادی کہتے ہیں۔ ''شاعروں کا سلسلہ اور یکساں شعری فضا کی کہانی نئی نہیں ہے۔ ولیؔ سے والیؔ یک جتنے عہد گزرے ہیں اور جتنے اسکول وجود میں آئے ہیں سب کے یہاں یکساں نیت نظر آتی ہے۔ اسی لئے کوئی غالبؔ سے ٹکرایا ہے کوئی مومنؔ سے بڑا ہے اور کوئی ذوقؔ کے یہاں سرقہ تلاش کرتا نظر آتا ہے۔ خیالات کی یکسانیت ناگزیر ہے۔ دو سو برس کی اردو شاعری کو کنگال ڈالئے تو آپ کو چند فیصد مجد وافکار و خیالات ہی ملیں گے۔۔۔۔'' تاہم ابھی تک کے اشعار میں لاکھوں اشعار ایسے ہونگے جن کی جانب کوئی محقق اگر توجہ دے۔ تو یہ راز افشاں ہو جائے گا۔ یا پھر ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے جو ماضی کے کسی نہ شعر کی بازگشت ہونگے۔ سرقے اور توارد پر اکثر مضمون شائع ہوتے رہتے ہیں اس سے بھی چند اشعار کا پتہ چلتا ہے۔ کبھی کبھی مصرع طرح پر غزل کہنے سے بھی ایسا ہوتا ہے۔ کیوں کہ غزل کی صنف ہی ایسی ہے کبھی دانستہ اور کبھی نادانستہ یہ غلطی شعراء سے سرزد ہوتی ہے کبھی کبھی شعراء اپنی استادی دکھانے کے زعم میں بھی شعر بہ شعر کہتے ہیں سلیقہ بھی ہوتا ہے۔ تو وہ شعر دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ یعنی اظہار کی جدت بعض موضوعات کے حسن میں چار چاند لگانے کا سبب بن جاتے ہیں۔ نسل میں اس تحقیق کو آگے بڑھانا چاہتا ہے۔ تو بڑھا سکتا ہے۔ ایک بات اور بتا تا چلوں کہ میں نے وہ اشعار چنے ہیں جن میں برمحل شعر سے استفادہ سرقہ اور توارد ہوا ہے یا پھر برمحل شعر میں استفادہ، سرقہ اور توارد دیکھا گیا ہے۔ نریش کمار ساد پچاس سال قبل عام اشعار پر تحقیق کی تھی انہوں نے اردو، فارسی، اور عربی کے اشعار بھی شامل کئے ہیں۔ ان کے تقریباً ۱۲۵ صفحات میں ۴۰-۳۵ اشعار فارسی سے لئے گئے اشعار میں جو میرے کام کا نہیں ہے پھر عام اشعار پر بھی انہوں نے کام کیا ہے۔ وہ بھی میرے کام کا نہیں ہے۔ میں نے ان تقریباً ۳۰-۲۰ دوسروں کو متاثر کیا اس میں کوشش کی ہے کہ بھاری بھرکم الفاظ نہ آسکیں جو عربی اور فارسی میں بھی ادق ہیں تا کہ اس کی تشریح میں دقت ہو۔ بہت سے لوگ تضاد نہ ہو کر بھی نقاد بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ علم کا نتیجہ برا ہوتا ہے۔ یہ لکھنے والوں کی

عافیت خراب کرتے ہیں وہ کبھی کبھی وحدہٗ لاشریک بن جاتے ہیں۔ جس طرح غالب کے اشعار پیش کرنے والوں میں تضاد ہے۔ اسی طرح دوسری تشریح پیش کرنے والوں میں تضاد لازمی ہے۔ لیکن اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہے پہلی بار ڈھیر سارے اشعار ہماری نظر سے گزریں گے جنھیں ہم موازے کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں طلباء اور مدرس حضرات کو سب سے زیادہ فائدہ ملے گا۔ برمحل اشعار اوران کے ماخذ کی تحقیق کے دوران مجھے اس طرح کے شعر ملے تھے۔ میں ان تمام اشعار کو لکھتا جاتا تھا۔ آج جب اسے شائع کرنے کی بات آئی تو وہی اشعار میرے کام آئے۔ ان اشعار کو پڑھ کر دونوں طرح کے اشعار کا باہمی رشتہ میں نے بعد میں لکھا ہے۔ جو میرے ذہن میں پہلے سے محفوظ تھا۔ اسے نئے سرے سے سوچا اور پھر لکھا۔ ممکن ہے اس بات کو آپ دوسری طرح سے سوچیں۔ یا پھر آئے ذہن میں کوئی دوسری بات آئے، تو اس سلسلے میں آپ ہم سے بات کر سکتے ہیں۔ کیونکہ شعر کا حسن وقبح ایک وجدانی شئے ہے اور امور وجدانی ء میں دو رائیں ہونا تعجب نہیں۔ ان اشعار کو آپ کے سامنے پیش کرنے کا مقصد ایک ہی ہے ان میں وہ مٹھاس یا گھلاوٹ ہی نہیں جس کو پڑھنے کے بعد اردو زبان کے چٹخارے کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یہ عوام کی زبان کیسے کیسے لوگوں تک پہونچی اس کا بھی اندازہ لگتا ہے۔ کس طرح لوگ نئی نئی بولیاں بول کر عوام میں سرخرو ہوئے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ بے شمار اردو کے اشعار فلموں میں استعمال ہوئے ہیں۔ میں اس کے لئے ایک مضمون لکھنا تھا۔ اس لئے اسے دہراؤں گا نہیں لیکن کئی فلموں میں مصرعے بدل کر چربہ کیا گیا ہے۔ یا اسکا مفہوم اڑایا گیا ہے۔ چند ایسے اشعار کا ذکر کر رہا ہوں۔ کچھ اشعار میں پہلے درج کر چکا ہوں۔ قمر جلال آبادی نے فلم کہاں جا رہے ہیں۔ (۱۹۶۶) میں خواجہ مجذوب کا ثانی مصرع اڑا دیا۔

رفتہ رفتہ وہ ہمارے دل کے ارماں ہوگئے
پہلے جاں پھر جان جاں پھر جانِ جاناں ہوگئے

مصحفی

کیا چیز دل ہے ، چاہیے تو جان لیجئے
پر بات کوئی ہے جو کہوں مان لیجئے

شہریار

دل چیز کیا ہے آپ مری جان لیجئے
بس ایک بار میرا کہا مان لیجئے

❁❁❁

حاتم (۱۶۹۹-۱۷۸۳)

چمن میں کیوں نہ باندھے عندلیب اب آشیاں اپنا
کہ جانے ہے گل اپنا باغ اپنا باغباں اپنا

مظہرؔ (۱۶۹۹ - ۱۷۹۴) ء

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا

دونوں ہمعصروں میں ہم خیال مضمون اور ایک ہی طرح سے باندھا گیا ہے پہلے استادوں میں دوسروں کے اشعار سے بہتر کہنے کے لے اس طرح کے شعر کہے جاتے تھے یہ ہم قافیہ اشعار بھی ہیں۔ پھر بیسوی صدی کے استاد شاعر آثرؔ لکھنوی نے یہ مضمون باندھا۔ اور صبر کی تلقین کی ہے۔

❀❀❀

آثرؔ لکھنوی

نہ گھبراو اسیرو! پھر چمن میں آشیاں ہوگا
گل اپنے باغ اپنا اور اپنا باغباں ہوگا — میرؔ (۱۷۲۲-۱۸۱۰)

اب کر کے فراموش تو ناشاد کرو گے
پر ہم جو نہ ہوگے تو بہت یاد کروگے — سوداؔ (۱۷۲۲-۱۸۱۰)

جس اور کسی اور پہ بیداد کرو گے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے — جرات (۱۷۰۶-۱۷۸۱)

ہے کس کا جگر جس پہ یہ بیداد کروگے
لو ہم تمھیں دل دیتے ہیں کیا یاد کروگے

❀❀❀

قائمؔ (۱۷۲۲-۱۷۹۳)

گو ہم سے تم ملے نہ تو کچھ ہم نہ مر گئے
کہنے کو بات رہ گئی اور دن گزر گئے

نواب سید محمد خاں رندؔ

۱۷۹۶ء میں پیدا ہوئے انھوں نے قائمؔ کے مصرعے کو طرح بنا کر شعر کہا ؂

وعدہ پہ تم نہ آئے تو کچھ ہم نہ مر گئے
کہنے کو بات رہ گئی اور دن گزر گئے

❀❀❀

مومن (۱۷۸۸-۱۸۵۴)

کیا جانے لکھ دیا انہیں کیا اضطراب میں

قاصد کی لاش آتی ہے خط کے جواب میں

ذوقؔ (۱۷۸۸-۱۸۵۴) نے مومنؔ کا اولیٰ مصرع ہو بہو لے لیا ہے اسے ثانی مصرعے بنا دیا۔

خط پڑھ کے اور بھی وہ ہوا پیچ و تاب میں
کیا جانے لکھ دیا اسے کیا اضطراب میں

عبدالرب چاؤس (قوال) بھی اسے اپنا شعر کہا کرتے تھے۔

کیا جانے لکھ دیا تھا انہیں اضطراب میں
قاصد کی لاش آتی ہے خط کے جواب میں

تمام شہر میں رسوا ذلیل و آوارہ
تمہارے چاہنے والوں کی آبرو کیا ہے

تمام شہر میں رسوا ذلیل و آوارہ
تمہارے چاہنے والوں کی آبرو کیا ہے

یہ استفادہ ہے استفادہ کی ایک شکل پہلا مصرع تو اکبرؔ اور جلیلؔ دونوں کے ایک جیسے ہیں ثانی مصرع میں الگ الگ بات کہی گئی ہے یعنی شعر کو تھوڑا سا تبدیل کر دیا گیا ہے۔

اکبرؔ (۱۸۴۶-۱۹۲۱)

جوانی کی دعا لڑکوں کو ناحق لوگ دیتے ہیں
یہی لڑکے لٹاتے ہیں جوانی کو جواں ہو کر

جلیلؔ (۱۸۶۴-۱۹۰۱)ے

جوانی کی دعائیں مانگی جاتی تھیں لڑکپن میں
لڑکپن کے مزے اب یاد کرتے ہیں جواں ہو کر

❁❁❁

غالبؔ کا ایک شعر بڑا مشہور ہے، جو اظہار نیازمندی کی مثال ہے۔

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

اسی مفہوم کو آزادؔ انصاری ()، جو جوشؔ ملیح آبادی کے ہمعصر تھے۔ نے اپنی زبان میں یوں باندھا ہے۔

قاضی ہو شیخ ہو زاہد ہو رِند ہو

ہم دیکھتے ہیں مفت کی سب کو حلال ہے

❀❀❀

ویسے آزاد انصاری خیال اڑا رنے میں تو ماہر نہیں ہیں۔ مگر شعر میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے مفہوم بدل دیتے تھے۔

نہ پوچھو کون ہیں کیوں راہ میں نا چار بیٹھے ہیں
مسافر ہیں سفر کرنے کی ہمت ہار بیٹھے ہیں

انشا (۱۷۵۲-۱۸۱۷) کا شعر دیکھتے چلیں جو پہلے سے برمحل تھا۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
❀❀❀

میں نے اکثر ایسے شعر کا حوالہ دیا ہے جس میں کسی بات کی حامی بھر کے شعر کو ہو بہو ڈھال دیا ہے یا اسکی مخالفت کر کے شعر کہا گیا ہے۔ یعنی شعر میں کہیں مثبت پہلو ہے۔ تو کہیں منفی ہے۔

قدرت (۱۷۹۰)

ٹوٹی کمر بخت کا وہ زور رہ گیا
جب بام دو ہاتھ سے کچھ دور رہ گیا

قائم (۱۷۲۲ ۱۷۹۳)

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا
❀❀❀

محمد امان نثار (۱۷۲۲ ۱۸۱۰)

بات کہنے کا بھی جب وقت پایا ہے غریب
بھول جاتا ہوں وہ سب کچھ دیکھ صورت یار کی
❀❀❀

میر

روبرو ہوتے ہی اُس کی عقل ہو جاتی ہے گم
کچھ کا کچھ بکتا ہوں بات کر آتی نہیں
❀❀❀

یوں کہتا یوں کہتا جو یار آتا
یہ کہنے کی باتیں ہے کچھ بھی نہ کہا جاتا

امیر مینائی (۱۸۲۹ ۱۹۰۰)

یہ کہوں گا، یہ کہو ں گا، یہ ابھی کہتے ہو
سامنے ان کے بھی حضرت دل یاد رہے

❁❁❁

سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا
کہتے تھے اس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہئے میر

❁❁❁

وہ آگیا تو سامنے اس کے نہ آئی بات
دل میں کتنے منودے تھے ولے

❁❁❁

یک پیش اس کے روبرو نہ گیا
سامنے اُن کے بھی جب حضرت دل یاد رہے

فانی (۱۸۷۹ ۱۹۴۱) ے

یا کہتے تھے کچھ کہتے اُس نے کیا کہتے
تو چپ ہیں کہ کیا کہتے کھُلتی ہے زباں کو کچھ

❁❁❁

ے(۱)

باتیں تھیں دل میں کیا کیا کہنے کو تھے نہ کیا کیا
کہنے کی ہیں سب باتیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

❁❁❁

نظام رامپوری (۱۸۱۹ ۱۸۷۲) ے(۲)

تم سے کچھ کہنے کو تھا بھول گیا
ہائے کیا بات تھی کیا بھول گیا

وزیر علی صبا (-۱۸۵۷) ے

بات بھی آپ کے آگے نہ زباں سے نکلی
لیجئے آئے تھے ہم سوچ کے کیا کیا دل

خمار(۱۹۱۹-۱۹۹۹) ؎

حالِ دل کہنے بڑی شان سے آئے تھے خمار
اب جو سننے کو وہ بیٹھے ہیں تو کچھ یاد نہیں

عاشق معشوق کے غائبانے میں طرح طرح کی بات سوچتا ہے اور دل میں رکھتا ہے کہ ان کے سامنے جو آئیں گئے تو کہیں گے مگر ایسا نہیں ہوتا ہے۔اسکی زبان بند ہو جاتی ہے۔تمام بھول جاتا ہے۔

❁❁❁

تُرابؔ علی قلندر(۱۷۶۸-۱۸۵۸)

ہارنے رخت ہیں بہت یار مصیبت کم ہیں
سکھ کے سب ساتھی دُکھ کا تو نہیں رفیق

برے وقت کا کوئی ساتھی نہیں اس بات کو مختلف شاعروں نے اپنے اپنے ڈھنگ سے کہا ہے وعنبر یہ اشعار بالکل ایک جیسے ہیں۔

برے وقت کا کوئی ساتھی نہیں اس بات کو مختلف شاعروں نے اپنے اپنے ڈھنگ سے کہا ہے وعنبر یہ اشعار بالکل ایک جیسے ہیں۔

جراتؔ(۱۷۴۸ ۱۸۰۹) ؎ نہ ہمدم ہے ناسخؔ(۱۷۷-۱۸۳۸)

کسی کا کب کوئی روز سیر میں ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

انسان کے برے وقت میں کوئی ساتھ نہیں دیتا اسطرح جیسے سایہ بھی تاریکی میں ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔آنکھوں کی پتلیاں بھی پھر جاتی ہیں۔جب زندگی اس کا ساتھ چھوڑ دیتی جس طرح تکلیفمیں لوگ آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔

دردؔ(۱۷۲۰ ۱۷۸۵)

آنکھیں بھی ہائے نزع میں اپنی بدل گئیں
سچ ہے کہ بیکسی میں کوئی آشنا نہیں

امیرؔ(۱۸۲۹-۱۹۰۰)

پتلیاں تک بھی تو پھر جاتی ہیں دیکھو دم نزع
وقت پڑتا ہے تو سب آنکھ چرا جاتے ہیں

❁❁❁

؎

کون ہوتا ہے برے وقت میں حالت کا شریک
مرتے وقت آنکھ کی پتلی بھی تو پھر جاتی ہے

اور ایسی حالت میں جب ہم تکلیف کے دور سے گزر رہے ہوں تو ہمدردی کے دو جملے بھی اسے خراب لگتے ہیں۔

❁❁❁

انشاؔ (۱۷۵۲-۱۸۱۷)

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں

حسرت موہانیؔ (۱۸۷۸-۱۹۰۱)

چھیڑ ناحق نہ اے نسیم بہار
سیر گل کا یہاں کسے ہے دماغ

❁❁❁

امیرؔ (۱۸۲۹-۱۹۰۰)۔

جو چاہے سو مانگتے اللہ سے امیرؔ
اس در پہ آبرو نہیں جاتی سوال ہے

اکبرؔ (۱۸۴۶-۱۹۲۱)۔

خدا سے مانگ جو کچھ مانگتا ہے اے اکبرؔ
یہی وہ در ہے کہ ذلّت نہیں سوال کے بعد

❁❁❁

مضطرؔ خیرآبادی (۱۸۶۵-۱۹۲۷) شاعری میں کہنے کا انداز اور اسلوب اگر تیکھا ہو تو پڑھنے کا لطف کچھ اور ہوتا ہے۔

تمہیں چاہوں تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہو
میرا دل پھیر دو مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا

جلیلؔ (۱۸۶۴-۱۹۴۶)۔

مشکل ہے تیرے ساتھ رقیبوں کو بھی چاہوں
عالم کی سمائی تو مرے دل میں نہیں ہے

❁❁❁

اکبرؔ (۱۸۴۶ ۱۹۲۱)۔

محبت کا تم کو ثر کیا کہوں
نظر مل گئی دل دھڑ کنے لگا

جگرؔ (۱۸۹۰-۱۹۶۰)

دھڑکنے لگا دل نظر جھک گئی
کبھی ان سے جب سامنا ہو گیا

❀❀❀

معراج فیض آبادی (-۲۰۱۳) کا مشہور شعر ہے

گھر سے نکلو تو پتہ جیب میں لےکر نکلو
حادثہ چہرے کی پہچان مٹا دیتے ہے

عرفان پربھنوی نے اس شعر کا چربہ کیا نیچے کے دونوں اشعار ہندوستان کے لئے نہیں کہے گئے ہیں۔ اتنے حالات تو خراب نہیں ہیں معراؔج کی بات آج کے زمانے کے لئے درست ہے۔ مگر مبالغہ آرائی سے شعر کی روح قبض ہو جاتی ہے۔ حالانکہ شاعری تخیل کی پرواز ہوتی ہے۔ لیکن پرواز کی بھی حد ہو ورنہ شعر مضحکہ خیز بن جاتا ہے۔ مظہر امام نے یہ شعر کشمیر کو دیکھ کر کہا ہوگا کیونکہ وہ وہاں برسوں رہ چکے ہیں۔

عرفان پربھنوی

گھر سے نکلوتو دعا مانگ کے نکلو ورنہ
لوٹ آنے کا نہیں اپنے بھروسہ کوئی

مظہر امام ()

جاتے ہو تو بچوں کو بھی ساتھ اپنے لئے جا
جب لوٹ کے آؤ گے تو یہ گھر نہ ملے گا

❀❀❀

خدا جانے کل تم کہاں ہم کہاں
غنیمت جان لو مل بیٹھنے کو

❀❀❀

حفیظؔ جونپوری (۱۸۶۷-۱۹۴۵)

آج مل بیٹھنا غنیمت جان
زندگی کا کچھ اعتبار نہیں

اشرفؔ مُرشدآبادی

آ بیٹھو تو دو باتیں کریں تم سے میاں ہم
پھر دیکھئے اک دم میں کہاں تم ہو کہاں ہم
❁❁❁

سنتو کھ رائے بیتاب () قائم کے شاگرد نے کہا تھا۔

نہ رہے باغ جہاں میں کبھی آرام سے ہم
پھنس گئے قید قفس میں جو چھٹے دام سے ہم

امید امٹھوی داغ کے دونوں شاگردوں نے ہم مضمون ہے۔

جس طرح گزری ہے، کل آج بھی کٹ جائیگی
اور جو آرام کی پوچھو تو نہ کل ہی تھا نہ آج
❁❁❁

محمود رامپوری (۱۹۳۴)۔

لپٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے
الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے

ریاض خیر آبادی (۱۸۵۳-۱۹۳۸)۔

کیا مزہ دیتی ہے بجلی کی چمک مجھ کو ریاض
مجھ سے لپٹے ہیں مرے نام سے ڈرنے والے

بجلی جب کڑکتی ہے تو محبوبہ بلا جھجک محبوب سے لپٹ جاتی ہے اور موقع غنیمت ہے محمود رامپوری ایسی حالت کو کچھ دن تک رہنے کی خواہش کرتے ہیں۔ ریاض نے بھی وہی بات کہی ہے۔ جو ریاض کے نام سے ڈرتے تھے ایسی حالت میں ان سے لپٹے ہوئے ہیں۔

داغ کا مہذبانہ انداز بھی پڑھتے چلیں میرے خیال میں محبوبہ بجلی کی چمک سے نہیں بجلی کی گرج سے ڈرتی ہے۔ دو مصرعے ایک جیسے ہیں غالباً یہ مصرع طرح ہے۔

داغ

ڈرنا کسی کا اور وہ بجلی کا کوندنا
موسم بہت پسند ہے برسات کا مجھے
❁❁❁

غالب (۱۷۹۷-۱۸۶۹)

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے نام ونگ ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

بہلا نہ دل، نہ تیرگی شام غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

❁❁❁

کلیم عاجزؔ (۱۹۲۶-۲۰۱۵) کا یہ شعر زیادہ مشہور نہیں ہوا

بات چاہے بے سلیقہ ہو کلیمؔ
بات کہنے کا سلیقہ چاہئے

مگر وسیمؔ بریلوی (۱۹۴۰-بقید حیات) نے اس مفہوم کو زبان دے دی اور عوام میں بھی مشہور ہو گیا۔

کون سی بات کہاں کیسی کہی جاتی ہے
یہ سلیقہ ہو تو ہر بات سنی جاتی ہے

❁❁❁

جلالؔ لکھنوی (۱۸۳۱ ۱۹۰۹)

جسنے کچھ احساں کیا، اک بوجھ ہم پر رکھ دیا
سر سے تنکا کیا اٹھایا، سر پہ چھپّر رکھ دیا

جلیلؔ (۱۸۴۶ ۱۹۴۶) ے

سچ ہے احساں کا بھی بوجھ بہت ہوتا ہے
چار پھولوں سے دبی جاتی ہے تربت میری

چھوٹے احسان کا بھی بوجھ بہت ہوتا ہے اس لئے بھی احسان سے بچ کے جینے کا مشورہ شاعر نے دیا ہے چار پھولوں سے بھی قبر دبی جاتی ہے یہ ایک اشارہ ہے۔

❁❁❁

بیخودؔ دہلوی (۱۸۵۶-)

نہ دیکھنا کبھی آئینہ بھول کر دیکھو
تمہارے حسن کا پیدا جواب کر دیگا

ذاکر دہلوی () ے

ہم نہ کہتے تھے، نہ دیکھو آئینہ، یہ کیا ہوا

کس لئے شُشدر رہوئے ، کیوں تم کوسکتہ ہوگیا

❁❁❁

غالبؔ نے کہا

ہرایک بات پہ کہتے ہوتم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

آج کے شاعر نے مفہوم اڑا لیا ۔

محفل میں تیری آکے بے آبرو ہوئے
پہلے تھے آپ،آپ سے تم تم سے تو ہوئے

❁❁❁

میرؔ نے محتاجی کی ایک مثال دی

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ انہیں تاج وتخت کا

ریاض (۱۸۵۳-۱۹۳۸) اسی بات کو اس طرح کہا ہے

عبرت کی ہے جگہ جنہیں کل تک عروج تھا
محتاج آج حیف وہ گور کفن کے ہیں

میر نے اس طرح کے کئی شعر کہے ہیں۔

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

❁❁❁

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کو کا سر پر غرور تھا

❁❁❁

غریبی کے اظہار کا ایک اور شعر دیکھتے چلیں ۔مگر یہ شعر اپنے آپ میں لا جواب ہے شاید اس مفہوم کا شعر کسی نے نہیں کہا ہے۔ یہ سچا شعر ہے اکثر لوگوں کے پاس اتنا بھی پیسہ نہیں رہتا ہے کہ اس سے کفن خریدا جا سکے چونکہ یہ کام دنیا والے کر دیتے ہیں اس لئے لوگوں کو اس کی فکر نہیں رہتی ۔مگر قیصرؔ کے حساس ذہن اور انانیت کی داد دینی پڑ ی گی ۔

کافر ہوں گر سہارا کفن کا بھی ہو ہمیں

مرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں اب مفلسی سے ہم　　　　قیصر دہلوی()

اردو شاعری میں اُسے ایک اضافہ کیا جا سکتا ہے آپ نے دیکھا یہ شعر کہاں سے کہاں پہونچ گیا اکثر شعراء کہتے ہیں کہ کہاں سے مفہوم لائیں استادوں اور شاعروں نے سبھی مفہوم باندھ دئے ہیں۔

نظاؔم نے اسی لئے کہا تھا۔

وہ بات کون سی ہے جواب ان کو میں لکھوں
مضمون وہ کون سا ہے جو پہلے لکھا نہیں

❁❁❁

ذوقؔ نے کہا

وقت پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

داغؔ

ہوا زمانہ میری عذاب میں داخل
جواں تھے، تو جوانی تھی خواب میں داخل

اکبرؔ(۱۸۴۶-۱۹۲۱) نے کہا ؎

ہو کے مقروض مغاں کی ترک ہم نے میکشی
تنگدستی کا بھلا ہو، پارسا ہونے لگے

ارشد گورگانی نے کہا ؎

اجی شیخ جی زر سے ہے میکشی
جو مفلس ہوا پارسا ہوگیا

❁❁❁

تنگدستی میں میکشی بھی چھوٹ جاتی ہے۔ پہلے شعر میں تو لفظوں کا ہیر پھیر ہے۔ دوسرے میں تو وہ بھی فرق نہیں ہے۔ شعریت بھی نہیں ہے۔ ہاں مفہوم ایک ہے، مگر سچی بات ہے۔

بہادر شاہ ظفرؔ نے کہا تھا ؎

مگر نہیں صورت دکھاتے بھیجو وتصویر ہی
خیر اسی کو ہجر میں پیش نظر رکھیں گے ہم

مگر گستاخ رام پوری (۱۸۲۲-؟) غصّے میں کہتے ہیں، حاکم تھے اس لئے یہ غصّہ واجب بھی ہے۔

آپکے کہنے سے ناصح پھینک دوں تصویر یار
اور دل کو دوں تسلی آپ کا سر دیکھ کر

اور رفعتؔ اپنے شعر میں بتاتے ہیں کہ اس تصویر کا کیا ہوگا۔

ہوتے رہتے ہیں پہروں راز و نیاز
رکھ کے تصویر روبرو تیری

❁❁❁

حامد حسین قادری صاحب، جلیلؔ کے شعر کا چربہ کیا ہے۔ جلیل کا شعر اور حامد حسین قادری کا شعر تہہ خانے میں رہ گیا برمحل ہوگیا۔

بادل کا رنگ دیکھ کے نیت بدل گئی
پینے سے کر چکا تھا میں توبہ مگر جلیل

❁❁❁

رندؔ

میکشوں سے ترکِ سے ممکن نہیں بتسات میں
پانی بھر آتا ہے مُنہ میں ابر بارعاں دیکھ کر

ہزاروں بار توبہ کی ہے میں بادہ نوشی سے
مگر بدلی کے آتے ہی بدل جاتی ہے نیت بھی

❁❁❁

انشاؔ نے کہا تھا۔

جذب دل اپنا سلامت ہے تو انشااللہ
کچے دھاگے سے چلے آئنگے سرکار بندھے

قویؔ امروہوی (۱۸۸۱-۱۹۲۵)

اب جذب دل اپنا محبت کا دکھاوں کا تماشہ
کھنچکر نہ چلے آوٴ تو کچھ بات نہیں ہے

مفتوںؔ دہلوی

اے جذبہء دل آج کشش اپنی دکھادے

آ جائیں وہ دل تھامے ہوئے خود مرے گھر میں

❀❀❀

قبالؔ

میں جو سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
تیرا دل ابھی ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

جوشؔ کو اپنی شاعری پر بڑا گھمنڈ تھا علامہ اقبالؔ کی مشہور غزل کو سامنے رکھ کر انہوں نے شعر کہے ہیں مگر علامہ اقبالؔ کے سامنے ان کا چراغ نہیں جل سکا۔

اقبالؔ

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تیری جبیں نیاز میں

❀❀❀

جوشؔ

جو صنم کدوں میں بیاں کروں تو صنم بھی سجدوں میں گر پڑیں
وہ ملا ہے پچھلے پہر مزا میرے دل کو جوش نماز میں

❀❀❀

غالبؔ کے بہت سے اشعار سے بیخود موہانیؔ نے استفادہ کیا ہے۔ پرانے وقتوں میں شعراء کے شعر پر کہہ کر اپنی عزت بڑھاتے تھے۔آہستہ آہستہ یہ عیب ہوتا گیا۔

غالبؔ ؎

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

بیخودؔ (۱۸۵۶-۱۹۵۵) ؎

جب ناز عشق حسن کے قابل نہیں رہا
پھر وہ کچھ اور ہی ہے مرا دل نہیں رہا

❀❀❀

حفیظ

حفیظ ٹھن گئی جب شکست توبہ کی
کاگ بوتل کا اڑ گیا دن سے

رت بدلتے ہی بدل جاتی ہے نیت
میری جب بہار آتی ہے توبہ شکنی ہوتی ہے

جوشؔ (۱۸۹۸-۱۹۸۲)

تیرے سنگ در نے بدل دیا ہے یہ پستوں کو فراز میں
کہ ہزار وطور جھک رہے ہیں مری جبیں نیاز میں

❀❀❀

لوگ کہتے ہیں ہچکیوں کی وجہ کسی کا یاد آنا ہوتا ہے۔ مختلف شاعروں اپنے اپنے طور سے اس مفہوم کو باندھا ہے۔

فراق دہلوی (۱۷۶۰-۱۸۳۰)

آنا یہ ہچکیوں کا مجھے بے سبب نہیں
بھولے سے اُسنے یاد کیا ہو عجب نہیں

کسی شاعر نے اسی مفہوم کو یوں باندھا۔

ہچکیاں آتی ہیں کیوں اے دل ناشاد مجھے
شاید اس شوخ نے بھولے سے کیا یاد مجھے

ان اشعار سے فائدہ اٹھایا گیا

ہچکی بھی کوئی آکے تسلی نہیں دیتی
کچھ ایسی بھلا بیٹھی ہمیں یاد کسی کی

❀❀❀

طعن وتشنیع کے ایک مفہوم کے کئی اشعار کہے گئے ہونگے۔ جس رات محبوب نہ آئے اور رات ان کے بغیر کاٹی گئی تو کیا سحر نہیں ہوئی۔ سحر ہوئی مگر رات تکلیف سے گزری۔ اس میں کڑھن ہے۔

قوی امروہوی

شب فراق یہ فرمائے بسر نہ ہوئی
جو رات آپ نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

مگر عام بول چال میں استعمال ہونے والا شعر

تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی
ہاں مگر چین سے بسر نہ ہوئی

❁❁❁

سودؔا(۱۷۰۶-۱۷۸۱) نے کہا تھا

آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا
کچھ آگ بچ رہی تھی کہ عاشق کا دل بنا

ان کے ہمعصر بقا() نے اسی مفہوم کو یوں باندھا ہے۔ بقاؔ نے سودا کو نیچا دکھانے کے لئے بہت سی حرکتیں کی ہیں۔ یہ شعر بھی اسی زمرے کا لگتا ہے۔

کعبہ تو سنگ و خشت سے اے شیخ مل بنا
کچھ سنگ بچ رہا تھا تو عاشق کا دل بنا

مصرعے اولی کو کسی استاد زماں نے یوں کر کے شعر کو عام لوگوں میں مشہور کر دیا۔

تعمیر خانہ کعبہ کی جب ہو چکی تمام

❁❁❁

بیخود دہلوی نے کہا

دوست دشمن پہ کچھ نہیں موقوف
اک زمانہ ہے اپنے مطلب کا

❁❁❁

زہرہؔ لکھنوی

اپنے مطلب کے آشنا سب ہیں
آشنا کون آشنا کا ہے

پہلے دغا دینے والوں کو دشمن کہا جاتا تھا مگر اب دوست ہی دغا دیتے ہیں۔ ہم نے اپنے زمانے میں دوستی کی اور خوب نباہی مگر وہ دوست ہی دشمن بن گئے۔ اور ایسے ایسے کام کئے جو دشمن بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ اصل میں دوست ہمارے ساتھ رہ کر ہماری شہہ رگ سے واقف ہو جاتا ہے۔ اس لئے دشمنی اس کے لئے آسان ہو جاتی ہے۔ دوستی کا کوئی دوسرا نام دینے کے لئے شاعر مشورہ دیتا ہے۔

آؤ تعلقات کو کچھ اور نام دیں
یہ دوستی کا نام تو بد نام ہو گیا

✿✿✿

تم تو غیروں کی بات کرتے ہو
ہم نے اپنے بھی آزمائے ہیں

رشک، حامد علی

اے رشک مصیبت میں کوئی نہیں اپنا
اپنا نہیں جب اپنا بیگا نے کو کیا کہیے
✿✿✿

دوستوں سے وفا کی امید
کس زمانے کی بات کرتے ہو

عابدؔ کرہانی (-حیات)

تھا شور کہ دشمن پیئے یلغار نکل آئے
دیکھا تو ہمارے ہی کئی یار نکل آئے
✿✿✿

غیروں کو کیا پڑی ہے کہ سوا کریں ہمیں
ان سازشوں میں ہاتھ کسی آشنا کا ہے
✿✿✿

فکر بجنوری

قتل اپنا اپنے ہی احباب کے ہاتھوں ہوا
کام ہی اتنا بڑا تھا غیر کر پاتے بھی کیوں
✿✿✿

میرؔ

رہی نگفتہ مرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

اقبال

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری
✿✿✿

حزیںؔ

دنیا کے عیش وعشرت اے یار کم نہ ہوں گے
چرچے یہی رہیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے

ترقیؔ میر سوز کے مشہور شاعر

دنیا کے جو مزے ہیں ہرگز وہ کم نہ ہوں گے
چرچے یہی رہیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے

قائم

کیا کیا عدم ہم پر ظلم وستم نہ ہونگے
جذبے یہی رہیں گے اور ہائے ہم نہ ہونگے

مذکورہ اشعار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شکیلؔ بدایونی کا یہ شعر

یہ زندگی کے میلے دنیا میں کم نہ ہوں گے
افسوس ہم نے ہونگے افسوس ہم نہ ہوں گے

۲/اپریل/۱۹۷۰ء کو جب شکیل بدایونی موے ہوئی یوان کی یدفین کے لئے ممبئی کے باندرہ قبرستان میں لوگوں کا ایک ہجوم جارہا تھا۔ادھر آل انڈیا ریڈیو سے شکیل کا نغمہ سنایا جارہا تھا۔اورلوگوں کو احساس ہورہا تھا کہ موت آئے گی یعنہ دنیا میں نہیں رہیں گے لیکن دنیا رونق رہے گئی۔

دنیا کے عش وعشرت برقرار اور قائم رہیں گے۔لیکن ہماری عمر ہمارا ساتھ نہیں دیگی۔دنیا روز بروز نکھرتی جائے گی۔اسی لے تو اسیر لکھنوی (۱۸۰۵-) نے کہا تھا۔

خُدا جانے یہ کس کی جلوہٗ گاہ ناز ہے دنیا
ہزاروں اٹھ گئے کثرت وہی باقی ہے محفل کی

دوسرے مصرع میں تصرف کیا گیا ہے اور اس طرح بھی پڑھا جاتا ہے۔

ہزاروں اٹھ گئے پھر بھی وہی رونق ہے مجلس کی

❁❁❁

میرؔ

کیا کہو کچھ کہا نہیں جاتا

چپ رہوں تو رہا نہیں جاتا

قائمؔ

درد دل کچھ کہا نہیں جاتا
آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

سوزشؔ کا یہ شعر

جان تجھ بن رہا نہیں جاتا
آہ کچھ بھی سہا نہیں جاتا

❁❁❁

احمدی غلام احمد

وہ کون سا عقدہ ہے کہ وا ہو نہیں سکتا
کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

چکبستؔ

کمال بزدلی ہے پست ہونا اپنی نظروں میں
اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا

فیضؔ

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
چاندنی دل دکھاتی رہی رات بھر

مخدومؔ

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
چشم نم مسکراتی رہی رات بھر

❁❁❁

زندگی تکلیف میں ہے تو شاعر کے مطابق اس کی لمبی عمر کی دُعا نہ مانگی جائے۔

مظفرؔ خیر آبادی

مصیبت اور لمبی زندگانی

بزرگوں کی دعا نے مار ڈالا

چند دہائی قبل تک کے شاعر گوپال متل نے اسی بات کو اس انداز سے کہا کہ وہ برمحل ہو گیا۔

گوپال متلؔ (۱۹۰۹-۱۹۹۳)

مجھے زندگی کی دعا دینے والے
ہنسی آرہی ہے تیری سادگی پر

❁❁❁

میر کا ایک غیر معروف شعر جو اُن کے کے زمانے تک نیا لگتا ہو گا مگر اب نہیں

ہزاروں سجدے کئے آپ نے خلوص کے ساتھ
جناب، شیخ، مگر ختم خود سری ہی نہ کی

اس مفہوم کو ذوقؔ نے مشہور کر دیا۔ یہ شعر تلمیح کا ہے۔ اللہ تعالٰی نے شیطان کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کو کہا تو اسنے انکار کیا۔ حالانکہ کے لاکھوں برس شیطان نے اللہ کو سجدہ کیا ہو گا مگر ایک نافرمانی کی سزا میں سجدے رائیگاں ہو گئے۔ شعر کا اصلی حسن اظہار بیان ہے۔ بڑے شعراء کے ہر ایک شعر کے موازنے میں یکسانیت دیکھنے کے بعد نریش کمار شاد کہتے ہیں۔ ''ان شعراء کرام میں سے کسی پر یہ الزام عائد کرنا آسان نہیں ہے کہ اس نے دوسرے شاعر کا سرقہ کیا ہے۔ حالانکہ مذکورہ مثالوں سے کافی حد تک یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہر دور میں ہر شاعر اپنے پیش رو اور ہم عصر شاعروں سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ یہ اثرات خواہ اس نے شعوری طور پر اپنائے ہوں یا غیر ارادی طور پر اس کی شاعوری میں در آئے ہوں''

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

حفیظؔ جونپوری (۱۸۶۵-۱۹۱۸) کا بہت مشہور شعر ہے۔

حسینوں سے فقط صاحب سلامت دور کی اچھی
نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی

اسی شعر کو وحشت کلکتوی (۱۸۱۸-۱۹۵۶) نے بھی اس طرح کہا۔ ثانی مصرع تو مصرع طرح بن گیا ہے۔ اور شعر مشہور بھی نہیں ہے۔ حفیظ سے کمتر درجے کا شعر ہے۔

نہ الفت دوستوں سے ہے نہ دشمن سے عداوت ہے
نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی

میرؔ درد (۱۷۲۰-۱۷۸۵) کے اس شعر کو الگ طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن شعر میں ہے

شیخ کعبہ ہو کے پہنچا ہم کنشت دل میں ہو
دونوں منزل ایک تھی گل راہ ہی کا پھیر تھا

جوہرؔ (۱۸۷۸-۱۹۳۱) جو ان کے بعد کے شاعر ہیں انہوں نے کہا

کعبہ میں بھی وہی ہے شوالہ میں بھی وہی
دونوں مکان اس کے ہیں چاہے جدھر رہے وہ

دردؔ کا ایک شعر تھا۔

جتنی بڑھتی ہے اتنی گھٹتی ہے
زندگی آپ ہی آپ کٹتی ہے

عمر بڑھتی نہیں گھٹتی ہے اِس موضوع کو محمد قدرت اللہ شوقؔ نے ایک نئے انداز سے لوگوں کو سنایا جو عام بول چال میں مشہور ہو گیا۔

غافل تجھے کرتا ہے یہ گھڑیال منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹادی

افسوس لوگ اپنی عمر کے کم ہونے پر خوشیاں مناتے ہیں۔حیدرؔ بخش حیدر نے دلّی کالج میں ملازمت کی اور کافی کتابوں کا ترجمہ کیا قصہ لیلیٰ مجنوں ان کی تصنیف ہے یہ امیر خسرو کی مثنوی لیلیٰ مجنوں کا آزاد ترجمہ ہے۔ان کا ایک شعر ہے۔

برابری کا تیری گل نے جب خیال کیا
صبا نے مارا طمانچہ منہ اس کا لال کیا

مصحفی (-۱۸۲۴)

دعویٰ کیا تھا گل نے کل اس سے رنگ و بو کا
ماری صبا نے دھولیں شبنم سے منہ پہ تھوکا

لیکن اس سے قبل میرؔ اور سوداؔ نے اس مفہوم کا شعر باندھا تھا۔

چمن میں گل نے جو کل دعویٰ جمال کیا
جمال یار نے منہ اس کا خوب لال کیا

اسی کو گھما پھرا کر دو تعین شاعروں نے شعر کہے ہیں۔

مصحفیؔ کا ایک اچھا شعر۔

ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا

جونؔ ایلیا نے اسی خیال کو یوں باندھا ہے۔

فسانہ ساز جس کا فراق و وصال
شاید وہ میرا خواب تھا شاید خیال تھا

❁❁❁

میرؔ نے کہا تھا

مت سَہل ہمیں سمجھ پہنچے تھے بہم تب ہم
برسوں تئیں گردوں نے جب خاک کو چھانا ہے

اس شعر سے بہتر میرؔ نے ہی کہا جو اس طرح مشہور ہے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردوں سے انسان نکلتے ہیں

میر نے تعلّیٰ کا شعر کیا ہے۔ برسوں کی تگ و دو کے بعد میر نے جو اشعار کہے ہیں اس کی وجہ سے انہیں لازوال بنا دیا ہے۔ آنے والے دور میں بھی میرؔ کی پیروی کی جائے گی۔

❁❁❁

تسلیمؔ نے کہا

آہ نے اتنی تو کی تاثیر پیدا شکر ہے
بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا

اپنے استاد کا حسرت نے چربہ کیا

بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا
اب تو اظہار محبت بر ملا ہونے لگا

❁❁❁

میرؔ

پھر اس کی شان کریمی کے حوصلے دیکھے
گناہ گار یہ کہہ دے گناہ گار ہوں میں

❁❁❁

داغؔ نے کہا

اس شان رحیمی نے بہت زور دکھایا
جس وقت جھکی چشم گنہ گارِ ذر اسی

عزیزلکھنوی (۱۸۸۲-۱۹۳۵)

دیں ابر کرم نے ترے دامن کی ہوائیں
جب غرق عرق اپنے گنہ گار کو دیکھا

❁❁❁

آقبال

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

اسیر

بخشا مجھے خالق نے فرشتوں سے یہ کہہ کر
جرم اُس نے کیے ہیں مجھے غفار سمجھ کر

❁❁❁

سائل (۱۸٦۷-۱۹۴۵) نے کہا

یہ مسجد ہے یہ میخانہ تعجب اس پہ ہوتا ہے
جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

غالب نے کہا تھا

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم کہاں

داغ نے اسی مفہوم کو

میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت ادھر کہاں

❁❁❁

ولی

باعث رسوائی عالم ولی
مفلسی ہے مفلسی ہے مفلسی

اسی مفہوم کو ولؔی نے پھر باندھا اور یہ مشہور ہوا

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

ولی کے اس مفہوم کو شعرا آج اسی انداز کو پسند کر رہے ہیں۔

❀❀❀

عشق کی شروعات (symtum) کو سب سے پہلے میرؔ نے کہا

ہم طور عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن
سینے میں کوئی جیسے دل کو ملا کرے ہے

شاعر یہ سمجھتا ہے کہ وہ تو انسان ہے اس سے تو خطا ہوگئی ہی۔ گناہ تو آدم نے بھی کئے تھے۔ گناہ گاروں نے گناہ تو کئے لیکن معاف کرنے والا وہ ہے بڑے سے بڑا گناہ معاف کر دیتا ہے گناہ گار کو فخر ہے کہ اللہ غفور الرحیم ہے۔ اس ضمن میں شاعروں کی شوخی بھی قابل ذکر ہے۔ کوئی شاعر کہتا تم نے گناہ کیوں نہ کئے کیا خُدا رحیم نہیں تھا اللہ ہر چیز پر قابض ہے۔ سب کچھ اس کی مرضی سے ہوتا ہے۔ پھر جب میں نے گناہ کئے تو انہوں نے روکا کیوں نہیں کچھ شعر کے اشعار اس ضمن میں پڑھے جا سکتے ہے۔

سوداؔ

عشق سے تو نہیں ہوں میں واقف
دل کو شعلہ سا کچھ لپٹا ہے

مرے عدم دوست میرے سینے کی دھڑکن تو دیکھنا
وہ چیز تو نہیں ہے محبت جسے کہیں

یہ شعر حالؔی (۱۸۳۷-۱۹۱۴) کے شعر کی کاپی ہے

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

❀❀❀

ایک ہی دور کے دو شاعر ایک مفہوم داغؔ

زاہد مری خاطر سے مسلمان سمجھ کر
دل توڑ نہ تو پی لے مرے یار ذر اسی

حفیظؔ جونپوری

پی لو دو گھونٹ کہ ساقی کی ہے بات حفیظؔ
صاف انکار سے خاطر شکنی ہوتی ہے

محمد اویس لکھنوی

کیا جرم کیا ہم نے تھوڑی سی لگائی ہے
نفرت نہیں کرتے ہم انگور کے دانے سے

اور اکبر الٰہ آبادی کہتے

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے
ڈاکہ تو نہیں ڈالا چوری تو نہیں کی ہے

❁❁❁

حسرت موہانی نے ایک خوبصورت شعر کہا

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی! ترک الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں

پاکستان کے ایک شاعر مرتضٰی برلاس نے اس شعر سے استفادہ کیا ہے

وہ بچھڑ کے اور بھی شدت سے یاد آنے لگا
میں نے جس کو کھو دیا دل نے اسے کھویا نہیں

❁❁❁

میرؔ نے کہا تھا

کون کہتا ہے نہ غیروں پہ تم امداد کرو
ہم فراموش ہووں کو بھی کبھی یاد کرو

غالبؔ

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم وراہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

بیخود دہلوی

وہ مجھے بھول گئے اور یہاں ہے یہ حال
ہر گھڑی سامنے آنکھوں کے ہے ان کی صورت

ان دنوں انکار میں بھی التجا ہے، بے بسی ہے۔ حالانکہ غیروں سے تعلق کے بعد اس ملنا کسی کو گوارا نہیں کیونکہ شاعر کو غیروں پر کرم کرتے دیکھا نہیں جاتا ہے

٭٭٭

لالہ مادھورام جوہرؔ (۱۸۸۰-۱۹۳۶) کے اس شعر کا عکس دیکھیں۔

سنا کے حال دل زار کر دیا مغرور
بیان تم سے نہ کرنی تھی آرزو مجھ کو

اب حسرت موہانی ()

حسن بے پروا کو خود بین وخودآرا کر دیا
کیا کیا میں نے جو اظہار تمنا کر دیا

میرؔ نے کہا تھا

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

لالہ مادھورام جوہر

تجھ سا کوئی جہان میں نازک بدن کہاں
یہ پنکھڑی سی ہونٹھ یہ گل سا بدن کہاں

٭٭٭

جوہر محبت کو چھپائے لاکھ کوئی چھپ نہیں سکتی
یہ وہ افسانہ ہے جو بے کہے مشہور ہوتا ہے

کہاوت ہے کہ عشق اور مشک دونوں چھپائے نہیں چھپتا بہزادؔ اور شکیلؔ نے ایک ہی مفہوم کو الگ الگ ڈھنگ سے باندھا ہے۔

بہزاد لکھنوی

اے دیکھنے والو مجھے ہنس ہنس کے نہ دیکھو
تم کو بھی محبت کہیں مجھ سا نہ بنادے

شکیلؔ (۱۹۱۲-۱۹۷۰)

ظالم مری اداسی رخ پر نہ مسکرا
تجھ کو بھی اس حال مقام پہ آنا ہے ایک دن

❁❁❁

عشق میں یہی حال ہوتا ہے۔ بہزاد کا یہ شعر بہت مشہور ہو گیا اور ہونا بھی چاہئے تھا۔ شکیل کا یہ شعر پھُسپھُسا ہے۔

انشآء

رکھتے ہیں کہیں پاؤں تو پڑتے ہیں کہیں اور
ساقی تو ذرا ہاتھ تو لے تھام ہمارا

سودآ

کیفیت چشم اس کی تجھے یاد ہے سودآ
ساغر کو میرے ہاتھ لے لیا تو چلا میں

عدمؔ کا چربہ

ساقی تجھے اک تھوڑی سے تکلیف تو ہوگی
ساغر کو ذرا تھام میں کچھ سوچ رہا ہوں

❁❁❁

صدیق احمد بے نظیرؔ (۱۸۶۳-۱۹۳۲)

وہی اب جان کے دشمن بنے ہیں
بگاڑی سب سے خیال دوستی ہیں

غالب نے کہا

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ بے ننگ ونام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

❁❁❁

شوقؔ ۱۸۶۰ ۱۹۲۸

اترا کے آئینہ میں چڑھاتے تھے اپنا منہ
دیکھا مجھے تو جھینپ گے منہ چھپالیا

نظام نے اس مفہوم میں جان ڈال دیا میری نظر میں نظام ادا بندی کے معاملے کے بادشاہ ہیں اس شعر کی پوری غزل ادا بندی کی بہترین مثال ہے۔ ایہ غزل آپ بھی پڑھ لیں۔

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ

دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ

تصویر سے جی بہلانے کی بات
دل نہیں بھرتا ہمارا آپ کی تصویر سے
مانگ لیں گے ہم کسی دن آپ کو تقدیر سے

اسی بات کو ایک دوسرے شاعر نے کہا

دل ان سے گفتگو کے لئے بے قرار ہے
یارب تو جان ڈال دے تصویر یار میں

❁❁❁

اصغؔر

نیاز عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظ ناداں
ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھ دی

سیماب (۱۸۸۰-۱۹۵۱)

خلوصِ دل سے جو سجدہ ہوا اس سجدے کا کیا کہنا
وہیں کعبہ سرک آیا جبیں ہم نے جہاں رکھ دی

❁❁❁

اٹھی جو نقاب آپ کے چہرے سے میں یہ سمجھا
خورشید نے دامان سحر چاک کیا ہے

ماؔہر القادری

نقاب رخ اٹھایا جارہا ہے
وہ نکلی دھوپ سایہ جا رہا ہے

❁❁❁

شوق سندیلوی نے اپنا ایک شعر مختلف استادوں کو اصلاح کے لئے بھیجا وہ شعر تھا

سادگی میں یہ کہاں لطف خلش دل کو
خط بھی وہ خط ہے اگر شوخی تحریر نہ ہو

خط کے شوخی تحریر کو مختلف استاد شعرا نے اپنے اپنے طور سے شعر میں تبدیل کیا ہے۔ جو پڑھنے کے لائق ہے

ریاضؔ

سادگی میں یہ کہاں لطف خلش دل کو
خط کوئی خط ہے اگر شوخیِ تحریر نہ ہو نصیب

سائلؔ

سادگی میں ہے کہاں لطف خلش سمجھ تو
دل نہ بے چین ہو گر شوخیِ تحریر نہ ہو

شادؔ عظیم آبادی

سچ ہے بے لطف وہ فقرے وہ عبارت پھیکی
کچھ بھی نامہ میں اگر شوخیِ تحریر نہ ہو

✿✿✿

تصرف

کیا ہے تقریر نہ ہو کچھ بھی اگر حل کا کلام
کیا ہے تحریر اگر شوخیِ تحریر نہ ہو

بیخودؔ دہلوی

سادگی میں بھی ہو لطف خلش دل کو نصیب
ان کا خط ہے نہ سہی شوخیِ تحریر نہ ہو

✿✿✿

اخگرؔ

اللہ رے بتوں کی تلون مزاجیاں
ہاں ہاں گھڑی میں ہے تو گھڑی میں نہیں نہیں

امیرؔ

نو عمر ہیں ابھی سے تلون مزاجیاں
غصے کا اعتبار ہے ان کے نہ پیار کا

✿✿✿

مومنؔ

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

جگرؔ

وہ ہمارے قریب ہوتے ہیں
جب ہمارا پتہ نہیں ہوتا

❁❁❁

میرؔ کا ایک شعر ہے جس میں حسن کو چار دن کا کہا گیا ہے۔

حسن اے رشک مہہ نہیں رہتا
چار دن کی ہے چاندنی یہ بھی

منیرؔ نے اسے وضاحت کے ساتھ اس مصرے میں بیان کیا ہے۔

چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے
دروازہ پہ انتظار کرنے والی بات ہے

سیمابؔ کے ایک شعر کو ظفرؔ کے نام سے پڑھا جاتا ہے۔

عمر دراز مانگ کے لائی تھی چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

زندگی چار دن کی مانگ کے لائی تھی مظفر شکوہ نے سرقہ کیا ہے۔

تھے چار دن جو زندگی مستعار میں
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

❁❁❁

سائمؔ نقوی

شاید وہ آجائے شب کو پچھلے پہر
گھر کے سارے دروازے تم دیکھو کھول کے سونا

کسی شاعر نے کہا

تم نے کہا تھا لوٹ کر ہم آئیں گے ضرور
بیٹھے ہیں اس در پہ آج تلک انتظار میں

❁❁❁

میرؔ

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

آتسی الدنی بھی اس راز کو پا نہیں سکے صرف اتنا جان گئے کہ خاک میں پروانہ مل گیا

آسی

یہ کچھ نہیں کھلا کہ جلی شمع کس لئے
اتنا سنا کہ خاک میں پروانہ مل گیا

نظام الملک

دل تڑپے ہے اور دیدہ تکے راہ کسی کی
یارب نہ کو دل کو لگے چاہ کسی کی

گنا بیگم

جس طرح لگی دل کو مرے چاہ کوئی
اس طرح نہ لگیو مرے اللہ کسی کی

❁❁❁

کانٹوں کی پرورش میں پھول کھلتا ہے کانٹے پھول کی حفاظت کرتے ہیں دو شاعر الگ الگ ڈھنگ سے اس بات کو کہتے ہیں۔کانٹوں کی اہمیت بتاتے بتا ہوئے۔

بسمل سعیدی (۱۹۰۱-۱۹۷۶) کی نزاکت کو دیکھئے۔

ہم نے کانٹوں کو بھی نرمی سے چھوا ہے اکثر
لوگ بے درد ہیں پھولوں کو مسل دیتے ہیں

❁❁❁

اردو شاعری میں مجنوں ولیلے، شیریں وفرہاد، ہیر رانجھا کے واقعات فرضی ہوتے ہوئے بھی بے حد مقبول ہیں۔

میرؔ نے کہا تھا

میرے سنگ مزار پر فرہاد
رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد

پھر غافل نے کہا

آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی مری جا مرے بعد

فرہاد اور مجنوں محبت کرنے والوں کا ایک آخری نام ہے اور شعراء نے الگ الگ طریقے سے مجنوں کی محبت کو نیچا دیکھانے کی

بات کی ہے۔ذوقؔ اپنے آپ کو مجنوں کا استاد کہتے ہیں۔

میں وہ مجنوں ہوں کہ مجنوں بھی ہمیشہ خط میں
قبلہ و کعبہ لکھا کرتا تھا القاب مجھے

آبروؔ کہتے ہیں کہ

قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو
دیکھ لینا مجھے تم ،موسم گل آنے دو

ایک شاعر کہتا ہے

ہم پیروی قیس نہ فرہاد کریں گے
اک طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

آتشؔ کا شعر

افسوس کہ فرہاد کو پہلے ہی نہ سوجھی
سر توڑ کے مر جائے اس کوہکنی سے

ایسا لگتا ہے اس شعر کو سامنے رکھ کر یہ شعر کہا گیا ہے۔

قیس تو دشت میں پھرتا رہا دیوانہ تھا
اس کو لیلیٰ کے ہی دروازے پہ مر جانا تھا

آزردہ تو مانتے ہی نہیں کہ مجنوں بڑا تھا۔

آزردہؔ

تحقیق ہو تو جانوں کہ میں کیا ہوں قیس کیا
لکھا ہوا یوں تو سبھی کچھ کتاب میں

قیس اپنے زمانے میں بڑا ہوگا میں اس زمانے میں ہوں

اکبرؔ

قیس کا ذکر مری شان جنوں کے آگے
اگلے وقتوں کا کوئی بادیہ پیما ہوگا

قفس تو قفس ہے چاہے جیسے بھی اس کا ذکر کیا جائے۔مگر شعراء بھی تو کچھ کم نہیں ہیں بات میں بات پیدا کرنی بھی تو شاعر کا کمال

ہے۔ میرؔ نے اپنے ایک شعر میں کہا تھا

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

پھر کیا تھا شراب کا خمار معشوق کی آنکھوں میں ہے شعراء نے الگ الگ انداز سے کہا۔

جگرؔ

اس چشم مے فروش سے کوئی نہ بچ سکا
سب کو بقدر حوصلہ دل سرور تھا

جگرؔ

یہی صبا یہی ساغر یہی پیمانہ ہے
چشم مخمور میں گل زار ہے میخانے کا

عدمؔ

کوئی سوگیا ہے کوئی سو رہا ہے
تیری آنکھوں کا تذکرہ ہو رہا ہے

عدمؔ

شرابیں نیند میں ڈوبی ہوئی ہیں
خمار ہم خوابی توبہ توبہ

❁❁❁

پرانے وقتوں میں تم یا، تو سے مخاطب کرنا بدتمیزی جانا جاتا تھا غالب کو اپنی محبوبہ کی یہ حرکت پسند نہیں آئی جب اس نے تم سے تو کہا۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

یا پھر غالب ہی نے کہا

محفل میں تیری آ کے یہ بے آبرو ہوئے
پہلے تھے آپ آپ سے تم تم سے تو ہوئے

داغؔ نے اس مشہور شعر کو یوں باندھا

رنج کی جب گفتگو ہونے لگی
آپ سے تم تم سے تو ہونے لگی

ایک ہی شاعر کے دو اشعار مے کشی کے لطف کی ایک ہی بات

❁❁❁

داغؔ

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں لے

پوچھئے میکشوں سے لطف ِ شراب
یہ مزا پاکباز کیا جانیں

حفیظ جونپوری ()

پی کر دو گھونٹ دیکھ زاہد
خدا نے دی ہے تجھے لاکھ خوبیاں واعظ

لے کیف گنگوہی

مگر یہ عیب ہے تجھ میں کہ بادہ خوار نہیں
کیا تجھ سے کہوں شراب کیا ہے

❁❁❁

حیرت الہٰ آبادیؔ کا یہ شعر

پہنچائے اب خدا ہمیں آئے جہاں سے ہم
عاجز ہیں اس زمین سے اس آسماں سے ہم

صباؔ کا اس سے ملتا جلتا شعر جو اسی زمین میں ہے۔

نکلیں کہیں احاطۂ وہم وگماں سے ہم
باز آئے اس زمین سے اس آسماں سے ہم

اوران سب پر ناسخؔ کا یہ شعر ہے۔

یہ زمین ہے بے وفا، یہ آسماں بے مہر ہے

جی میں ہے اِک اب نیا عالم کریں ایجاد ہم

❁❁❁

میر درد کے اس شعر کا چرچہ ہے

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

حسرتؔ

کون سی شئے کہ جس میں نہیں جلوہ تیرا
ہم کو تو نظر آتا ہے جِدھر دیکھتے ہیں

❁❁❁

ذیل میں پنڈت گوری شنکر بلبلؔ اور آشفتہ دونوں نے ایک ہی شعر کہے ہیں۔ ہمیں تو 'آشفتہ' کا شعر لگتا ہے۔ شاعروں نے حسن و عشق کی پابندیوں اور اس کی اسیری کی داستان بیان کر کے شاعری کو پر لطف تو کر دیا ہے۔ جو ظاہراً بڑا تو لطف کا باعث بنا اور اندرون سے حالات کی ترجمانی رہی۔

بچتا نہیں ہے جو کہ ہے بیمار عشق کا
یارب نہ ہو کسی کو یہ آزار عشق کا

اور غالبؔ نے ثانی مصرعے میں صاف صاف کہہ دیا۔ ؎ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

عشق ایک عذاب ہے شاعر نے اپنے اپنے طور سے شعر میں باندھا ہے ؎

میرؔ

جن جِن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے
کثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

قائمؔ

مر جائیے کسی سے پر الفت نہ کیجئے
جی دیجئے تو دیجئے پر دل نہ دیجئے

بے تابؔ

خدا کسی کو گرفتار زلف کا نہ کرے
نصیب میں کسی کافر کے یہ بلا نہ کرے

مومنؔ

قہر ہے موت ہے بلا ہے عشق
سچ تو یہ ہے بری بلا ہے عشق

خان آرزوؔ

عجب دل بے کسی پہ اپنی تو ہر وقت روتا ہے
نہ کرغم اے دیوانے عشق میں ایسا ہی ہوتا ہے

ذوقؔ

معلوم جو ہوتا ہمیں انجامِ محبت
لیتے نہ کبھی بھول کے ہم نامِ محبت

جگرؔ

اللہ اللہ عشق کی رعنائیاں
حسن خود لینے لگا انگڑائیاں

❁❁❁

غالبؔ اور حالی دونوں استاد شاگرد کے اشعار میں یکسانیت

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

حالیؔ

ہوا رکتے رکتے دم آخر فنا
مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہوگیا

غالبؔ نے ہی کہا تھا

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

محسن نقوی نے غالب کی بات پر یقین کرکے یہ شعر کہا

اسی خیال میں گزری ہے شام درد اکثر
کہ درد حد سے بڑھے گا تو مسکرا دوں گا

❁❁❁

داغؔ

مری آہ کا تم اثر دیکھنا
وہ آئیں گے تھامے جگر دیکھنا

ستمؔ کرہلوی (۱۹۵۴-۸۹۰)

تھامے ہوئے جگر کو چلے آئیں اسطرف
اتنی تو اپنی آہ میں تاثر چاہئے

❁❁❁

کوثرؔ نیازی

رنجش اپنی جگہ ، ہاتھ ملاؤ تو سہی
یہ کیا رسم زمانہ ہے نبھاؤ تو سہی

نداؔ فاضلی

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجئے رشتہ
دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہئے

بشیر بدر()

دشمنی لاکھ سہی پھر بھی نبھاتے رہتے
دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہتے

لیکن کچھ شاعر تو بالکل خلاف ہیں انہیں تعجب ہوتا ہے کہ دشمنوں سے کسے ہاتھ ملایا جائے

معصومؔ انصاری

حد بھی ہوتی ہے کوئی مصلحت اندیشی کی
دل نہیں ملتا تو پھر ہاتھ ملاتے کیوں ہوں

'یا پھر محبوب راہی (بقید حیات)

دشمنی کرنی ہی پڑ جائے تو کھل کر کی جائے
یعنی دشمن ہے تو دشمن ہو ریا کار نہ ہو

❁❁❁

میر وزیر صبا کا ایک شعر ہے۔ بڑا مشہور ہے۔

دل میں اِک درد اٹھا آنکھ میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

مولانا آزاد نے اپنی ایک طویل غزل میں اس شعر کا چربہ یوں کیا ہے۔ شاعری کے میدان میں بھی مولانا بہت شریف تھے۔ اس لئے ہوسکتا ہے ان کے توارد ہوا ہو

بیٹھے بیٹھے یا الٰہی یاد کس کی آ گئی
آنکھ میں آنسو بھرے ہیں درد کچھ کچھ دل میں ہے

❀❀❀

علامہ اقبال نے بھی اپنے ایک ہی خیال کو مختلف اشعار میں مختلف طریقوں سے باندھا ہے یہ کسی کے کہے ہوئے ہوتے تو اسے اشعار کو سرقہ کا شعر کہا جاتا ہے۔سجدہ صرف اللہ کے سامنے کیا جاتا ہے۔غیر اللہ کا سجدہ جائز نہیں ہے،

وہی سجدہ ہے لائق احترام
کہ جس سے ہو ہر سجدہ تجھ پر حرام

دوسری جگہ

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہیں
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یا پھر فانؔی نے کہا

جھک گیا تیرے آستاں پہ جو سر
پھر کسی آستاں پہ خم نہ ہوا

ماہر اہوالولیا نے کہا

یہی ہے زندگی اپنی یہی ہے بندگی اپنی
کہ ان کا نام آیا اور گردن جھک گئی اپنی

علامہ اقبال خود کہتے ہیں

بندہ وصاحب ومحتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

اللہ کے دربار میں اس طرح بندگی کرنی چاہئے

اقبالؔ

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود وایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

❀❀❀

مگر ایسا نہیں ہے آج لوگ عبادت میں ریاکاری کر رہے ہیں۔وہ مسلمان ہو کر نماز نہیں پڑھتے ہیں۔یہ ایک رسم ہے اس کو نبھا

رہے ہیں۔ادھر دو الگ الگ شاعروں کا ایک ہی خیال ہے وہ طنزاً کہتے ہیں۔

دلؔ

میں خلاف دیر و حرم نہیں مگر اپنا دلؔ یہ خیال ہے
نہ خلوص سے جہاں سر جھکا وہاں سجدہ کرنا حرام ہے

خمارؔ

مجھے تو اس کی عبادت پہ رحم آتا ہے
جبیں کے ساتھ جو سجدہ میں دل جھکا نہ سکے

شفیقؔ

جس بندگی کے ساتھ دل بھی تو جھکے زاہد
کہ خاک سر جھکا دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا

یعنی شادابؔ کے مطابق سجدہ نماز میں دل سے ہو تو نماز ہوتی ہے ورنہ یہ بے فائدہ ہے۔سجدہ ریز ہونے کی ایک رسم ادا ہوتی ہے۔

دل بھی جھکنا چاہئے سجدے میں سر کے ساتھ
دل کہیں اور سر کہیں یہ بندگی اچھی نہیں

جھکے ہوئے ہیں وہی مصلحت کے قدموں میں
وہ سر جو وقف رہے تیری بندگی کے لئے

یہ خیالات علامہ اقبالؔ سے ملتے جلتے ہیں۔

جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

یا پھر شکیل بدایونی نے ذرا کچھ ہٹ کے اپنا خیال پیش کیا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ شکیل کی آواز دب گئی

وہی ایک سجدہ ہے کارگر جو ہو فکر و ہوش سے ماورا
وہ ہزار سجدے فضول ہیں جو رہن لغزش پا نہیں

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

حافظ کرناٹکی کہتے ہیں۔

سجدے میں سر دل میں دنیا کا خیال
اسی دھرتی پہ بھاری ہیں نمازیں اپنی

کسی شاعر نے صاف صاف کہہ دیا ہے۔

نیت باندھے صف میں کھڑے سب اپنے اپنے خیال میں
امام مسجد سے کوئی پوچھے کن کو نماز پڑھا رہا ہے

❀❀❀

غالبؔ نے کہا

دنیا میں کہنے کو سبھی کہلاتے ہیں بھلے
پر ہے وہی بھلا جو کسی کا بھلا کرے

اس کے بعد علامہ اقبال نے کہا۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

☆

ظہیرؔ قدسی نے اس کی پیروڈی کی۔

شاعر ہیں وہی جہاں میں اچھے
سنتے ہیں جو شعر دوسروں کے

حالؔی نے کہا

یہی ہے عبادت یہی دین وایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

❀❀❀

جگؔر کا مشورہ نریش کمار شاؔد کا مشورہ دیکھتے چلیں۔

جگؔر

طولِ غمِ حیات سے گبھرا نہ اے جگؔر
ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہیں

غالب اور اقبال کے اشعار میں کوئی خاص خوبی نہیں ہے مگر اسی مفہوم کا ذکر حالؔی نے کیا اور خیال کو برمحل بنا دیا۔

جگؔر نے اپنی ہی بات کو دہرایا ہے۔

آدمی کے پاس سب کچھ ہے مگر
ایک تنہا آدمیت ہی نہیں

❀❀❀

ہر چند کائنات دو عالم میں اے جگؔر

انسان ہی ایک چیز ہے انساں مگر کہاں

اور غالبؔ نے تو یہ کہہ دیا تھا

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

☆

قائم چاند پوریؔ نے دل ٹوٹنے کی بات اس طرح کہی ہے۔

ٹوٹا جو کعبہ کونسی یہ جائے غم ہے شیخ
کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

ظفرؔ نے اس کی وضاحت کی بات ایک ہے۔

دل جو ہوتا ہے شکستہ پھر وہ بنتا ہی نہیں
ٹوٹ کر مسجد ظفرؔ تعمیر ہوسکتی تو ہے

❁❁❁

مضطرؔ خیر آبادی کا ایک شعر

مرے گناہ بڑے ہیں کہ تیری رحمت ہے
میرے کریم بتادے ذرا حساب کر کے مجھے

شکیل بدایونیؔ کا استفادہ

گن تو لیتے ہیں انگلیوں پہ گناہ
رحمتوں کا حساب کون کرے

لیکن جو بے باکی مضطرؔ کے شعر میں ہے وہ شکیل کے شعر میں نہیں آسکا پھر بھی غنیمت ہے۔

❁❁❁

ذوقؔ کا ایک مشہور شعر

باقی ہے شیخ کو ابھی حسرت گناہ کی
کالا کرے گا منہ بھی جو داڑھی سیاہ کی

کسی نے مفہوم چرایا۔

شیخ کی داڑھی یہ اب تو روز لگتا ہے خضاب
اب خدا ہی جانے کیا سوجھی ہے اس مکار کو

❁❁❁

نسخہ ہے لا جواب ہمارے خضاب کا

داڑھی کے ساتھ منہ بھی ہو کالا جناب کا

بوڑھا آدمی جب کالا خضاب لگا تا ہے تو اس کی نیت پر شک ہو جا تا ہے۔ اکبر نے ایک سادہ شعر کہا۔

اک زمانے میں یہ خواہش تھی کہ جانیں ہم
اب یہ رونا ہے کہ کیوں اس قدر جانے گئے

اسی بات کو موجودہ دور کے کسی شاعر نے کہا ہر زمانے کا یہ سچا شعر ہے جب شاعر چھوٹا ہوتا ہے تو اس کے دل میں تمنا رہتی ہے کہ اسے لوگ جانیں اور وہ جب مشہور ہو جا تا ہے تو اس کا چین چھین جا تا ہے۔ نیند بھی اسکی اپنی نہیں رہتی ہے۔

گمنام زندگی تھی تو کتنا سکون تھا
شہرت ملی تو نیند بھی اپنی نہیں

نظیرؔ نے کہا تھا۔

اس مہر پر انوار سے شبنم کی طرح ہم
گم ہوتے گئے ہم کو وہ جوں جوں نظر آیا

اسی خیال کو غالب نے چربہ کہا ہے۔

غالبؔ

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

چندر ایسے اشعار جن میں ایسا لگتا ہے کہ غالب کے شعر کا ماخذ ہی نظیر کا شعر ہو۔

نظیرؔ

حاضر جوابی دیکھ کہ لب سے مرے ہنوز
نکلا نہیں سوال کہ وہاں ہوگیا جواب

غالبؔ

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

نظیرؔ

یار دیکھ اس کو لگے رکھنے عداوت مجھ سے
دوست بھی ہو گئے دشمن مرے اے وائے نصیب

غالبؔ

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
ہو گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

مجذوبؔ

چھوڑ مینا و جام کی باتیں
اب ہوں پیری میں کام کی باتیں

دن کی باتوں کا اب یہ وقت نہیں
شام ہے اب ہوں شام کی باتیں

❁❁❁

جوانی کی بدنامی کے بارے میں

جوانی آدمی کی مایہ الزام ہوتی ہے
نگاہ نیک بھی اس عمر میں بدنام ہوتی ہے

اکبرؔ

جوانی کی دعا لڑکوں کو ناحق لوگ دیتے ہیں
یہی لڑکے مٹاتے ہیں جوانی کو جواں ہوکر

❁❁❁

جرات کے دو شاگردوں میں دیکھیں صادق علی خان صادق عاشق اپنے معشوق کی یہ بات برداشت نہیں کرتا ہے کہ وہ دشمن سے ملے یا دشمن کی بات اس کے سامنے کرے۔اس موضوع پر بہترے اشعار کہے گئے ہیں ان سبھوں میں یکسانیت ہے۔

رنگینؔ

غیر کا نام جو تم پیار سے لیتے ہو تو بس
ایک برچھی ہے کہ پہلو میں ہو تو بس

قائم

روبرو میرے غیر سے تو ملے
یہ ستم تو سہا نہیں جاتا

غیر کے ہوتے ہمیں گھر میں بلایا نہ کرو
دل جلے جو ہوں اُنھیں اور جلایا نہ کرو

گنگا پرشاد رندؔ کشمیری پنڈت تھا یہ جراتؔ کا شاگرد تھا اس کا ایک شعر

آپ غیروں کے ساتھ یوں ہردم ہنسا بولا کریں

اور ہم لوٹا کریں تڑپا کریں، رویا کریں

میاں عبدالرحیم زیبا

پھر آپ نے غیروں سے ملاقات نکالی
اچھا یہ نئی چھیڑ مرے ساتھ نکالی

ذیل کا یہ شعر رند نے اپنے استاد کے شعر سے ملتا جلتا کہا ہے۔اور اس کا اثر کیا ہے۔

اے ستم ایجاد کب تک یہ ستم دیکھا کریں
تو کرے غیروں سے باتیں اور ہم دیکھا کریں

❀❀❀

ایک بہت مشہور شعر تھا۔

ایک بار ہی جینے کی سزا کیوں نہیں دیتے
گر حرف غلط ہوں تو مٹا کیوں نہیں دیتے

مینا قاضی نے بھی شعر کہا

گر جرم محبت ہے سزا کیوں نہیں دیتے
مجرم ہوں تو سولی پہ چڑھا کیوں نہیں دیتے

اب کس نے پہلے کہا ابھی تک مجھے پتہ نہیں چل سکا

❀❀❀

پھولوں کی عزت پر شعر کہے گئے ہیں تو کانٹوں کی بھی اہمیت بتائی گئی ہے۔

ظفر مرادآبادی

پھولوں کو تو خوب سر پہ چڑھاتا ہے زمانہ
ہے کوئی جو کانٹوں کو گلے سے بھی لگا لے

کانٹوں کو حقارت کی نظر سے تو نہ دیکھو
یہ بھی تو کسی پھول کے سائے میں پلے ہیں

جگر نے کہا

کانٹوں کا بھی حق ہے کچھ آخر
کون چھڑائے اپنا دامن

محشر جالنوی کانٹوں کو سجانے کی بات کی

سب تو گلدان کو پھولوں سے سجاتے ہیں

ہم نے گلدان کو کانٹوں سے سجا رکھا ہے

کیونکہ نشتر واجدی کہتے ہیں

خار بھی ہوتے ہیں گلشن میں شریک
صرف گل سے گلستاں ہوتا نہیں

❁❁❁

ہم نے پھولوں کو چھوا مرجھا کے کانٹے ہو گئے
تم نے کانٹوں پہ قدم رکھا گلستاں کر دیا

کانٹوں سے دل لگاؤ تا عمر ساتھ دیں
پھولوں کا کیا کہ سانس کی گرمی نہ سہہ سکیں

یہ شعر ظفر مراد آبادی کے ساتھ پڑھا تھا مگر میرے پوچھنے پر انہوں نے انکار کیا ہے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا۔

دنیا میں آدمی کو مصیبت کہاں نہیں
وہ کون سی زمیں ہے جہاں آسماں نہیں

ندا فاضلی

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا

میر حسن کا شعر

کسی پاس دولت یہ رہتی نہیں
سدا ناؤ کاغذ کی چلتی نہیں

فتح علی عاشق

ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں
ناؤ کاغذ کی کبھی چلتی نہیں

ایک شعر مضطر خیر آبادی کا ہے۔

زندگی میں دو ہی گھڑیاں مجھ پہ گذری ہیں کٹھن
اک ترے آنے سے پہلے اک ترے جانے کے بعد

میری تحقیق کے مطابق مذکورہ شعر وحید کا نکلا مگر حال میں ایک نوٹ سے یہ ثابت ہوا کہ مضطر خیر آبادی کا ہے جس کا غیر مطبوعہ کلیات مضطر کے پوتے جاوید اختر کے پاس ہے

انجم انصاری نے اسکا سرقہ کیا ہے

دو ہی ساعتیں مجھ پر بار گزری ہیں انجم
ایک ان کے آنے کی ایک ان کے جانے کی

❀❀❀

ایک دور کے دوشعرا کے اشعار مشہور شعر

تم نے کہا تھا لوٹ کر ہم آئیں گے ضرور
بیٹھے ہیں در پہ آج تلک انتظار میں

اور چربہ

بیٹھا ہوں اس اُمید پہ اس رہ گزار پر
کے آئے اس طرف تجھے شاید خُدا مجھے

اس سے ملتا جلتا شعر ہے۔

تھا بہت دشوار میرا قتل دشمن کے لئے
بھائی کی سازش نے اس مشکل کو آساں کر دیا

یا پھر اسی مفہوم کو اتک خوبصورت انداز کے ساتھ

میں اپنی تباہی کی تاریخ لکھوں کیسے
غیروں کی بھی سازش ہے تیار بھی حوالہ ہے

غالبؔ کا ایک شعر

وہ آئے عیادت کو میری لو اور سنو
آج ہی خوبی تو دیر سے بیمار کا حال اچھا ہے

پھر آج کے کسی کا ایک شعر

زندگی بھر پوچھا نہیں میرا احوال
آخری وقت میں آیا ہے عیادت کا خیال

❀❀❀

جگرؔ نے کہا تھا

اک لفظ محبت کا اتنا ہی فسانہ ہے

سمٹے تو دل عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

خمارؔ نے کہا

محبت بھی کیا شئے ہے اللہ جانے
ہیں جتنی زبا ں ہیں اتنے فسانے

❀❀❀

بال بھی بال سے باریک بھی
کیا کمر ہے کم کمر یار کی ایسی تیسی

اکبرالہٰ آبادی

مغرب نے خوردبین سے کمران کی دیک لی
مشرق کی شاعری کا مزا کر کرا ہوا

❀❀❀

ایک مشہور شعر ہے

ذرا بھولے سے وہ میرے جنازے تک جو آنکلا
نمازی اسقدر بھولے کہ اک تکبیر کم کردی

میں نے ماضی کے ایک دوست مولانا انوار احمد مظہری سے یہ شعر سنا تھا۔ جو اپنے آپ میں بہترین شعر ہے انہوں نے مجھے اس کے شاعر کا پتہ لگانے کے لئے کہا تھا۔ اشعار پڑھتے پڑھتے دس سال سے زیادہ عرصہ بیت گیا مگر اس شعر کا کہیں بھی حوالہ تک نہیں ملا۔ تذکرہ رامپور پڑھنے کے دوران مولوی عبدالقادر خاں غمگین رامپوری (۱۷۸۰-۱۸۴۳) کے شعر میں اس طرح ملا پہلے مصرعے میں تصرف ہے۔

یہ ہے قسمت کی خوبی دیکھا اسے میرے جنازے پر
نمازی یاں تلک بہکے کے اک تکبیر کم کر دی

آتشؔ کا شعر

ہوگئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں
اس لئے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا

ناسخؔ کا دوسرا شعر

نکلتا ہے جو گل زر بکف گلزار عالم میں
خدا جائے زمیں میں دفن یہ کیسا خزانہ ہے

میر ضیاء کا شعر جس میں نازک خیالی کی انتہا ہے۔

آہستہ پاؤں رکھیوائے بوئے گل زمیں پر
سوتے ہیں اس زمیں میں نازک دماغ کتنے

اور اب اسیر لکھنوی کا یہ شعر

عشاق کی قبروں پہ نہ یوں ناز سے چلیے
سوتے ہوئے مکینوں کو جگا نا نہیں اچھا

❁❁❁

ایک ہی دور کے دو شاعر نے ایک ہی مفہوم پر طبع آزمائی کر کے اپنی اپنی بے خودی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

جوش (۱۸۹۸-۱۹۸۲)

مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

آسی لکھنوی (۱۸۹۳-۱۹۶۸)

اپنی حالت کا خود احساس نہیں ہے مجھ کو
میں نے اوروں سے سنا ہے کہ پریشان ہوں میں

دو اشعار ایک ہی موضوع پر شاعر کے نام سے میں آشنا نہیں ہوں

کیا ہے پیار جسے ہم نے زندگی کی طرح
وہ آشنا بھی ملا ہم سے اجنبی کی طرح

دیکھ کر جو ہمیں چپ چاپ گزر جاتا ہے
کبھی اس شخص کو ہم پیار کیا کرتے تھے

❁❁❁

برمحل اشعار کو سامنے رکھ کر بھی کئی شعر کہے گئے ہیں۔ یہ ہو بہو شعر ہے۔ لیکن بات وہ بن نہیں پائی جو اصل شعر میں ہے۔ صرف تسلی کے لئے شاعر شراب کا سامنے رکھنے کی بات دیکھئے۔

غالب

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

تسلیم

خالی سہی بلا سے تسلّی تو دل کو ہو
رہنے دو سامنے ابھی ساغر شراب کا
✿✿✿

داغ

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستا ں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

ریاض

ہندوستا ں میں دھوم ہے کس کی زباں کی
وہ کون ہے ریاض کو جو جانتا نہیں

چونکہ غالب اور داغ کے مذکورہ شعر بہت مشہور تھے اس کئے بھی اس موضوع یا اس انداز کے دوسرے اشعار مقبول نہیں ہو سکے۔ ریاض کے شعر میں صرف چند لفظ ادھر سے اُدھر کر دئے ہیں۔ بات تو وہی ہے کہنے کا ڈھنگ بھی اتنا متاثر نہیں کرتا ہے۔شاید اسی وجہ سے عوام میں مقبول نہیں ہوسکا اسی لئے تو داغ زبان کو عام بول چال کی زبان کہتے ہیں۔غازیپور کے ایک شاعر مولوی غلام حسین شہید کا ایک شعر۔

رہنے دے زمیں پر مجھے آرام یہی ہے
میں نقش کفِ پا ہوں مرا کام یہی ہے

مجذوب

ہم خاک نشینوں کو نہ مسند پہ بٹھاؤ
یہ عشق کی توہین ہے اعزاز نہیں ہے
✿✿✿

حفیظ میرٹھی نے کہا تھا۔

اک کھل کے کہو بات تو کچھ بات بنے گئی
یہ دورِ اشارات و کنایات نہں ہے

حسن نعیم

جو بھی کہنا ہے کہو صاف ، شکایت ہی سہی
ان اشارات ع کنایات سے جی ڈرتا
ہے

اشارات و کنایات سے باتوں میں الہام پیدا ہوتا ہے۔اسرار کھل نہیں پاتے کہنے والے کا مقصد و منشا کیا ہے۔ یہ معلوم نہیں ہوتا ۔اس سے سننے والے الجھن محسوس کرتے ہیں۔اس لئے ان دونوں حضرات کی خواہش ہے کہ بات کھل کے کی جائے کوئی بات چھپائی نہیں جائے شاعر اگر ملزم ہے تو اس کا فیصلے میں دیر نہ کی جائے۔منصف کے بہانے بنانے سے اس کے فیصلہ غلط ہو سکتے ہیں۔کیونکہ ملزم، مجرم نہیں ہے۔

فیض

منصف ہو اگر تو کب انصاف کروگئے
مجرم ہیں اگر ہم تو سزا کیوں نہیں دیتے

لاعلم

مٹ جائے گئی مخلوق تو انصاف کروگئے
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے

❁❁❁

کئی معاملوں میں شاعروں کی باتیں عجیب لگتی ہیں یہاں بھی مجھے شاعروں کے اس عمل پر تعجب ہوتا ہے۔ پانچ سات شعر اردو شاعری میں ایسے ہونگے جس میں شاعر مسجد میں نہ جانے کی وجہ بتاتا ہے۔مسجد کو وقت گذارنے کی جگہ بتاتا ہے۔

میر نے کہا

مستی میں لغزش ہو گئی معذور رکھا جائے
اے اہل مسجد اس طرف آیا ہوں میں بہکا ہوا

نسآخ

مسجد میں گر گرزر نہ ہو دیر ہی سہی
بیکار بیٹھے کیوں رہیں اک سیر ہی سہی

انشآ

چند مدت کو فراقِ صنم ودیر تو ہے
آؤ کعبہ دیکھ آئیں نہ اک سیر تو ہے

غالبؔ

اپنا نہیں یہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھں
اس در پہ نہیں بار تو کعبہ نہ ہو آئے

✿✿✿

مائل ہمیں تو رات کہیں رہ کے کاٹنی ہے
مسجد میں جا پڑیں گے جو مے خانہ بند ہے

رسا نے کہا

جب دیر میں یہ دیکھا کہ اپنا گزر نہیں
کعبے کے جانے والوں میں مجبور جا ملے

اسی مضمون کا مکمل شعر جو برمحل ہو گیا۔ قائم کا شعر

محفل وعظ تو تا دیر رہے گی قائم
یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

قائم کے اس شعر کو جب کئی شعراء نے غالب کا کہا تو غالب نے لکھا ''یہ شعر میرا نہیں ہے۔ ایسے کہنے والے پر لعنت'' دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یوں تو ہر شعر میں ایک جیسی بات ہے۔ دیر میں جگہ نہیں ملی تو کعبہ کو سیر کے لئے چلیں مگر غالب نے آرام سے بیٹھنے کو اچھا نہیں سمجھا ایسی حالت میں وہ کعبہ کو ہو آنے کی بات کی ہے۔ یعنی غالب آرام پسند نہیں تھے۔ خمار نے کہا تھا۔

دیر و حرم کے حبس کدوں کے ستائے ہیں
ہم آج میکدے کی ہوا کھانے آئے ہیں

سوئے کعبہ کبھی جا نکلے کبھی جانب دیر
آج پہونچے ہیں بھٹکتے ہوئے میخانے کو

✿✿✿

کرشن بہاری نور ایک شعر

چاہے سونے کی فریم میں مڑھ دو
آئینہ جھوٹ بولتا ہی نہیں

پھر کسی شاعر کا یہ شعر

چھپاؤں آئینے سے کیا حقیقت
بڑا کمبخت ہے سچ بولتا ہے

✿✿✿

فیض کا ایک نظم کا شعر بڑا مشہور ہے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

ٹیپ کے دوسرے مصرع میں عجیب بات کہی گئی ہے۔ میرے خیال میں حالات بدلنے پر محبت میں اتنا اُتنا نہیں کہا جا سکتا خمار نے بھی یہ مصرع سنا ہوگا اس لئے ان کے مطابق ایسے کہا جائے تو بہتر ہوگا۔

ایسا نہیں کہ ان سے محبت نہیں رہی
جذبات میں وہ پہلی سی شدت نہیں رہی

❁❁❁

حفیظ نے آتش کے مشہور شعر سے استفادہ کیا ہے
آتش (۱۷۷۸-۱۸۴۷)

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

حفیظ (۱۸۶۵-۱۹۱۸)

سایہ بہت ملیگا درختوں کا راہ میں
گھر سے نکل کے دھوپ میں کچھ دور چل کے چل

❁❁❁

غالب کا ایک زبان زد خاص عام شعر ہے

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پہ ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

اس شعر کو اپنے ذہن میں رکھ کر حفیظ ہوشیار پوری کا یہ شعر پڑھیں

جو چاہیں لکھ لیں کاتب اعمال شوق سے
کچھ دستخط نہیں مرے فرد گناہ پر

سرسار صدیقی (۱۹۲۸-۱۹۷۴)

حشر میں کون گواہی میری دے گا ساغر
سب تمہارے ہی طرفدار نظر آتے ہیں

❁❁❁

دو شعر حفیظ جونپوری (۱۸۶۵-۱۹۱۸)

یہی مسئلہ ہے جوزاہدو،تو مجھے کچھ اس میں کلام ہے
وہی شئے حلال ہے خلد میں وہی میکدے میں حرام ہے

شاد عظیم آبادی (۱۸۴۶-۱۹۲۷) کا یہ انداز بھی دیکھا جائے

میں فدائے ساقی مہ تھا ، یہی میکشی کا ہے مسئلہ
وہی حکم دے تو حلال ہے وہی روک دے تو حرام ہے

❁❁❁

حفیظ کے دو اشعار کا ذکر طفیل انصاری نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ایک شعر ہے۔

صبح شب وصال ہے آئینہ ہاتھ میں
شرما کے کہہ رہے ہیں کہ چہرا اتر گیا

اب اس کو سامنے رکھ کر فراق گورکھپوری کا یہ شعر دیکھیں جو اپنی خوبی کی وجہ سے برمحل ہو گیا۔لیکن حفیظ اس کا ماخذ ہے۔

درا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

❁❁❁

حفیظ جونپوری کا دوسرا شعر

عجب حسرت برستی ہے جہاں گور غریباں ہے
یہی بستی وہ ہے آباد ہو کر بھی جو ویراں ہے

اس شعر کو ان کے ایک شاگرد شفیق جونپوری نے اپنے رنگ میں کہہ کر لازوال بنا دیا۔خیال وہی ہے جو انکے استاد کا ہے مگر شفیق نے اسلوب بیان ایسا انفرادی شان پیدا کی ہے۔

نہیں معلوم یہ شہر خموشاں کیسی بستی ہے
زمیں آباد ہو جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی

❁❁❁

دنیا میں جو آیا ہے جیسا آیا ہو ویسا ہی اس دنیا سے جائے گا،۔دنیا کی شہرت دولت سب یہی رہ جائیں گے۔

جب آئے تھے خالی چلے بھی خالی ہاتھ
نہ لائے ہاں کے لئے لے چلے نہ واں کے لئے

صبؔا نے کہا

اہل دولت سے کوئی نزع میں اتنا پوچھے
ساتھ کیا کیا لیا اسوقت میں چھوڑا کیا کیا

❁❁❁

اب تلمیحی اشارے کے ساتھ جو بہت مشہور منشی مرزا محمد رضا معجز

مہیا گو کہ سب سامانِ ملکی اور مالی تھے
سکندر جب چلا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے

یا اس شعر کو تصرف کر کے کسی استاد زماں نے ایسا کر دیا

آیا تھا کیا سکندر دنیا سے لے چلا کیا
تھے دونوں ہاتھ خالی باہر کفن سے نکلے

ایک غزل؛ غیر مطبوعہ کا یہ شعر جو ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ کا ہوسکتا ہے۔ ہمارے پردادا کی شعری بیاض میں درج ہے۔ شاعر کا نام نہیں ہے۔

سکندرر ہے اور نہ دارا زمیں پر
ہمیشہ رہا ہے زمانہ کسی کا

اس سے ملتا جلتا شعر

دارا رہا نہ جم نہ سکندر سا بادشاہ
تختِ زمیں پہ سیکڑوں آئے چلے گئے

حسن کے غرور پر اکثر شعر کہے گئے ہیں۔

قوی امروہوی ()

چار دن کے حسن پہ اتنا غرور
چاندنی ہوتی ہے کئے دن کے لئے

ایک دوسری مثال حسن کے ڈھلنے کے لئے

نازؔ والئی سندھ

ہے وہ ناداں جو کرے حسن روزہ پر غرور
آج دریا یہ چڑھا ہے کل اتر جائے گا

ویسے بھی چار دن کی چاندنی ہوتی ہے یہ مشہور ہے

سوداؔ (۱۷۰۶-۱۷۸۱) کا مشہور شعر ہے۔

فکر معاش و عشق بتاں یاد رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

اس کے بعد شفیق جونپوری (۱۹۰۳-۱۹۶۳)

چار دن کی زندگی میں حیف کیا کیا کیجئے
فکر دنیا کیجئے یا فکر عقبیٰ کیجئے

❁❁❁

ہدایت علی عاشق کاش

بیمار عشق کو تری ہر گز شفا نہیں
ہو جس کو یہ مرض کہیں اس کی دوا نہیں

سرور (۱۷۸۸-۱۸۶۹)

درد ہو، تپ ہو، صعف ہو اس کی کوئی دوا کرے
جو کہ مریض عشق ہو سچ تو یہ ہے وہ کیا کرے

اس لئے تو شہدی () نے کہا تھا

بیمار محبت کو اب اللہ شفا دے
سنتے ہیں کہ ہاتھ اس سے مسیحا نے اٹھا یا

❁❁❁

محبت چھپائے نہیں چھپتی اور آشکارا کیسے ہوتی ہے یہ اشعار دیکھیں، برمحل کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ کہاوت ہے کہ عشق اور مشک چھپائے سے نہیں چھپتے ہیں۔

اصغر نسیم

نام میرا سنتے ہی شرما گئے
تم نے تو خود آپ کو رسوا کیا

یا پھر جلیل مانک پوری نے کہا۔

کیا ملا تم کو مرے عشق کا چرچا کر کے
تم بھی رسوا ہوئے آخر مجھے رسوا کر کے

نخشب جارچوی (۱۹۲۰-۱۹۶۷)

کوئی کس طرح راز الفت چھپائے
نگاہیں ملیں اور قدم ڈگمگائے

❁❁❁

دو مشہور اشعار ایک ہی طرح کے ہیں مگر انداز ذرا مختلف ہیں۔

ذوق

مسجد میں اس نے ہم کو آنکھیں دکھا کے مارا
کافر کی دیکھو شوخی گھر میں خُدا کے مارا

امیر مینائی

مسجد میں بلاتا ہے ہمیں زاہد نافہم
ہوتا کچھ اگر ہوش تو میخانے نہ جاتے

دونوں شعر میں بے باکی کا اظہار ہے کم فہمی کا ذکر ہے شاعر کو زیادہ دقت نہیں لگتی ایک مفہوم کو دوسرے مفہوم دینے میں۔

❁❁❁

میر نے اکثر شعر مایوسی کے کہے ہیں اس شعر میں دو دل رکھنے کا ذکر کیا ہے۔ ایک اپنے پاس رکھتے دوسرا معشوقہ کو دیتے۔ اردو شاعری میں یہ بات اس سے قبل کہیں نہیں دیکھا ہے ہاں غالب نے حالات کے قہر جب گھٹنے ٹیک دئے تو اللہ تعالیٰ سے عاجزی کی کہ مضطر اکبر آبادی نے کہا تھا۔

گلستاں کو لہو کی ضرورت پڑی
سب سے پہلے ہماری گردن کٹی

خاموش غازیپوری (۱۹۳۲-)

جب وقت پڑا تھا گلشن پر مجھ سے ہی لہو کا دان لیا
میرے ہی لہو کے چھینٹوں سے ہولی بھی منائی لوگوں نے

قربانی دینے والوں کو شہد کا درجہ ملنا چاہئے خاموش غازیپوری نے مضطر کا اولیٰ اور ثانی دونوں مصرعوں کی بات اپنے اولیٰ مصرعے میں کر دی ہے زمزو کنائے کی زبان میں تلخ حقائق اور کسی اہم تبدیلی کا بیان اردو غزل میں بھی ہوتا رہا ہے۔ حالات سے متاثر ہو کر جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے اس کو اسی انداز سے پیش کیا جا رہا ہے تھوڑا چھپا کے رکھنے کا مطلب شعر سے مدِّ مقابل میں انتشار نہ پیدا ہو۔ ایسا کرنے سے بڑی بات کہی جا سکتی ہے۔ ہمارے اسلاف نے ملک کو آزاد کرانے کے لئے ان گنت قربانیاں دیں تھیں لیکن ستم ظریفی حالات دیکھیں اُنہیں کے ورثاء کے ساتھ ان کے لہو سے ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ اور یہ سلسلہ بند ہونے کا نام نہیں لے رہا ہے۔

❁❁❁

اکبر نے کہا

میرے حواس عشق میں کیا کم ہیں منتشر

مجنوں کا نام ہو گیا قسمت کی بات ہے

اوّلا لیلٰی مجنوں کا ذکر اردو شاعری میں خوب ہوا ہے۔ شاعر نے خود کو مجنوں سے موازنہ کیا اور لیلٰی کو معشوقہ سے لیکن شاعروں نے خود کو طرح طرح مجنوں سے بڑا بتایا ہے کسی نے کہا کہ قیس مرے بعد میری جگہ سنبھالے گا۔ مجنوں کا میں استاد ہوں قیس کی اہمیت اور بڑھ جاتی جب لیلٰی کے دروازے پر وہ مرجاتا۔ مجھ میں مجنوں سے زیادہ جنون ہے یہ اور بات ہے کہ وہ مشہور ہو گیا میں مشہور نہ ہو سکا۔ اس طرح کے اشعار میں شیخ تراب علی قلندر کا یہ شعر اردو شاعری میں بہت مشہور ہے۔

شہر میں اپنے یہ لیلٰی نے منادی کر دی
کوئی پتھّر سے نہ مارے مرے دیوانے کو

یہ شعر تصوف کا شعر ہے۔ میں نے اپنی دانست میں اسکی تشریح اس طرح کی ہے۔ یہاں لیلٰی اللہ تعالیٰ ہیں جو اپنے رسول دیوانیکے لئے پتھر سے نہ مارنے کی بات کر رہے ہیں۔ لیکن برا ہو ان لوگوں کا جنہوں نے لیلٰی مجنوں کے عشق کی داستان کے لئے اس شعر کو استعمال کے شعر کو جہنم رسیدہ کر دیا ہے۔ ہم تو اس بات پر شرمندہ ہیں کہ اتنے بڑے صوفی بزرگ کے ایسے شعر کو کس طرح استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ اگر لکھنو اسکول سے شاہ تراب کا نام نکال دیا جائے تو خدشہ ہے کہ اسکول کی عمارت کا ایک بلند و مضبوط ستون گر جائے تنقید نگاروں نے شاہ تراب کی شاعری کو نظر انداز کیا ہے[1] ڈاکٹر اقبال اختر کے مطابق ''۔ یہ وہ عشق ہے جو حقیقت تک پہونچنے کا وسیلہ ہے جو کائنات اور مظاہر قدرت کے ہر ذرے میں پوشیدہ ہے جس کے لئے تزکیہ قلب اور نفس کی پاکیزگی شرط ہے۔ حقائق کا ادراک اور صاحب نظر ہونے کے لئے اس عشق کی آگ میں جلنا ضروری ہے۔'' شاد عظیم آبادی کا یہ شعر بڑا مقبول ہے۔

تمناؤں میں الجھا یا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلا یا گیا ہوں

سردار جعفری اپنی نظم سماج میں سُنہرے خواب دکھانے پر یہ دو مصرعے شاد کے بھی لئے ہیں۔ تھوڑا تصرف ہے۔ ایسا تصرف عام آدمی تو نہیں جانتا ہے۔ اکثر لوگ اصل شاعر کا نام نہیں جانتے ہیں۔ وہ تو سردار جعفری کو داد دیتے ہیں۔

تمناؤں میں کب تک زندگی الجھائی جائیگی
کھلونے دے کے کب تک مفلسی بہلائی جائیگی

سیاست دانوں نے عوام کو بے وقوف بنانے کا بہترین راستہ چن رکھا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے لوگ خوش ہو جاتے ہیں۔ یہ کام پہلے بھی ہوتا تھا۔ اور اب بھی ہوتا ہے۔ ویسے سردار جعفری نے غریبی اور مفلسی کے اشعار خوب کہے ہیں۔ خکومت میں اس طرح کی باتیں کر کے انقلاب لانا ترقی پسند خوب جانتے تھے۔ لیکن سیاست داں پتہ نہیں کس مٹی کے بنے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے بوہ اپنی راہ پر چلتے رہتے ہیں۔ وہ سنتے رہیں گے۔ لوگ بھی وہی کرتے ہیں جو ان کا دل چاہتا ہے۔

❁❁❁

باب ۔ ۸

روزمرہ کے محاوروں، ضرب المثل اور کہاوتوں کا استعمال

باب ۸۔ روزمرہ کے محاوروں، ضرب المثل اور کہاوتوں کا استعمال

محاورہ کسی بھی زبان کا حسن ہوتا ہے۔ یہ ابتداء سے ہی رائج ہے۔ محاورے سے بڑی لمبی چوڑی بات نہ کہہ کر بات کو مختصر کہہ کر لا جواب کہنے پر مجبور کر دینا۔ ہم لوگ روزانہ اردو کے محاورے بولتے اور سنتے ہیں مگر اس کو محسوس نہیں کرتے یا پھر جانتے ہی نہیں کہ یہ محاورہ ہے، ہم جاہلوں کو بھی محاورے کا استعمال کرتے دیکھتے ہیں۔

۔۔۔رشید احمد صدیقی نے کہا تھا کہ زورمرہ اور محاورے سے کھیلنا اور کھلانا اردو شعراء کا بڑا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ جیسے روزمرہ اور محاورہ ہی شاعری کا مقصد رہ گیا ہو۔ ویسے بھی اچھی شاعری کی پہچان بھی محاوروں اور کہاوتوں کا استعمال کرنا ہے۔۔۔

۔ایسے اشعار کو بھی عوام میں مقبولیت ملی ہے۔ چونکہ یہ شاعری کی خوبی ہے اس لئے بھی عام بول چال کے اشعار میں ایسی خوبیاں زیادہ ہیں۔ اسی لئے تو آتش کہتے ہیں۔

بندش الفاظ جڑنے کے نگوں سے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

خاک میں ملانا

لکھ کر زمیں پہ نام ہمارا مٹا دی
ان کا تو کھیل ,خاک میں ہم کو ملادیا

خاک ہوجانا

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائینگے ہم تم کو خبر ہونے تک

پھول کیا ڈالو گے تربت پر مری
خاک بھی تم سے نہ ڈالی جائے گی

الٹے پھر آنا

بندگی میں وہ آزادہ و خود بین ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے
چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے

زبان خلق کو نقارہء خدا سمجھو

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو
زبان خلق کو نقارہء خدا سمجھو

منہ میں پانی بھر آنا

توبہ تو ہم نے کی ہے پر اب تک یہ حال ہے
پانی بھر آئے منہ میں دکھا دیں اگر شراب

ہاتھ اٹھانا

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھور دئے مسکرا کے ہاتھ

آبرو ہونا

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اترا کے
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

آستیں پکڑنا۔۔ کام تمام کرنا، الٹی ہوگئیں

دیکھا اس بیماریء دل نے آخر کام تمام کیا
الٹی ہوگیئں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

تاڑ لینا

بھانپ ہی لیں گے اشارہ سر محفل جو کیا
تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

موم کرنا

تم لوگ بھی غضب ہو کہ دل پر یہ اختیار
شب موم کر لیا سحر آہن بنا دیا

سر کے بل جانا

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچہء رقیب میں بھی سر کے بل گیا

خدا کی دین

خدا کی دین ہے جس کہ نصیب ہو جائے
ہر ایک دل کو غم جاوداں نہیں ملتا

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ہوک اٹھنا

اک ٹیس جگر سے اٹھتی ہے اک درد جگر میں ہوتا ہے
ہم راتوں کو اٹھ اٹھ روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

کفر توڑنا

لائے اس بت کو التجا کر کے
کفر توٹا خدا خدا کر کے

قشقہ کھینچنا

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھتے ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

جگر تھامنا

اب جگر تھام کے بیٹھیں مری باری آئی

آگ بجھنا

جگر کی آگ بجھے جلد وہ شئے لا
لگا کے برف میں ساقی صراحی مے لا

آگ برسنا

کشمیر کی وادی میں بے پردہ جو نکلے ہو
کیا آگ برستی ہے برفیلی چٹانوں میں

مفت ہاتھ آنا

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

منہ چڑاھنا

لگے منہ چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا

منہ کالا کرنا

اقی ہے شیخ کو ابھی حسرت گناہ کی
کالا کرے گا منہ کو جو ڈاڑھی سیاہ کی

منہ لال کرنا

چمن میں گل نے جو دعویٔ جمال کیا

جمال یار نے منہ اس کا خوب لال کیا

آگ لینے آنا

لیتے ہی دل جو عاشق دل سوز کا چلے
تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے — نواب امین الدولہ

مقدر پھوٹ جانا

تو لب تک آتے آتے کتنے ساغر ٹوٹ جاتے ہیں
مقدر کی ہے باتیں جب مقدر پھوٹ جاتے ہیں

دامن چھڑانا

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن
کون چھڑائے اپنا دامن

سجدہ کرنا

وشق پابند وفا ہے نہ نہ کہ پابند رسوم
سر جھکانے کو نہیں کہتے ہیں سجدہ کرنا

آنسو تھمنا

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
آج کس کا منہ دیکھا ہے

منہ دیکھنا

جس جگہ بیٹھے ہیں بادۂ نم اٹھے ہیں
آج کس شخص کا منہ دیکھ کے ہم اٹھے ہیں

الٹا سیدھا

تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس
یہ وہ جامہ ہے جس کا نہین الٹا سیدھا

آواز دینا

آوز دے رہا ہوں زمانے کو اس طرح
جیسے مسیح وقت پکارے صلیب سے

زندگی بسر کرنا

اس دور میں زندگی بسر
بیمار کی رات ہو گئی

چراغ جلانا

نہ ساتھ دینگی یہ دم توڑتی ہوئی شمعیں
نئے چراغ جلاؤ کہ روشنی کم ہے

پاؤں پھیلا کر سونا

حیات جسکی امانت ہے اس کو لوٹا دی
میں آج چین سے سوتا ہوں پیر پھیلا کر

ادھر کے نہ ادھر کے

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم
نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کیرہے

سبق پڑھا دینا

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے
دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے

چلمن کا الٹنا

چلمن کا الٹ جانا ظاہر کا بہانہ ہے
ان کو تو بہر صورت اک جلوہ دکھانا ہے

اب ذرا کہاوت اور ضرب الامثال پہ نظر کرتے ہیں۔ آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی۔

کسی کا ہاتھ چلے۔۔۔ایک مارتا ہے تو دوسرا گالی دیتا ہے

پیارے کسی کا ہاتھ کسی کی زباں چلے
کسی کو اپنا کر رکھو یا کسی کے ہو رہو ا)

ایک انار صد بیمار
ایک دل اور خواستگار ہزا ر

کیا کروں ایک انار صد بیمار

چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

اب پچھتاوے کا ہوت
جب چڑیا چگ گئی کھیت

جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے

کہتے ہیں لوگ جھوٹ نہیں پائیں جھوٹ کے
جھوٹے تو بیٹھتے بھی نہیں پاؤں ٹوٹ کے

تنگدستی اگر نہ سالک
تندرستی ہزار نعمت ہے

تہمت لگانا

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلیں
کس لیئے آئے تھے کیا ہم کر چلے

شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں
عیب بھی کرنے کو ہنر چاہئے

انگور حلال اور مئے انگور حرام
گڑ کھائیں گلگلوں سے پرہیز کریں

سوبات کی اک بات سنو یہ واعظ
مانو ہے دیوتا، نہیں تو پتھر ہے

کاغذ کی ناؤ آج نہ ڈوبی کل ڈوبی (کہاوت)

صدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں

آگ پانی میں لگانا

کب شرارت سے باز آتے ہیں
آگ پانی میں یہ لگاتے ہیں

اوپر کے اشعار میں ہم دیکھتے ہیں کہ کہاوتوں کو بہت کم استعمال کیا گیا ہے کیونکہ اردو کی کہاوتیں بڑی بڑی ہوتی ہیں اس کو چھوٹی بحر میں نہیں سمویا جا سکتا ہے ہاں محاورے زیادہ تر چھوٹے ہوتے ہیں اس لئے اس کا استعمال شاعروں نے بہت کیا ہے۔اور یہ اشعار خود ہی کہاوت کی طرح ہو گئے ہیں۔

اس طرح ہم اشعار سے اور بھی مثال دیں گے تو پوری کتاب مکمل ہو جائے گی پھر بھی محاورے کے اشعار ختم نہیں ہوں گے۔

❁❁❁

آخری باب

ماحصل

آپ نے دیکھا یہ وہ زبان زد اشعار ہیں جو عام بول چال میں استعمال ہونے لگے، اردو غزل کی ترقی کی یہ پہچان ہے۔ اب یہ شاعری دربارداری کے جونچلوں سے بغاوت کر کے علمی اور ادبی سطح پر نمایاں ہوگئی۔ جذبات محسوسات اور واردات کا نام غزل ہے اور یہ غزل یا غزل جس عالم میں کہی گئی ہوگی لامحالہ اس کی بازگشت شعر میں ضرور پائی جائے گی۔ اس میں سماجی کاروبار کا ذکر تو ہونا لازمی ہے۔ شاعری کا لگاؤ دلوں سے بھی ہے اس لئے شاعر جو کچھ محسوس کرتا اسکا تو دخل ہونا ضروری ہے۔ ہر فنکار اپنی غیر معمولی فنی شخصیت رکھتا ہےلیکن اس سے پہلے وہ ایک انسان ہے اسی کائنات کا متحرک کل پرزہمگر اس کے اندر جذبات واحساسات دل اور دل کے معاملات کا گوشہ بھی موجود رہتا ہے جو اسی معاشرتی ،معاشی،اوراخلاقی نظام میں پروان چڑھتا ہے،زندگی کے کڑوے کسیلے تجربات کے انہیں ادوار سے وہ بھی گذرتا جس سے ایک علم انسان کو واسطہ رہتا ہے،اس کی فنی شخصیت اوراس کے آرت پر غیر محسوس طور پر حالات کی یہی چھاپ ہوتی ہے۔

رشید احمد صدیقی نے دہلی یونیورسیٹی کے پلاٹینم جبلی کے موقع پر ایک مقالہ پڑھا۔ دیکھے کس طرح انہوں نے برمحل شعر کا استعمال کر کے نثر میں جان ڈال دی ہے۔

۔۔۔۔۔عملی زندگی میں مذہب کی جانب غالب کا اجتہادی نقطہءنظر اتنا بھی نہ تھا جتنا مومن کا۔لیکن خیال کی دنیا میں پہونچ کر ملتوں کو مٹاکر اجزائے ایماں بنادیتے ہیں۔۔۔سادگی کے ساتھ پرکاری غالب کے آخری دور شاعری تک قائم رہی اس نے مرزا غالب کو انداز بیاں اور کا مرتبہ بخشا ہے۔۔۔۔

اتنی سی نثر میں غالب کے دو برمحل اشعار استعمال کئے ہیں۔

میں نے خود اپنی کتاب برمحل اشعار اوران کے ماخز میں اپنی نثر میں جان پیدا کرنے کے لیئے جگہ جگہ پر زبان زد اشعار کا استعمال کیا ہیاور آج بھی ایسے اشعار کو شامل کئی بغیر نہیں رہتا ہوں۔

۔۔۔۔اس زمانے میں جب فراغت تھی فرصت جب بیٹھے رہے تصورء جاناں کئی ہوئے کت بغیر وقت کاٹنا محال ہوتا تھا اس وقت ارباب نشاط غزل اس نے چھیڑی مجھے ساتھ دینا اور عمر رفتہ کو آواز دینے کے لئے فراغے یاب زمیندار اور رنگین مزاج نواب اور بادشاہ اسی غزل کے پیرون میں گھنگروں باندھ کر خوش وقت اور خوش مزاض ہوا کرتا تھا۔اب ان جملوں میں میں نے ایک خوبصورت زبان زد شعر کا استعمال کر کے نثر میں جان ڈال دینے کی بھر پور کوشش کی ہے۔اب اس زمانے میں تو اس طرح کی نثر خوب اپنی ضرورتوں کے مطابق شامل کرتے ہیں۔ ہر زمانے میں یہ ہوتا آیا ہے۔ ماضی کی کچھ مثالیں اور دیتا چلوں تا کہ مضمون کا مزہ دوبالا ہو جائے۔ہم اُپ جانتے ہیں کہ مولانا ابوالکلا آزادصرف لیڈر رہی نہیں ایک اچھے مصنف بھی تھے۔ میں ان کی صرف ایک کتاب غبار خاطر کے بارے میں بات کروں گا اور بتاؤں گا کہ دوسرے مصنفون کی طرح انہوں نے بھی اپنی نثر میں جگہ جگہ زبان زد اشعار کا استعمال کیا ہے۔ ہر لکھنے والا اپنی صلاحیت کے مطابق ہیں اپنی نثر میں اشعار کا استعمال کرتا ہے ۔مولانا بہت بڑے عالم تھے انکو کافی اشعار یاد تھے اپنی باتوں کو خوبصورت بنانے کے لیئے اس طرح کے اشعار سے انہوں نے نثر میں ایک نیا رنگ

بھر دیا ہے۔ھم اپنے موضوع کے مطابق یںہیں اشعار کا ذکر کریں گے جو زبان زد ہیں۔ان کے دگر فارسی اور عربی کے اشعار کا ہم ذکر نہیں کریں گیا پھر انہوں نے جو بھاری بھرکم اشعار سے جو نثر لکھی ہے ان کا بھی ذکر نہیں کریں گے۔ایک بات اعر بتا تا چلوں کہ انکی نثر کی خوبی کو دیکھ کر ہی حسرت موہانی نے کہا تھا کہ

جب سے دیکھی ہے ابو الکلام کی نثر
نظم حسرت میں وہ مزہ نہ رہا

اب آیئے ان کے سیکڑوں اشعار میں سے کچھ کا ذکر دیکھ لیں۔

۔۔۔۔اس بزم سود وزیاں میں کامرانی کا جام کوتاہ دستئں کے لیئے نہین بھرا ہے وہ ہمیشہ انہیں کے حصے میں آیا ہے جو خود بڑھ کر جام اٹھا لینے کی جرات رکھتے ہیں۔

یہ بزم مے ہے یاں کتاہ دستی مین ہی محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ مین مینا اسی کا ہے

یہاں آپ نے دیکھا کہ مولانا نے کس خوبصورتی سے اس شعر کو اپنی نثر میں شامل کر کیا س کو کہان سے کہاں پہو نچا دیا ہے۔ایک دوسری جگہ صفحہ ۲۸ پر۔

۔۔۔غور کیجیئے تو زندگی،زندگی کی تمام ساعتوں کا یہ حال ہے خود زندگی اور موت کا فاصلہ بھی ایک قدم سے زیادہ نہیں ہوتا ہے۔

ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ
دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں ہے

یہ شعر سودا کا ہے۔طوالت کے خوف سے بچنے کے لیئے ہم ان تمام اشعار کا ذکر نہیں کریں گیصرف دو اشعار پر ہی اکتفا کریں گے تا کہ دوسرے فنکاروں کی نثر کا مزہ مل سکے۔

ہم نے اپنے مقالے میں یہ بتایا ہے کہ زبان زد اشعار دنیا کی پہلی زبان کے اشعار ہیں جو ہندستان پاکستان اور بنگلہ دیش میں عام بول چال،تحریر،تقریر،فلموں اور رسالوں چلتے پھرتے مٹر گستی کرتے ہوئے،کہیں طنز کرتے ہوئے کہیں تعریف کرتے ہوئے اس طرح استعمال کرتے ہیں کے کبھی کبھی سامنے والے کی سمجھ بھی نہیں آتا۔اور دوسرے حضرات سن کر مزا لے لیتے ہیں۔ایک لمی چوڑی تقریر کو دو شعر میں اس طرح سمویا جاتا ہے کہ تقریر مین جان آجاتی ہے۔آج کے زمانے میں تو اور بھی مشہور ہے۔اب لوگوں کے پاس لمبی چوڑی تقریر سئنے کا وقت نہیں ہے،اس لئے بھی زبان زد اشعار اور مقبہل ہوتے جارہے ہیں۔

❁❁❁

کتابیات (مآخذ)(BiBiloghraphy)

۱)	زبان زد اشعار	....	ڈاکٹر حسن الدین احمد
۲)	اردو کے مشہور اشعار	....	جامی
۳)	شاعری میر سے پروین تک	....	قاضی مشتاق احمد
۴)	گلشن بے خار	....	شیفتہ
۵)	عیار الشعرا	....	خوب چند ذکا
۶)	مرشد آباد اردو کا ایک مرکز	....	
۷)	دکن میں اردو	....	نصیر الدین ہاشمی
۸)	تذکرہ ہزار داستان	....	لالہ سری رام
۹)	سخنوراں نے حیدر آباد	....	ڈاکٹر سید بشیر احمد
۱۰)	برمحل اشعار اور ان کے مآخذ	....	خلیق الزماں نصرت
۱۱)	اردو غزل	....	ڈاکٹر یوسف حسن خاں
۱۲)	ضرب المثل اشعار	....	شمس الحق
۱۳)	مختلف کلیات تذکرے اور رسالے	......	
۱۴)	گلستان ہزار رنگ	....	سید بہاؤ الدین
۱۵)	جدید غزل گو	....	خدا بخش لائبریری

❁❁❁

دیوان، کلیات، انتخاب

۱	گلدستۂ عشق، کلیات رند		منشی نولکشور، لکھنؤ	خدا بخش HC/9150
۲	حکایت ہستی	بسمل عظیم آبادی	بہار اردو اکاڈمی ۱۹۸۰ء	خدا بخش A/C17931
۳	دیوانِ ریاض شاداب	ضیاء عظیم آبادی		خدا بخش A/C6625
۴	کلیاتِ اقبال	جاوید اقبال	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس ۱۹۸۱	مملوکہ نصرت
۵	انتخاب لالہ مادھورام جوہر	راجندر بہادر گور	اتر پردیش اردو اکاڈمی	خدا بخش ACC117309
۶	دیوانِ ذوق		مطبع نول کشور، لکھنؤ ۱۹۲۳	مملوکہ نصرت

۷	انتخاب کلامِ داغ	مرتبہ ممتاز مرزا	اردو اکاڈمی دلّی	مملوکہ نصرت
۸	کلیاتِ حسرت موہانی	حسرت موہانی	کتاب منزل، لاہور ۱۹۵۵ء	مومن لائبریری D47
۹	کلیاتِ سودا	مطبع نول کشور لکھنؤ		مملوکہ مومن لائبریری 217D
۱۰	دیوانِ درد	مرتبہ فاروق ارگلی	فرید بکڈپو، دلّی	مملوکہ نصرت
۱۱	انتخاب عزیز لکھنوی	مرتب خلیق انجم	انجمن ترقی اردو ۲۰۰۱ء	مملوکہ نصرت
۱۲	کلیاتِ منتظر	منتظر	بہار اردو اکاڈمی،	خدا بخش لائبریری A/C34339
۱۳	چمنستان	ظفر علی خاں، یونائیٹڈ چوک، لاہور	عوامی ادارہ ۱۹۴۴ء، 5553	
۱۴	دیوانِ مصحفی	مصحفی	مجلسِ اشاعت، دلّی ۱۹۶۷ء	عوامی ادارہ 5685A
۱۵	کلیاتِ فیض	فیض	ناز پبلشنگ ہاؤس، دلّی	مملوکہ مولانا مظہری
۱۶	انتخابِ منظومات	برائے نصاب	اتر پردیش اردو اکاڈمی ۱۹۹۹ء	مملوکہ نصرت
۱۷	کلیاتِ نظیر	مرتبہ جوہر دہلوی	منشی جی نیال	مومن لائبریری
۱۸	عکس اصلاح	شوق نیموی	اتر پردیش اردو اکاڈمی	مملوکہ نصرت
۱۹	کلام امیر مینائی	انتخاب انور کمال حسینی		مملوکہ نصرت
۲۰	دیوانِ غالب	از آغا محمد باقر	جالندھر	مملوکہ نصرت
۲۱	کلیاتِ میر مرثیہ	ظل عباسی	قومی کونسل	مملوکہ مولانا مظہری
۲۲	دیوانِ حالی	حالی	اردو اکاڈمی دلّی ۱۹۸۷ء	مملوکہ نصرت
۲۳	کلیاتِ مومن	از مومن خاں مومن	کتابی دنیا، دلّی ۲۰۰۶ء	مملوکہ نصرت
۲۴	فن اور شخصیت غزل نمبر	از صابر دت، ممبئی		امبیڈکر لائبریری 702
۲۵	کائناتِ جلیل	مرتب علی احمد جلیل	قومی کونسل، دلّی	مملوکہ نصرت
۲۶	کلیاتِ ظفر	بہادر شاہ ظفر	فرید بکڈپو	مملوکہ نصرت
۲۷	دیوان میاں داد خاں سیاح	سیاح	گجرات اردو ساہتیہ اکاڈمی ۲۰۰۳ء،	مملوکہ مولانا مظہری
۲۸	کلیاتِ داغ	داغ	کتابی دنیا، دلّی ۲۰۰۲	مملوکہ مولانا مظہری
۲۹	کلیاتِ ذوق	ذوق	تنویر احمد علوی ۲۰۰۰ء	مملوکہ مولانا مظہری
۳۰	کلیاتِ ساحر	ساحر	فرید بکڈپو، دلّی،	مملوکہ نصرت
۳۱	دیوانِ حفیظ جونپوری	مطبع حکیم برہم گورکھپوری ۱۹۰۳		مملوکہ طفیل احمد انصاری
۳۲	کلیاتِ اکبر	اکبر	فرید بکڈپو، دلّی	مملوکہ مولانا مظہری

۳۳ کلامِ دبیر	دبیر	فرید بکڈ پو، دلّی	مملوکہ مولانا مظہری
۳۴ کلامِ ریاض خیر آبادی	ریاض	فرید بکڈ پو، دلّی	مملوکہ نصرت
۳۵ کلیاتِ جگر مراد آبادی	جگر	فرید بکڈ پو، دلّی	مملوکہ مولانا مظہری
۳۶ دیوانِ بیخود دہلوی	بیخود	فرید بکڈ پو، دلّی	مملوکہ نصرت
۳۷ کلیات سراج اورنگ آبادی	سراج	ترقی اردو بیورو ۱۹۸۲ء	مملوکہ مولانا مظہری
۳۸ کلیاتِ ریاض	ریاض	اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد ۱۹۳۸ء	مومن لائبریری D-328
۳۹ کلیاتِ عیش	مرتبہ ڈاکٹر حبیبہ بانو	اسلام ہند ۲۰۰۰ء	مومن لائبریری D328
۴۰ کلیاتِ اصغر گونڈوی	بااہتمام ناصر خان	فرید بکڈ پو	مملوکہ نصرت
۴۱ انتخاب اکبر الہ آبادی	تصحیح و ترتیب صدیق الرحمٰن قدوائی		مملوکہ نصرت
۴۲ وہ جو شاعری کا سبب ہوا	کلیم عاجز	طوبیٰ پبلیکیشنز، حیدرآباد ۱۹۹۲ء	مملوکہ نصرت
۴۳ انتخاب کلام آبرو	مرتبہ محمد ذاکر	اردو اکاڈمی دلّی ۱۹۹۱۔۲۰۰۰	مملوکہ نصرت
۴۴ گردشِ جام	عبدالحمید عدم	نکتۂ جدید، لاہور ۱۹۵۲ء	مومن لائبریری D427
۴۵ آتش و نم	نشور واحدی	کتاب محل پہلا ایڈیشن ۱۹۴۶ء	مومن لائبریری D202
۴۶ امر بیل	نشاط شاہدی	نشاط لائبریری ۱۹۵۲	مومن لائبریری D42
۴۷ ۱۰ عظیم شاعر	فاروق ارگلی	فرید بکڈ پو ۲۰۰۴ء	مملوکہ نصرت
۴۸ اردو کی بہترین شاعری	امتیاز علی	فرید بکڈ پو ۲۰۰۵ء	مملوکہ نصرت
۴۹ کلیمِ عجم	سیماب اکبر آبادی	مکتبہ قصر الادب، آگرہ ۱۹۴۷ء	مملوکہ مولانا مظہری
۵۰ کلیاتِ حفیظ جالندھری	حفیظ جالندھری	فرید بکڈ پو، دلّی ۲۰۰۸ء	مومن لائبریری D294
۵۱ غزل انسائیکلوپیڈیا	ذکی کاکوروی	مرکز ادب لکھنؤ ۱۹۶۸ء	عوامی ادارہ 5490
۵۲ کلامِ قتیل شفائی	قتیل شفائی	فرید بکڈ پو، دلّی ۲۰۰۸ء	مملوکہ نصرت
۵۳ کلیاتِ فانی	فانی	قومی کونسل دلّی ۱۹۹۹ء	مملوکہ نصرت
۵۴ متاعِ ہنر	محمود سروش	فاران پبلیکیشنز، ممبئی ۱۹۹۶ء	مملوکہ مجاہد حسین حسینی
۵۵ کلیاتِ مجروح	مجروح	الحمد پبلیکیشنز، لاہور ۲۰۰۳ء	مملوکہ اردو کتاب گھر
۵۶ سریلی بانسری	آرزو لکھنوی	تاج آفس ممبئی، طبع دوم	مومن لائبریری 182
۵۷ فغانِ آرزو	آرزو لکھنوی	عبدالرزاق بک سینٹر ۱۹۴۵ء	مومن لائبریری D133
۵۸ سدرۃ المنتہیٰ	سیماب اکبر آبادی	قصر الادب، آگرہ، اوّل ۱۹۴۶ء	مومن لائبریری 234

۵۹ دیوانِ امیر مینائی (مرآۃ الغیب)		مطبع نول کشور ۱۹۲۳ء	مومن لائبریری
۶۰ اردو شاعری کا انتخاب	محی الدین قادری زور		امبیڈکر لائبریری 3246
۶۱ اردو کا ظریفانہ شاعری	ڈاکٹر فرحان فتح پوری		امبیڈکر لائبریری 2012
۶۲ گدازِ شب	جذبی	مکتبہ جامعہ ۱۹۸۵ء	مومن لائبریری
۶۳ اردو شاعری	قاضی مشتاق احمد	مکتبہ جدید، دلّی ۲۰۰۲ء	مملوکہ نصرت
۶۴ دیوانِ مصحفی	مصحفی	مجلسِ اشاعت ادب، دلّی ۱۹۴۲ء	مومن لائبریری 56854
۶۵ ذوق کے سو شعر	الیاس ٹانڈوی	دانش بکڈپو ۲۰۰۴ء	مملوکہ نصرت
۶۶ جگر کے سو شعر	شہاب اشرف	دانش بکڈپو	مملوکہ نصرت
۶۷ مولانا محمد علی جوہر کے سو شعر	آزاد بلگرامی	دانش بکڈپو	مملوکہ نصرت
۶۸ مشہور شعراء کے سو شعر	فیاض ٹانڈوی	دانش بکڈپو	مملوکہ نصرت
۶۹ مہر دو نیم	افتخار عارف	ایجوکیشن ہاؤس، دہلی ۱۹۹۰ء	امبیڈکر لائبریری
۷۰ رفتگاں و قائماں	عبدالمنان طرزی	ہزاری دنیا ۲۰۰۱ء	مملوکہ نصرت
۷۱ کاسف الحقائق	سید امداد علی اثر	قومی اردو کاؤنسل	مومن لائبریری 9368
۷۲ دیوان مومن	مومن خاں مومن	کتابی دنیا، دلّی ۲۰۰۶ء	مملوکہ نصرت
۷۳ وامق جونپوری	از ایس ایم عباس	سنِ اشاعت ۱۹۰۴ء	مملوکہ طفیل احمد
۷۴ پھول اور چراغ	از شفیق جونپوری	مرتب اقبال جونپوری اور عزیز ربانی ۱۹۶۵ء	مملوکہ طفیل احمد
۷۵ دیوان آسی المعرف عین المعارف	مرتب سیّد شاہد علی جونپوری	آسی پریس	مملوکہ طفیل احمد
۷۶ غزلستان	فرخندہ، نجیب رامپوری	فرید بکڈپو ۲۰۰۳ء	مملوکہ نصرت
۷۷ گلستان ہزار رنگ	مؤلف سیّد بہاؤ الدین	ادارہ امروہہ	مومن لائبریری D91971
۷۸ پیارے پیارے شعر	فہیم عبدالمالک	الحسنات ۲۰۰۷ء	مملوکہ نصرت
۷۹ کلیاتِ دلاور فگار	فگار	فرید بکڈپو، دلّی ۲۰۰۷ء	مومن لائبریری D415
۸۰ کلام شاد	از قاضی عبدالودود	خدا بخش ۱۹۸۴ء	مملوکہ نصرت
۸۱ گلزارِ نسیم	پنڈت دیا شنکر نسیم	فرید بکڈپو ۲۰۰۶ء	مملوکہ نصرت
۸۲ مسدّس حالی	حالی	خدا بخش لائبریری	مملوکہ نصرت
۸۳ شہکار شعری انتخاب	شوکت علی خاں	رامپور رضا لائبریری	مملوکہ نصرت
۸۴ مور ناچ	ندا فاضلی	نیو سلور پبلیکیشنز ۱۹۷۸ء	مملوکہ نصرت

۸۵ تجلیاتِ حشر	مرتبہ محمد طفیل احمد بدر	تاج کمپنی، لاہور	مملوکہ انعام دار
۸۶ وفیاتِ مشاہیر اردو	بشارت علی خاں فروغ	کلکتہ آفسیٹ پریس، رامپور ۲۰۰۱ء	مملوکہ نصرت
۸۷ آنکھوں آنکھوں رہے	وسیم بریلوی	مکتبہ جامعہ دلّی ۲۰۰۷ء	مملوکہ نصرت
۸۸ میرا کیا	وسیم بریلوی	مکتبہ جامعہ دلّی ۲۰۰۷ء	مملوکہ نصرت
۸۹ چراغِ منزل	دِوا کر راہی	بزم اردو ادب ۱۹۸۱ء	مومن لائبریری H90
۹۰ تلخ و شیریں	مرتب شاداں فاروقی	حمیدیہ برقی پریس ۱۹۵۹ء	مملوکہ مشتاق احمد
۹۱ کلیاتِ زاہد	مرتب تابش مہدی	مرکزی مکتبہ اسلامی، دلّی	مملوکہ اسلم غازی
۹۲ کلامِ چکبستؔ	چکبستؔ	ایم اے رزاق پریس، کانپور ۱۹۷۱ء	مومن لائبریری D157
۹۳ جدید غزل گو (اصل مسودہ) نگار ۱۹۴۱ء		خدا بخش لائبریری ۱۹۸۴ء	مملوکہ نصرت
۹۴ کلیاتِ احمد فرازؔ	احمد فرازؔ	فرید بکڈپو	مملوکہ اردو کتاب گھر
۹۵ کلیاتِ جوش	مرتب عصمت ملیح آبادی	فرید بکڈپو ۲۰۰۷ء	مملوکہ مولانا مظہری
۹۶ انتخابِ بسمل سعیدی	مرتب مخمور سعیدی	اردو اکاڈمی ۱۹۹۹ء	مومن لائبریری 289
۹۷ کلیاتِ حفیظ میرٹھی	ادارہ ادب اسلامی ہند، دلّی ۲۰۰۰ء		مومن لائبریری 318
۹۸ خاکے اور لکیریں	نازش پرتا پگڈھی	نامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۲ء	مملوکہ طفیل احمد
۹۹ انتخابِ سخن (جلد ۱۲)	مرتب حسرت موہانی	اتر پردیش اردو اکاڈمی	انجمنِ اسلام 891
۱۰۰ باقیاتِ اقبال	از صابر کلوری	کتابی دنیا	مملوکہ نصرت
۱۰۱ کلامِ آبرو	از پروفیسر محمد ذاکر	اردو اکاڈمی دلّی	مملوکہ نصرت
۱۰۲ کلامِ قتیل شفائی	فاروق ارگلی	فرید بکڈپو	مملوکہ نصرت
۱۰۳ چمن بے خزاں (منتخب کلامِ شعراء) حصہ اوّل		مطبوعہ شگوفہ گلزار، لکھنؤ	مملوکہ نصرت
۱۰۴ لاجواب غزلیں	نجمہ خاتون	الحسنات ایڈیشن ۲۰۰۲ء	مملوکہ نصرت

❁❁❁

تذکرے اور تحقیقی کتُب

۱ آوارہ گرد اشعار	قاضی عبدالودود	خدا بخش لائبریری، پٹنہ	مملوکہ نصرت
۲ گلشنِ بے خار	نواب مصطفٰے خاں شیفتہ	اتر پردیش اردو اکاڈمی	مملوکہ نصرت
۳ گلستانِ سخن	مرزا قادر بخش صابر	اتر پردیش اردو اکاڈمی ۱۹۸۲ء	مملوکہ نصرت
۴ طبقات شعرائے ہند	کریم الدین	اتر پردیش اردو اکاڈمی ۱۹۸۳ء	مملوکہ نصرت

۵	تذکرۂ ہندی	غلام ہمدانی مصحفی	اترپردیش اردو اکاڈمی ۱۹۸۵ء	مملوکہ نصرت
۶	یادگار شعراء	اسپرنگر	اترپردیش اردو اکاڈمی ۱۹۸۵ء	مملوکہ نصرت
۷	گلستانِ بے خزاں	قطب الدین باطن	اترپردیش اردو اکاڈمی ۱۹۸۲ء	مملوکہ نصرت
۸	مخزن نکات	قائم	اترپردیش اردو اکاڈمی	مملوکہ نصرت
۹	نکات الشعراء	میر تقی میر	اترپردیش اردو اکاڈمی ۱۹۸۴ء	مملوکہ نصرت
۱۰	تذکرۃ الشعراء	ابن امین اللہ طوفا	خدابخش لائبریری	مملوکہ نصرت
۱۱	بیاضِ سخن	عبدالشکور شیدا	حیدرآباد ۱۳۵۵ھ	مملوکہ نصرت
۱۲	بہار میں اردو زبان وادب	اختر اورینوی	ترقی اردو بورڈ	مملوکہ نصرت
۱۳	دلّی کا دبستان	نورالحسن ہاشمی	اترپردیش اردو اکاڈمی ۱۹۹۲ء	مملوکہ نصرت
۱۴	ریاض الفصحاء		اترپردیش اردو اکاڈمی	مملوکہ نصرت
۱۵	شعرائے اردو	میر حسن	اترپردیش اردو اکاڈمی	مملوکہ نصرت
۱۶	تذکرۂ گل عجائب	اسد علی خاں تمنّا	اترپردیش اردو اکاڈمی	مملوکہ نصرت
۱۷	ریختہ گویاں	علی السمین گرویزی	اترپردیش اردو اکاڈمی	مملوکہ نصرت
۱۸	نساخ سے وحشت تک	سید لطیف الرحمان	عثمانیہ بکڈپو ۱۹۵۱ء	عوامی ادارہ
۱۹	نگار (تذکرہ نمبر)	نیاز فتح پوری ۱۹۴۱ء		
۲۰	غزل انسائیکلوپیڈیا	ذکی کاکوروی	مرکزِ ادب لکھنؤ ۱۹۹۸ء	عوامی ادارہ 5490
۲۱	ذوق دہلوی ایک مطالعہ (انتخاب)		غالب انسٹی ٹیوٹ، دلّی ۲۰۰۸ء	مملوکہ نصرت
۲۲	نقطۂ نظر	ڈاکٹر کلیم ضیاء	تکمیل رائٹرس ۲۰۰۵ء	مملوکہ نصرت
۲۳	بیسویں صدی میں غزل	بشیر بدر	اترپردیش اردو اکاڈمی ۱۹۸۱ء	مملوکہ نصرت
۲۴	سیماب اکبرآبادی	حامد اقبال صدیقی	ساہتیہ اکاڈمی ۲۰۰۹ء	مومن لائبریری B-156
۲۵	اردو شاعری کا انقلاب	ڈاکٹر سیّد احمد ۲۰۰۹ء		مملوکہ نصرت
۲۶	نقوشِ جدید غزل نمبر	احمد ندیم قاسمی ۱۹۶۹ء		عوامی ادارہ 6605
۲۷	نوائے ظفر	خلیل الرحمٰن اعظمی	قومی کونسل، دلّی ۲۰۰۹ء	مملوکہ نصرت
۲۸	بہادر شاہ ظفر کا افسانہ	از عبداللہ فاروقی	فاروقی بکڈپو ۱۹۸۹ء	مملوکہ نصرت
۲۹	آبِ حیات	محمد حسین آزاد ۱۹۰۷ء	اترپردیش اردو اکاڈمی	مملوکہ ایم مبین
۳۰	گلدستہ نازنیناں	کریم الدین پانی پتی	عطا کاکوے، پٹنہ	مملوکہ نصرت

۳۱	غبارِ خاطر	مولانا ابوالکلام آزاد	ساہتیہ اکاڈمی ۱۹۸۳ء	مملوکہ مولانا مظہری
۳۲	ہماری شاعری	مسعود حسن	رضوی کتاب گھر لکھنؤ	مومن لائبریری
۳۳	لکھنؤ کا دبستانِ شاعری	ابواللیث صدیقی	ادبی دنیا، دلّی	مملوکہ نصرت
۳۴	گلشنِ ہند	مرزا علی لطف	قومی کونسل، دلّی ۲۰۰۵ء	مملوکہ نصرت
۳۵	مجموعۂ نغز	حکیم ابوالقاسم قدرت اللہ	قومی اردو کونسل	مومن لائبریری I/395
۳۶	جواہرِ سخن اوّل تا چہارم	مولوی محمد مبین چریا کوٹی	محمد اسلام	3261, 6267, 64
۳۷	گُلِ رعنا	حکیم سید عبدالحئی		عوامی ادارہ 144213
۳۸	بہارِ بے خزاں	احمد حسین سحر لکھنوی	مجلسِ اشاعت ادب ۱۹۶۹ء	مومن لائبریری D-22
۳۹	بسمل عظیم آبادی فن اور شخصیت	محمد اقبال	ایجوکیشنل بک ہاؤس ۲۰۰۶ء	مملوکہ نصرت
۴۰	نشترِ عشق	آقا حسین قلی خاں عظیم آبادی	ادارہ تحقیقاتِ عربی و فارسی	مملوکہ نصرت
۴۱	حفیظ جونپوری فن اور شخصیت	طفیل احمد انصاری		مملوکہ نصرت
۴۲	بنگال میں اردو شعراء	مشتاق احمد	اقبال احمد برادرس ۱۹۷۲ء	عوامی ادارہ
۴۳	انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب	جاوید نہال		عوامی ادارہ
۴۴	اکبر الہ آبادی	از طالب الہ آبادی	مطبع انوار الہدیٰ، الہ آباد	عوامی ادارہ 1140
۴۵	سرمایۂ سخن	سردار جعفری	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۲۰۰۱ء	عوامی ادارہ
۴۶	دبستانِ آتش	شاہ عبدالسلام	مکتبہ جامعہ، دلّی ۱۹۷۷ء	مملوکہ نصرت
۴۷	تذکرۂ ماہ و سال	مالک رام	مکتبہ جامعہ، دلّی	مملوکہ نصرت
۴۸	معیار بیت بازی	حامد اقبال صدیقی	ہنر پبلی کیشنز	مملوکہ نصرت
۴۹	تعمیری ادب تحریک	پروفیسر احمد سجاد، رانچی، بہار		مملوکہ نصرت
۵۰	چند ہم عصر	مولوی عبدالحق		مملوکہ نصرت
۵۱	غالب کی شخصیت اور شاعری	رشید احمد صدیقی	مکتبہ جامعہ، دلّی	مملوکہ نصرت
۵۲	یادِ رفتگاں (اوّل و دوّم)	ماہر القادری	مرکزی مکتبہ اسلامی	مملوکہ نصرت
۵۳	آخری گھڑے کا پانی	خلیق الزماں نصرت	آوازِ نو، دربھنگہ ۲۰۰۱ء	مملوکہ نصرت
۵۴	شعوری رجحانات	خلیق الزماں نصرت	ردانی ۱۹۹۵ء	مملوکہ نصرت
۵۵	شعرائے بھیونڈی	خلیق الزماں نصرت	ادب نماء ۲۰۰۸ء	مملوکہ نصرت
۵۶	ادبی بھول بھلیاں	مولانا حفظ الرحمٰن واصف		مملوکہ نصرت

۵۷	بندوں کو گِنا کرتے ہیں	مشتاق رضا، بھیونڈی ۲۰۰۷ء		مملوکہ نصرت
۵۸	سیرتِ بے مثال	ڈاکٹر مختار احمد اصلاحی		مملوکہ نصرت
۵۹	دبستانِ مومن	ظہیر احمد صدیقی		امبیڈکر لائبریری 2389
۶۰	پونے میں اردو تعلیم	عبدالرحیم نشتر، پونہ		مملوکہ ایم مبین
۶۱	شعرائے پونہ	نذیر فتح پوری، پونہ		مملوکہ ایم مبین
۶۲	کیا خوب آدمی تھا	ڈاکٹر سید عابد حسین	مکتبہ جامعہ، دلّی	مملوکہ نصرت
۶۳	شفیق جونپوری ایک مطالعہ	تابش دہلوی		مملوکہ ڈاکٹر محمود حسن
۶۴	مختصر تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر سید اعجاز حسین	اردو کتاب گھر، دلّی	مملوکہ نصرت
۶۵	اصلاح مع الضیاح	شوق نیموی	اتر پردیش اردو اکاڈمی	
۶۶	شعرائے ہنود	تذکرہ	مطبع رضوی، دلّی ۱۸۸۵ء	مملوکہ نصرت
۶۷	تاریخ ادب اردو	جمیل جالسی	رام بابو سکسینہ	مملوکہ نصرت
۶۸	تاریخ ادب اردو (دو جلدیں)		وہاب اشرفی	مملوکہ مولانا مظہری
۶۹	شہکار شعری انتخاب	شوکت علی خاں	رامپور رضا لائبریری	مملوکہ نصرت

اخبارات و رسائل

۱	ایوانِ اردو (ماہنامہ) دلّی		جنوری ۱۹۹۲ء	مملوکہ نصرت
۲	ماہنامہ نگار، پاکستان، تذکرہ خط شاعر		۱۹۴۱ء	انجمنِ اسلام
۳	سہ ماہی تخلیقِ نو، بھیونڈی	ایڈیٹر خلیق الزماں نصرت	شمار نمبر ۴۔ ۱۹۸۱ء	مملوکہ نصرت
۴	فکر و تحقیق داغ دہلوی نمبر		قومی کونسل، دلّی ۲۰۰۶ء	مملوکہ نصرت
۵	افکارِ ملّی، دلّی		اگست ۲۰۰۷ء	مملوکہ نصرت
۶	محدثِ عصر، دیوبند		اپریل ۲۰۰۷ء	مملوکہ نصرت
۷	تعمیرِ ہریانہ	ہریانہ اردو اکاڈمی	فروری ۱۹۹۵ء	مملوکہ نصرت
۸	بیباک، ماہنامہ، مالیگاؤں		جنوری ۲۰۰۷ء	مملوکہ نصرت

۹ اردو ٹائمز، روزنامہ، بمبئی مورخہ 27/04/06، 19/02/06، 03/03/06، 22/05/06، 6/08/06 27/11/06، 13/01/06،
07/01/07، 07/08/06، 08/12/08 21/12/08، 09/10/08، 01/10/08

❁❁❁